9
نئی کتاب
اڈیٹر
شاہد علی خاں

(دائیں سے بائیں) اردو کے معروف فکشن نگار مانک ٹالا، معروف ادیبہ سلمیٰ صدیقی، انجمن اسلام کے صدر ڈاکٹر ظہیر قاضی خطیب اور شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر صاحب علی

توجہ انگیز اور منفرد آواز

سہ ماہی

نئی کتاب ⑨

(اپریل-جون 2009)

صدر مجلس ادارت

شمس الرحمٰن فاروقی

اڈیٹر

شاہد علی خاں

ایسو سی ایٹ اڈیٹر

طارق احمد صدیقی

نئی کتاب پبلشرز

D-24، کالندی کنج مین روڈ، ابوالفضل انکلیو پارٹ-I، جامعہ نگر، نئی دہلی-25

naikitab
Publishers
Printers, & Distributers

D-24, Abul Fazal Enclave Part-I
Jamia Nagar, New Delhi - 110025
Phone No. 65416661 Mobile No. 9313883054
naikitabpublishers@gmail.com

اس شمارے کی قیمت:-/90روپے

زرسالانہ (معمولی ڈاک سے) : -/200روپے
زرسالانہ (بذریعہ رجسٹری):-/350روپے

سرکاری اداروں سے (بذریعہ رجسٹری): -/400روپے
غیر ممالک سے:20پونڈ/30ڈالر

چیک (مع بینک چارجیز) یا ڈرافٹ صرف ''نئی کتاب پبلشرز'' کے نام ہی پر بھیجیں۔

مضمون نگار کی رائے سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

اڈیٹر، پرنٹر، پبلشر شاہد علی خاں نے ایچ۔ایس آفسیٹ پریس، دہلی۔6 میں چھپوا کر D-24، ابوالفضل انکلیو، پارٹ-I، جامعہ نگر، نئی دہلی۔25 سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

گوشۂ یوسف ناظم

یاد رفتگاں

جائزے

خطوط

ادبی تہذیبی خبریں

اداریہ

گذشتہ شمارے میں ہم نے اعلان کیا تھا کہ نئی کتاب کا یہ شمارہ رمضان شریف سے پہلے پہلے آپ کے ہاتھوں میں ہوگا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس اعلان کے مطابق نئی کتاب نمبر 9 واقعی رمضان سے پہلے آپ کے ہاتھوں میں ہوتا یا کم از کم ماہ رمضان کے وسط بلکہ اس کے آخر تک بھی آپ تک پہنچ جاتا تو ہم خود کو تسلی دے لیتے کہ چلو دیر آید درست آید۔ لیکن بصد افسوس کہنا پڑ رہا ہے کہ ایسا نہ ہوسکا۔ قارئین اس امر سے بخوبی واقف ہوں گے کہ موجودہ صورت حال میں، جس میں ادبی رسالے آئے دن نکلتے اور بند ہوتے رہتے ہیں، اگر کوئی ''نیک بخت'' اپنی محنت، اپنے پیسوں اور اپنے ذوق وشوق کی خاطر رسالہ نکال رہا ہو تو رسالہ کا وقت پر نکل جانا کسی کرشمے سے کم نہیں۔ بلکہ بعض اوقات تو یہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ طرح طرح کی رکاوٹیں سامنے آجاتی ہیں اور پرچہ کو التوا میں ڈالنا مجبوری بن جاتا ہے۔

پھر کبھی کبھی تو بدرجہ مجبوری ہم خود چاہتے ہیں کہ تھوڑی بہت تاخیر ہو تو ہو لیکن نئی کتاب کے سارے ہی مشمولات ایک دم تازہ اور غیر مطبوعہ ہوں۔ ہمارے یہ چاہنے کی ایک خاص وجہ ہے۔ وہ یہ کہ ہمارے کچھ ادیب دوست ہیں جو لکھ دیتے ہیں کہ ہم فلاں عنوان کے تحت مضمون لکھ رہے ہیں، مضمون مکمل ہو گیا ہے، صرف صاف کرنا باقی ہے، چند دن انتظار کرلیں۔ اور چند دنوں کے اس انتظار میں کبھی کبھی ہفتوں نکل جاتے ہیں۔ حالانکہ مضمون کا موضوع اور عنوان طے شدہ ہے اور فیصلہ ہو چکا ہے کہ اس بار یہ مضمون جائے گا، مضمون نگار پر بھی اعتماد ہے کہ وہ جو کچھ لکھے گا محنت کر کے لکھے گا اور اچھا لکھے گا۔ ہم اپنی جگہ تو یہی سمجھتے ہیں کہ ایسی تاخیر برداشت کرنا ہمارے اور ہمارے قارئین کے حق میں ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اچھے، دلچسپ اور معیاری مضامین کی خاطر رسالے کی اشاعت میں نہ چاہتے ہوئے بھی تاخیر ہو جاتی ہے۔ مگر اس سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ہم نے تخلیقات و مضامین کی اشاعت کے سلسلے میں کوئی بے حد سخت معیار قائم کر رکھا ہے۔ نئی کتاب میں بڑے اور مشہور ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ نئی نسل کی تحریروں کا بھی استقبال کیا جاتا ہے کہ اردو کا مستقبل انہی سے وابستہ ہے۔

اس شمارے میں شمس الرحمن فاروقی کے مضمون 'داستان سرائی کا آغاز نو' سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کس طرح 'دور جدید میں داستان سرائی کے امکانات' پر سوچا اور اس سلسلے میں عملی کوشش بھی کی۔ اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ بھولی بسری 'داستان سرائی' کو آج ایک نئی زندگی ملی ہے۔ بلاشبہ دور جدید میں داستان سرائی کے آغاز کی اولین تحریک دلانے کی شمس الرحمن فاروقی کی اس گراں قدر علمی و عملی کاوش کو بھی یاد رکھا جائے گا۔

ڈاکٹر خالد حسن قادری کا تحقیقی مضمون 'اردو کا آغاز اور مولد' اپنے موضوع پر روایت سے ہٹ کر اور اپنی مثال آپ ہے۔ اس میں انہوں نے موضوع زیر بحث پر اپنی فکر و تحقیق کو بڑے ہی معروضی اور

دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ مضمون کے چند انکشافات ایک لمحے کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ بات کہ ''متھرا اور بنارس کے اصل علاقے موجودہ شہر پشاور کے قریب تھے۔''

پروفیسر خالد محمود کا مضمون '' مکالمہ جبریل وابلیس'' اپنے تجزیہ و تحلیل کے سبب ایک بے حد پرمغز اور پر اثر مضمون بن گیا ہے۔ اس مضمون کا مطالعہ علامہ اقبال کی نظم ''جبرئیل و ابلیس'' کو سمجھنے میں ناگزیر حد تک ضروری ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر ام ہانی اشرف کا ایک نہایت ہی اہم مضمون ''اختر الایمان کی نظم: ایک لڑکا'' ہم نے نئی کتاب نمبر 6 میں شائع کیا تھا جسے ادبی حلقے میں بے حد پسند کیا گیا تھا۔ اس بار انہوں نے قرۃ العین حیدر کے ناول '' آگ کا دریا'' کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ امید ہے کہ یہ مضمون بھی اپنے موضوع اور ندرت کے سبب پسند کیا جائے گا۔

دیگر اہم اور قیمتی مضامین اور شعری حصہ کے علاوہ یوسف ناظم مرحوم پر ایک خصوصی گوشہ شامل کیا گیا ہے۔ یادرفتگاں میں پروفیسر ظفر احمد نظامی، احمد فراز اور رالف رسل پر مضامین شامل ہیں۔ تبصروں میں ہم نے کوشش کی ہے کہ اچھی اور کارآمد کتابوں کا زیادہ سے زیادہ تعداد میں تعارف اور تجزیہ قارئین کے فائدے کے لیے پیش کیا جائے۔

ہمیں نئی کتاب میں شائع ہونے والے ہر مضمون پر قارئین کی قیمتی آرا کا انتظار رہتا ہے۔ ہم دراصل یہ چاہتے ہیں کہ قارئین ہمیں صرف تعریفی خطوط ہی نہ لکھیں بلکہ وہ ہماری کمیوں کی طرف توجہ بھی دلائیں تاکہ ہم نئی کتاب کے مشمولات کو بہتر سے بہتر بنا سکیں۔

• پہلے پروفیسر ظفر احمد نظامی، پھر پروفیسر قمر رئیس، حبیب تنویر اور اب یوسف ناظم ...ایسا لگتا ہے کہ تیزی سے یکے بعد دیگرے پرانے اور سینئر لوگ اس دار فانی سے کوچ کرتے جا رہے ہیں۔ یوسف ناظم صاحب کی رحلت کے بعد اردو ادب میں ایک بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے۔ مجتبیٰ حسین نے اپنے مضمون میں اس کی طرف انتہائی دردمندی اور لطافت سے اشارہ کیا ہے۔ یوسف ناظم صاحب سے ہمارے چالیس پینتالیس سالہ پرانے اور مضبوط تعلقات تھے۔ ان کا ہمیں چھوڑ کے چلے جانا ذاتی طور پر ہمارے لیے ایک بڑا صدمہ ہے۔

پچھلے دنوں جن اہم اور بزرگ ادبا و شعرا کی رحلت ہوئی ان میں محمود ہاشمی، حیدر پٹھان ایڈووکٹ، جمنا داس اختر، میمونہ دلوی، ڈاکٹر محمد مثنیٰ رضوی، منوہر راج سکسینہ، گنیش بہاری طرز، کاوش بدری، تمیز الدین دہلوی، مکتبہ جامعہ کے سابق خوش نویس ایس۔ایم۔ظفر، سید عارف، سید نظام الدین گوریکر۔ ہم ان سب حضرات کی مغفرت کے لیے دعا گو ہیں۔ ان حضرات کی حیات و خدمات پر آئندہ شمارے میں مضامین شائع کیے جائیں گے، انشاءاللہ!

شاہد علی خاں

شمس الرحمن فاروقی

داستان سرائی کا آغاز نو

داستانیں، اور خاص کر داستان امیر حمزہ کی چھیالیس جلدیں جو (ایک جلد کے سوا، جو 1917 میں شائع ہوئی) نول کشور پریس سے 1883 سے لے کر 1909 کے درمیان چھپیں، ہمارے ادب کا بیش بہا اور انتہائی نادر سرمایہ ہیں۔ داستان امیر حمزہ کی یہ جلدیں اپنے حسن و خوبی، بیانیہ کی رنگا رنگی، قوت ایجاد کے غیر معمولی اظہار، نثر کے تنوع اور لچک دار قوت، ہر طرح کی صنف نظم کی کثرت، اور سب سے بڑھ کر اپنی تخیلاتی وسعت کی بنا پر دنیا کا سب سے عظیم الشان زبانی بیانیہ کہلانے کی مستحق ہیں۔

اگر چہ بہت سے ملکوں میں اب بھی داستان سنانے کا رواج ہے، اور خود ہمارے ملک کی بعض زبانوں، مثلاً تامل اور راجستھان کی مارواڑی، میں زبانی داستان سنانے کا چلن باقی ہے۔ اتر پردیش کے بعض ضلعوں میں آلھا اودل کی منظوم داستان سنانے والے اب بھی مل جاتے ہیں۔ لیکن داستان امیر حمزہ ان سب سے الگ اور بڑھ چڑھ کر ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اس کے خاص کرداروں میں بہت سے عرب اور ایرانی ہیں تو بہت سے ہندوستانی بھی ہیں۔ داستان بنانے اور داستان کہنے کی ہندوستانی روایتوں نے بھی اس پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ اس طرح یہ داستان ایک طرف تو رنگا رنگ وسعت اور تخیل کی بے مثال پرواز، اور بیانیہ قوت کے غیر معمولی اظہار کا نمونہ ہے، تو دوسری طرف یہ ہندوستانی اور مسلم تہذیب کے امتزاج کا اعلیٰ نمونہ بھی ہے۔ اور یہ امتزاج ایسا ہے کہ اس نے ایک بالکل نئی فنی صورت کو خلق کیا ہے۔ یہ داستان اپنی موجودہ شکل میں ہندوستانی اور نامذہبی ہے، جس کی تہ میں مسلمانی تصور کائنات بھی کارفرما ہے۔

داستان گوئی، جب شروع ہوئی تو اس میں رزم، یعنی جنگ اور مہم جوئی اور تلاش و دریافت کا عنصر نمایاں تھا۔ بہت جلد ہی اس میں بزم، یعنی عشق اور عاشقی، موسیقی، رقص اور نغمہ، سماجی محفلیں وغیرہ بھی شامل ہو گئیں۔ اسی زمانے میں عیاری کا عنصر بھی شامل ہونا شروع ہوا اور بہت جلد اس نے داستان میں تقریباً مرکزی جگہ اختیار کر لی۔ عیار کا اصل کام دشمن کو فریب دے کر شکست یاب کرنا، خفیہ خبروں کا معلوم کرنا، ہیرو کے دکھ سکھ، جنگ و امن، عشق اور معشوقی، ہر معاملے میں اس کے ساتھ ساتھ رہنا تھا۔ اسی وجہ سے عیاروں میں تیز روی، بھیس بدلنا، چوری اور جعلسازی، مسخرہ پن، وغیرہ صفات بھی شامل ہوتی گئیں۔ شروع کی داستان میں جادو، طلسم بندی، دیو، پری، وغیرہ کا عنصر بہت کم تھا۔ ہندوستانی داستان گویوں نے داستان کے اس عنصر کو طلسم کا نام دیا اور اس کو بے حد ترقی دی۔ چنانچہ اب جب ہم داستان کے بارے میں خیال کرتے ہیں تو شاید سب سے پہلا نام جو ہمارے ذہن میں آتا ہے، وہ ''طلسم'' کا نام ہوتا ہے۔ بہر حال، اب داستان کی شعریات چار چیزوں سے عبارت مانی جاتی

ہے: (۱) رزم (۲) بزم (۳) طلسم اور (۴) عیاری۔ ان عناصر کے درمیان توازن قائم رکھنا، اور ان کو بیان کرنے میں تنوع کی کثرت، یہ بھی ہندوستانی داستان گویوں کے کارنامے ہیں۔

ہندوستانی داستان گویوں کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ داستان امیر حمزہ جو اپنی عام صورت میں ایران اور کوہ قاف کے ملکوں میں زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو ہزار صفحات میں سما جاتی تھی، ہندوستان میں آتے ہی پھیلنا شروع ہوئی۔ دہلی، پھر رامپور، پھر لکھنو میں داستان گویوں نے اسے اتنا بڑھایا کہ اس کا ایک روپ جو منشی نولکشور کی توجہ سے طبع ہو سکا (جیسا کہ اوپر مذکور ہوا) چھیالیس جلدوں میں سمایا اور ہر جلد میں کوئی ایک ہزار صفحات ہیں۔ اس طرح، چند لاکھ الفاظ کی یہ داستان ہمارے پاس دو کروڑ سے زیادہ الفاظ میں پھیل کر محفوظ ہو گئی۔ اور اس خزانے کے علاوہ رام پور اور لکھنو میں (اسی سلسلۂ حمزہ کی، اور اس سلسلے کے باہر کی بھی)، کئی غیر مطبوعہ داستانیں موجود ہیں۔

داستان کے میدان میں ہندوستان کا تیسرا کارنامہ میر محمد تقی خیال کی ''بوستان خیال'' ہے جو دہلی میں 1730 کے آس پاس فارسی میں لکھی گئی۔ یہ محض ایک شخص کا کارنامہ ہے، اور اگرچہ یہ حجم اور پیچیدگی، اور کرداروں کی کثرت کے اعتبار سے داستان امیر حمزہ کی برابری نہیں کر سکتا، لیکن اس نے داستان امیر حمزہ پر اثر ضرور ڈالا۔ پھر تو نو لمبی چوڑی جلدوں میں اس کے دو اردو ترجمے بھی ہوئے، ایک دہلی میں اور ایک لکھنو میں۔

لہٰذا داستان، اور خاص کر داستان امیر حمزہ کو زبانی بیانیہ کی دنیا میں ہندوستان کا عظیم الشان عطیہ کہنا چاہیئے۔ اور اس کی مطبوعہ صورت کو سامنے رکھیں تو اسے ہندوستانی تحریری ادبیات کا بھی بہت بڑا کارنامہ کہنے میں کوئی تکلف نہ ہونا چاہیئے۔ وہ لوگ جو داستان کو حقیر سمجھتے ہیں، یا اگر حقیر نہیں سمجھتے تو اسے غیر اہم یا غیر ترقی یافتہ کہتے ہیں، انھیں اپنے ملک کے ادب سے محبت نہیں ہے۔

داستان کے بارے میں یہ خیال غلط ہے کہ یہ اس زمانے کی یادگار ہے جب ''انسانی تہذیب اپنے بچپن میں تھی۔ لہٰذا داستان ایک غیر ترقی یافتہ صنف سخن اور ناول کے مقابلے میں اکہری چیز ہے۔'' حقیقت یہ ہے کہ داستان بھی ناول ہی کی طرح ترقی یافتہ صنف ہے، بلکہ اگر یہ بات دھیان میں رکھی جائے کہ داستان کی عمر ہزار بارہ سو برس کی ہو رہی ہے، اور ناول کو باقاعدہ صنف کا درجہ حاصل کئے ابھی مشکل سے ڈھائی تین سو برس ہوئے ہیں، تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ناول کے مقابلے میں داستان بہت زیادہ ترقی یافتہ صنف ہے۔ جدید ناول کے بہت بڑے نظریہ ساز میخائیل باختن (Mikhail Bakhtin) کی یہ بات بالکل صحیح ہے کہ ناول تو ابھی ارتقائی منازل طے کر رہا ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہے کہ داستان کا ارتقا بہت بڑی حد تک ظہور پذیر ہو چکا ہے۔ بہت سے بہت یہ کہا جا سکتا ہے کہ داستان کا آغاز زمانۂ قدیم میں ہوا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں نکلتا کہ یہ غیر ترقی یافتہ، یا ذہنی اور تہذیبی اعتبار سے نفاست یعنی Sophistication کی حامل نہیں ہے۔ آخر یونان میں المیے کا آغاز تو اور بھی پرانا ہے۔ ہمارے ملک میں بھی ڈراما کا آغاز کچھ نہیں تو دو ہزار برس پہلے ہوا۔ خود ہماری اصناف میں غزل اور قصیدہ کم سے کم پندرہ سولہ سو برس پرانی اصناف ہیں۔ تو کیا ہم انھیں غیر ترقی یافتہ قرار دیں گے کیوں کہ یہ پرانی ہیں؟

ہمارے یہاں لے دے کر ایک کلیم الدین احمد صاحب نے غزل کو "نیم وحشی صنف سخن" بتایا۔ اگر چہ ان کے دلائل بودے تھے، اور آج انھیں کوئی تسلیم نہیں کرتا، لیکن قصیدے کو تو کلیم الدین احمد صاحب بھی نیم وحشی نہیں کہہ سکے، حالانکہ غزل اور قصیدہ کی عمر ایک ہے۔ دوسری بات یہ کہ کچھ لوگوں نے داستان کو اس لئے غیر ترقی یافتہ، یا غیر اہم بتایا کہ ان کے خیال میں داستان نے جب ارتقا حاصل کیا تو ناول وجود میں آیا۔ یعنی جس طرح سائنس داں لوگ کہتے ہیں کہ بندر کی ارتقائی صورت انسان ہے، لہٰذا بندر کا مرتبہ انسان سے کم ہے، اسی طرح داستان کی ارتقائی شکل ناول ہے، لہٰذا داستان کا مرتبہ ناول سے کم ہے۔ یہ بات بالکل غلط ہے۔ داستان الگ صنف سخن ہے اور ناول الگ صنف سخن۔ ناول اور داستان الگ الگ چیزیں ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ داستان نے ناول پر کچھ اثر ڈالا ہو، لیکن ناول نے داستان پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔

یہ خیال غلط ہے کہ اصناف سخن کا ارتقا ہوتا ہے، اور یہ اسی طرح ہوتا ہے جس طرح حیاتیاتی (Biological) اشیا میں ہوتا ہے۔ ارتقا کا عمل انسان کی بنائی ہوئی چیزوں پر نہیں ہوتا۔ لہٰذا ناول کو داستان کی ترقی یافتہ، یا ارتقا یافتہ شکل نہیں کہہ سکتے۔ اصناف میں جو تبدیلیاں آتی ہیں انھیں ارتقا نہیں کہہ سکتے، ترقی بھی نہیں کہہ سکتے۔ توسیع کہہ سکتے ہیں۔ ورنہ میر کی غزل کے مقابلے میں غالب کی غزل کو، اور غالب کی غزل کے مقابلے میں ناصر کاظمی یا احمد مشتاق کی غزل کو زیادہ ترقی یافتہ، یا زیادہ ارتقا یافتہ کہنا پڑے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ مہمل بات ہو گی۔ لیکن ناول کو داستان کی توسیع یافتہ شکل بھی نہیں کہہ سکتے۔ اول تو وہ الگ الگ اصناف ہیں، اور دوسری بات یہ کہ وسیع سے وسیع تر ناول بھی داستان امیر حمزہ کے ایک حصے ''طلسم ہوش ربا'' (داستان گو: محمد حسین جاہ اور احمد حسین قمر) کی برابری نہیں کر سکتا۔ یہاں تو یہ عالم ہے کہ وکرم سیٹھ کے ناول A Suitable Boy کو انگریزی کا سب سے بڑا ایک جلدی ناول کہا گیا ہے۔ اور وکرم سیٹھ کا یہ ناول کسی طویل داستان، مثلاً شیخ تصدق حسین کی ''آفتاب شجاعت'' کی ایک جلد کے برابر بھی نہیں ہے۔

داستان اور ناول میں بنیادی فرق یہ ہے کہ داستان کو زبانی سناتے ہیں، اور ناول کو چپ چاپ سے پڑھتے ہیں۔ داستان اگر لکھی ہوئی بھی ہو تو وہ پہلے زبانی سنائی جا چکی ہوتی ہے، یا پھر وہ اس مقصد سے لکھی جاتی ہے کہ اسے زبانی سنایا جائے۔ محمد حسین جاہ داستان (''طلسم ہوش ربا'') لکھ رہے ہیں، لیکن ان کی داستان پہلے زبانی سنائی جا چکی ہے، ایک بار نہیں سینکڑوں بار۔ اور اب بھی وہ لکھ اس طرح رہے ہیں کہ ان کے بقول ع

کہ تحریر میں لطف تقریر ہو

جو تہذیبیں اپنی اہم روایتوں اور ادبی کارناموں کو پہلے زبانی صورت میں بناتی ہیں، ان کے یہاں لکھے ہوئے لفظ کی اہمیت بہت کم ہوتی ہے۔ ان کے حساب سے، وہ بات جو زبانی بتائی جائے (یعنی ملفوظ) ہو، اس بات سے برتر ہوتی ہے جو لکھی جائے (مکتوب) ہو۔ یہی وجہ ہے کہ البانیہ کے شہرۂ آفاق ناول نگار اسمٰعیل قادری کے ناول Broken April میں ایک کردار کہتا ہے کہ ''کاغذ پر لکھے ہوئے لفظ صرف ان لفظوں کی لاشیں ہیں جنھیں زبانی بیان کیا، یا گایا جاتا ہے۔'' ناول اور داستان کے اس فرق کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے ہم لوگوں، اور ہم لوگوں ہی

نے نہیں، بہت سے مغربی نقادوں نے بھی داستان کی اصل اہمیت اور نوعیت کو سمجھا نہیں اور یہ حکم لگا دیا کہ ناول کے مقابلے میں داستان فضول ہے۔

یہ بات افسوس کا موجب ہے کہ داستان گوئی کے عروج ہی کے زمانے میں اس کا زوال بھی شروع ہو گیا۔ اس زوال کی وجہیں بہت سی ہیں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض وجہیں ابھی ہم نے پوری طرح سمجھی بھی نہ ہوں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریزی تہذیب کے دباؤ نے ہماری تہذیب کے بہت سے اہم عناصر کو ہم سے الگ کر دیا، یا ہمیں مجبور کیا کہ ہم انھیں حقیر سمجھیں۔ داستان بھی انھیں اہم تہذیبی مظاہر میں سے تھی جسے ہم نے گنوا دیا۔

اب تو ہم یہ بھی ٹھیک سے نہیں جانتے کہ داستان بنانے اور داستان سنانے کا طریقہ کیا تھا۔ داستان گو لوگ کیا تھے، کون تھے، کتنے پڑھے لکھے تھے، انھوں نے تربیت کہاں سے حاصل کی؟ یہ سب باتیں ہمارے لئے کم وبیش ناپید ہیں۔ مرثیہ بھی چونکہ زبانی بیانیہ کی ایک قسم ہے، اس لئے مرثیہ خوانی کے فن سے ہم کچھ باتیں داستان گوئی کے فن کے بارے میں حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن مرثیے کی مذہبی اہمیت اور حیثیت کی بنا پر مرثیہ خوانی کے فن کا ہر پہلو ہمارے لئے شاید کارآمد نہ ہو۔ اور مشکل یہ بھی ہے کہ مرثیہ خوانی کے فن کے بارے میں بھی ہماری معلومات بہت کم ہیں۔ داستان گوئی میں فارسی میں سترہویں صدی کے نصف اول میں عبدالنبی فخرالزمانی کی ایک کتاب، اور عربی میں انیسویں بیسویں صدی کے کچھ سیاحوں کے بیانات کے علاوہ ہمارے پاس کچھ نہیں۔ اردو داستان گوئی کے بارے میں اردو کے آخری داستان گو میر باقر علی دہلوی (وفات ۱۹۲۸) کو دیکھنے والوں کے دو مختصر بیانات کے علاوہ ہمارے پاس کچھ نہیں۔

ایسی صورت میں داستان گوئی کے آغاز نو کی امید کرنا ایک طرح کی حماقت ہی تھی۔ لیکن میں نے اس حماقت کے لئے کچھ ہونہار نوجوانوں کو تیار کرنا چاہا تو سب سے پہلے میری نگاہ محمود فاروقی پر پڑی۔ محمود فاروقی اردو خوب جانتے ہیں، فارسی بھی تھوڑی بہت جانتے ہیں۔ آکسفورڈ اور کیمبرج کے پڑھے ہوئے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اداکاری، ٹیلی ویژن، فلم ان سب میدانوں میں درک رکھتے ہیں۔ یہ ان کی سعادت مندی ہے کہ انھوں نے حامی بھر لی اور پھر ایک اور اداکار دوست ہمانشو تیاگی کو بھی تیار کر لیا۔ میں نے ''طلسم ہوش ربا'' سے کچھ صفحات کئی جگہوں سے نکال کے انھیں دیئے کہ انھیں دیکھیں، کیا ان کو وہ داستان کے طور پر بیان کر سکتے ہیں؟ ہر چند کہ پرانے داستان گویوں کے بارے میں سنا جاتا ہے کہ وہ داستان فی البدیہہ بناتے اور سناتے تھے، لیکن ان نومشقوں کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ لکھی ہوئی داستان کے ٹکڑے زبانی یاد کر کے سنائیں۔ (رتن ناتھ سرشار نے ''طلسم ہوش ربا'' کی ایک جلد کی تقریظ میں کچھ ایسی عبارت لکھی ہے جس سے اندازہ گذرتا ہے کہ نئے داستان گو بھی زبانی یاد کر کے سناتے تھے۔)

محمود فاروقی نے ایک ترمیم پیش کی، جو میں نے بخوشی منظور کر لی، کہ ایک کے بجائے دو داستان گو ہوں۔ یعنی اسی داستان کا کچھ حصہ ایک سنائے اور بیچ بیچ میں دوسرا داستان گو اپنے حصے کو سنائے۔ اس طرح ایک تو

یہ فائدہ ہوگا کہ ایک ہی داستان گو کو لمبی چوڑی عبارت یاد نہ کرنی پڑے گی، دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ دو طرح کی آوازیں اور طرزیں داستان گوئی میں کچھ تنوع پیدا کردیں گی جو جدید سننے والوں کے لئے شاید زیادہ خوشگوار ہو۔

داستان گوئی کے آداب کے بارے میں جو کچھ مجھے معلوم تھا، اور جو کچھ میں اپنے اندازے سے سمجھ سکتا تھا، ان کی روشنی میں محمود اور ہمانشو کو میں نے داستان گو بننے کی راہ پر لگا دیا۔ سب سے پہلی خوشی اس بات کی ہوئی کہ داستان گویوں نے اداکاری کی صلاحیت اور تجربے کو کام میں لاتے ہوئے داستان گوئی کو اس طرح اختیار کرلیا گویا یہ ان کا فطری کام تھا۔ اردو نہ جاننے کے باوجود ہمانشو تیاگی نے (اور بعد میں دانش حسین نے، کہ وہ بھی اردو سے بے بہرہ ہیں) تلفظ، لہجہ، آواز کے زیر و بم، مختلف کرداروں اور صورت حالات کے مطابق زبان کا استعمال، ان سب چیزوں میں غیر معمولی درک کا اظہار کیا۔ داستان گوئی کی پہلی محفل انڈیا انٹرنیشنل سنٹر، نئی دہلی میں منعقد ہوئی۔ ولیم ڈیلرمپل کی صدارت تھی۔ پورا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور سامعین میں بھاری اکثریت غیر اردو دانوں کی تھی۔ اس کے باوجود داستان کا بیانیہ اس قدر جابر (جھکا دینے والا) اور داستان گویوں کی ادائیگی اس قدر رمہ تھی کہ سارا ہال واہ واہ، سبحان اللہ، کیا بات ہے! کیا خوب! کے نعروں سے گونج رہا تھا۔

پھر تو داستان گوئی کے جلسے جگہ جگہ ہونے لگے۔ ملک کے طول و عرض میں، پاکستان میں، پھر نیو یارک میں جلسے ہوئے اور بے حد کامیاب ہوئے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ممبئی اور نیو یارک کی محفلوں میں نصیرالدین شاہ بھی بطور داستان گو شریک ہوئے۔ اس طرح اس فن کا وقار اور بڑھا ہے۔ داستان امیر حمزہ کے ساتھ کبھی کبھی ''جدید داستان'' پیش کی گئی، یعنی جدید واقعات کے بارے میں داستانی رنگ کے بیانیے تیار اور پیش کئے گئے۔

یہ بات ملحوظ رہے کہ محمود فاروقی اور ان کے ساتھیوں نے اصل داستان امیر حمزہ کا ایک چھوٹا سا بھی حصہ نہیں پیش کیا ہے۔ ''طلسم ہوش ربا'' سے بعض چھوٹی داستانیں، یا مناظر نکال کر، لیکن انھیں کم و بیش بجنسہ سنایا ہے۔ لہٰذا یہ داستانیں نہیں، ''داستان زادیاں'' ہیں۔ امید ہے کبھی پوری داستان پیش کرنے کی بھی نوبت آئے گی۔ ظاہر ہے کہ پوری داستان کئی محفلوں اور کئی جگہوں پر سنائی جائے گی، تب کہیں جا کر پوری ہوگی۔

محمود فاروقی نے اب تک جو داستانیں پیش کی ہیں، ان کا ایک مختصر مجموعہ اردو اور دیوناگری دونوں رسوم الخط میں پیش کیا جا رہا ہے، جو بڑی خوشی کی بات ہے۔ مجھے امید بلکہ یقین ہے کہ یہ مجموعہ داستان گویوں کی تعداد میں اضافہ کرے گا۔ لیکن محمود فاروقی کو مبارکباد دینے کے ساتھ میں یہ بات ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ داستان گوئی اور فلم یا ڈرامے کے مکالمے ادا کرنے میں کئی فرق ہیں۔ یہ ممکن ہے کسی زبان کو نہ جاننے والا ایکٹر بھی سن سنا کر اس زبان کے مکالمے بول دے اور کامیاب رہے۔ یا سیکھ کر اور مشق کر کے غیر الفاظ کا صحیح تلفظ سیکھ لے۔ لیکن داستان میں زبان جس سطح پر اور جس تنوع سے استعمال ہوتی ہے وہ سطح اور تنوع فلم یا ڈرامے میں موجود نہیں۔ لہٰذا داستان گو کو اگر فارسی اور اردو دونوں نہیں، تو اردو پڑھنے اور سمجھنے پر ضرور قادر ہونا چاہیے۔

میں دعا کرتا ہوں کہ داستان گوئی کی یہ چھوٹی سی نہر جو محمود اور ان کے ساتھیوں نے اس سنگلاخ زمانے کی زمین میں کاٹی ہے، کسی وقت جلد ہی ایک جوئے بے کراں بن جائے۔

الٰہ آباد، اگست 2009

ڈاکٹر خالد حسن قادری (لندن)

اُردو کا آغاز اور مولد

اردو کے ماخذ کو جاننے کے لیے زبان اور لسانیات کے غیر متوقع دائروں اور منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اب تک عام طور پر اردو کے بارے میں نظریہ عام رہا ہے کہ یہ زبان "موَر" (مسلمان) حملہ آوروں اور ہند کی مقامی آبادی کے معاشرتی تعلقات کا نتیجہ ہے، لہٰذا یہ زبان، ترکی، فارسی اور عربی الفاظ اور پراکرتوں (مقامی بولیوں) کے ملاپ سے ظہور پزیر ہوئی۔ یہ ان نظریات کا لب لباب ہے جنھیں ممتاز ماہرین لسانیات نے پیش کیا ہے۔ ان میں سے صرف دو ماہرین گریرسن اور سر چارلس لائل کے نام لینے کافی ہیں۔

یہ نظریہ اس مفروضے پر قائم ہے کہ یہ پراکرتیں خود سنسکرت کی بنیاد پر وجود میں آئیں۔ بلکہ کچھ ماہرین تو انھیں سنسکرت ہی کی پیداوار سمجھتے ہیں۔ اس وجہ سے اردو کے بارے میں دلیل اور ثبوت کے بغیر یہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ یہ ترکی، فارسی اور عربی الفاظ کی بھرمار کے ساتھ سنسکرت کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے۔ مگر درحقیقت معاملہ اتنا سیدھا اور صاف نہیں ہے جیسا نظر آتا ہے یا بتایا جاتا ہے۔ اس کے لیے ہمیں تاریخ بلکہ ماقبل تاریخ کے دور میں جانا پڑے گا اور وقت کی متعدد تہوں کو پلٹنا پڑے گا۔

اب تک تقریباً سبھی نامور علمائے لسانیات ہند آریائی زبانوں پر اپنی بحث کا آغاز سنسکرت سے کرتے چلے آئے ہیں۔ ان کے لیے سنسکرت ہمیشہ ہی سے نقطۂ آغاز رہا، جو شمالی ہند کی تمام زبانوں کی ماں سمجھی جاتی ہے اور جس سے ہندوستان کی تمام نام نہاد ہند آریائی زبانوں نے جنم لیا۔ ایک سادہ سا سوال جو اکثر اس لیے نہیں پوچھا جاتا کہ اس کا نظر انداز کرنا آسان ہے لیکن اس کا جواب فراہم کرنا مشکل، کہ آریائی قوم نے جب ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا تو اس وقت ہندوستان کا لسانی نقشہ کیا تھا؟ کیا وہ لوگ جو شمالی ہند کے اس وسیع، زرخیز اور تہذیب یافتہ علاقے میں رہتے تھے اور حملہ آور آریاؤں کے ساتھ جن کا واسطہ پڑا کیا وہ گویائی سے محروم تھے ان کی کوئی زبان ہی نہیں تھی؟ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر وہ کون سی زبان یا زبانیں تھیں جنھیں وہ استعمال کرتے تھے؟

آریاؤں کا ورود بالعموم ۱۵۰۰ ق۔م۔ کے آس پاس بتایا جاتا ہے جس کی حیثیت ایک مفروضے سے زیادہ نہیں۔ ویدوں کے بارے میں بھی یہی کہا جاتا ہے کہ ویدوں کا زمانہ تقریباً ایک ہزار سال پر محیط ہے۔ فرض کرلیا گیا ہے کہ آخری وید "اتھروو وید" کی تصنیف ۴۰۰ ق۔م۔ کے آس پاس ہوئی اور سب سے پہلا وید ۱۴۰۰ ق۔م۔ میں لکھا گیا۔ مگر یہ تمام تاریخیں واضح طور پر محض الل ٹپ نظریات ہیں۔ یہ بھی اندازہ لگایا گیا ہے کہ تقریباً ایک ہزار سال تک یہ وید اور بالخصوص پہلے تین وید ضبطِ تحریر میں نہیں آئے اور رسم الخط کی ایجاد و دریافت سے پہلے تقریباً ایک ہزار سال کی مدت تک یہ تمام وید صرف زبانی اور سماعی روایات کے طور پر منتقل ہوتے رہے۔ یہ بات ناقابلِ قیاس ہے کہ جو زبان آریہ اپنے ساتھ لے کر آئے تھے اس نے مقامی یا غیر آریائی زبانوں کے کثیر الفاظ کو اخذ و تبدیل

کرکے اپنے اندر جذب نہ کیا ہو۔ میں نے یہاں ''زبانوں'' کا لفظ استعمال کیا ہے، ''بولیوں'' کا نہیں۔ ہم آگے چل کر اسی موضوع کا مطالعہ کریں گے۔ ویدوں کی زبانوں نے مقامی زبانوں کا گہرا اثر قبول کیا تھا جس کی وجہ سے یہ زبان اُس ایک ہزار سال پہلے والی سنسکرت سے بہت زیادہ مختلف تھی جو حملہ آور اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ سنسکرت کے بہت سے ماہرین اب اس نقطۂ نظر میں متفق ہو چکے ہیں۔ ویدوں کی سنسکرت کے بہت سے اجزاء اس کی ہم ماخذ یورپی زبانوں میں موجود نہیں۔ مثال کے طور پر زبان کے پچھلے حصے سے نکلنے والی آواز اور الفاظ کی ایک کثیر تعداد جو کہ ویدوں کی سنسکرت میں تو موجود ہے لیکن یورپی شاخ کی دوسری آریائی زبانوں سے غائب ہے۔ اس ثبوت کے علاوہ بھی، جو آج ہمارے پاس ہے، یہ امر بآسانی تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ حملہ آور آریاؤں کی سنسکرت رسم الخط کی عدم موجودگی میں محض زبانی روایات کے بل بوتے پر تقریباً ایک ہزار سال کے عرصے تک تبدیلی کے عمل سے محفوظ نہ رہ سکی ہوگی۔

پانینی نے جب پشاور میں اپنی لافانی قواعد مرتب کرنا شروع کی تو جس زبان سے وہ واقف تھا وہ آریوں کی اصل زبان سے واقعی مختلف تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ پانینی کی سنسکرت بھی ویدوں کی سنسکرت سے بہت مختلف تھی۔ قواعد کی کچھ شکلیں ایسی بھی ہیں جو رگ وید میں تو ہیں مگر جدید سنسکرت میں ان کا وجود نہیں۔ اس بات کو بھی یاد رکھنا چاہیے کہ سنسکرت کو خود تبدیلیوں کے بے شمار مراحل سے گزرنا پڑا ہے جس کا بالعموم اعتراف نہیں کیا جاتا۔ ہمیں یہ جاننے کے لیے قبل از آریہ دور میں جانا پڑے گا کہ وہ لوگ جو حملہ آور آریاؤں کے خلاف نبرد آزما تھے، کون سی زبانیں بولتے تھے۔ اب عموماً یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ دراوڑ ہی تھے جو آریاؤں کے حملے کے وقت ملک کے شمالی حصے پر حکمرانی کرتے تھے اور جو زبانیں اس دور میں ان علاقوں میں بولی جاتی تھیں ان کی اصل لازماً دراوڑی ہی ہوگی۔ براہوی شمال مغرب کی ایک زندہ زبان ہے جو کہ دراوڑی کی ہی ایک صورت ہے۔ اگر یہ ثابت کرنے کے لیے مزید کسی ثبوت کی ضرورت ہے کہ آریاؤں کے حملے کے وقت دراوڑ ہی مقامی باشندے تھے تو داوڑی زبانوں کا آسانی سے شمال کی جدید زبانوں سے موازنہ کیا جا سکتا ہے۔ اور اس طرح کے موازنے سے ہمیں بہت سی باتیں ایسی ملتی ہیں جو ان زبانوں میں اس قدر مشترک ہیں کہ انھیں محض اتفاق کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

جب آریہ آئے اور انھوں نے ملک کے شمالی علاقے فتح کیے تو انھوں نے مفتوحہ علاقے کی تمام آبادی کا قتلِ عام نہیں کیا۔ تمام حملہ آوروں کی طرح آریہ بھی تعداد میں کم تھے اور انھیں مفتوح علاقوں کے رہنے والوں کے ساتھ تعلقات استوار کرنے کی ضرورت تھی۔ انھوں نے مقامی طور پر شادیاں بھی کیں۔ کوئی یہ نہیں مان سکتا کہ ہر حملہ آور کے ساتھ ایک اعلیٰ نسل کی آریہ عورت بھی ہوگی تاکہ توالد و تناسل کا سلسلہ قائم رہ سکے۔ اس طرح نہ تو ان کا خون خالص رہا اور نہ ان کی زبان ہی خالص رہی جیسا کہ عام طور پر تصور کیا جاتا ہے۔ ہر بیرونی حملہ آور کی طرح انھیں بھی معاشرتی روابط قائم کرنے، تعلقات استوار کرنے، زبان سمجھنے جیسے معاملات کے لیے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ اور یقیناً زبان ہی سب سے پہلی رکاوٹ ہوتی ہے جس کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چوں کہ آریہ مفتوح لوگوں کی زبان سمجھنے سے قاصر تھے لہٰذا انھوں نے مفتوحین کی زبانوں کو ''وِبھاشا'' (غیر زبان) یا وہ اسے

''اشور بھاشا'' (بھوتوں کی زبان) یا پھر ''ناگ وانی'' (ناگ، سانپ اور ناگ قوم کی زبان) کہتے تھے۔ یہ سارے نام ایک بیرونی زبان کو ظاہر کرتے ہیں۔ لفظ بیرونی سے ان کی مراد ایک ایسی زبان تھی جو نا قابل فہم ہو، کیوں کہ ان کے نزدیک ان زبانوں میں نہ کوئی ربط تھا نہ منطق اور نہ قابل فہم قواعد۔ اسی وجہ سے ان زبانوں کو ''غیر زبان'' (یعنی کوئی زبان نہیں) کا درجہ دیا گیا۔ جیسا کہ ہر مادری زبان بولنے والے کو اپنی زبان معقول، مدون اور منظم لگتی ہے، کانوں میں شیرینی گھولتی ہے، اس وجہ سے آریہ بھی اپنی زبان کو خالص، تہذیب یافتہ زبان ''سنسکرت'' اور دیوتاؤں اور دیویوں کی زبان ''دیوادانی'' (دیوابانی) کہتے تھے۔ یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ ''زبان کی برتری اور ثقافتی تکبر کا احساس'' صرف سنسکرت کے ''اصلی بولنے والوں'' تک محدود نہ تھا، بلکہ وہ ان احساسات میں ''اصلی عربی بولنے والوں'' کے ساتھ شریک تھے۔ عرب بھی اپنی زبان 'عربی' زبان کو دوسری زبانوں سے اعلیٰ مانتے تھے، اس حد تک کہ ان کے نزدیک وہ خود ''نہایت فصیح اللسان'' تھے اور دوسرے غیر عرب ان کے نزدیک ''گویائی'' سے محروم تھے۔ وہ دوسرے تمام غیر عرب کو ''عجمی'' کہا کرتے تھے جس کا مطلب ہے ''گونگا''! جس طرح سنسکرت زبان نے شمال کی دراوڑ زبان کا اثر قبول کیا تھا اسی طرح فطری طور پر اس نے بھی مقامی زبان پر اپنا گہرا اثر ڈالا، اور پھر اس طرح ایک نیا انداز ابھر کر سامنے آیا۔ مقامی زبانوں کی یہ نئی صورت گری آگے چل کر ''پراکر'' پراکرت کہلائی۔ ہندوستانی لسانیات وثقافت کے بعض ماہرین کا خیال ہے کہ پراکرت کسی خاص زبان کا نام ہے، جب کہ واقعتا ایسا نہیں ہے۔ تمام علاقوں کی زبانیں سنسکرت سے متاثر تھیں اور چوں کہ علاقہ کی ایک الگ زبان تھی، اس لئے قدرتی طور پر کئی مختلف ''پراکرتیں'' وجود میں آگئیں۔ جب حملہ آور آریاؤں کی طرف سے اڑایا ہوا گرد وغبار بیٹھ گیا اور معاملات قدرے معمول پر آگئے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ایک خالص، تہذیب یافتہ اور روحانی زبان ''سنسکرت'' کے شانہ بشانہ کئی ایک خام، غیر ترقی یافتہ اور غیر مہذب ''پراکرتیں'' بھی ہیں، جو اگر عمومی طور پر نہیں، تو کم از کم ادبی طور پر سنسکرت سے متاثر تھیں، جن میں 'مہاراشٹری' اور اس کی شاخیں ''مگدھی'' اور اس کی مختلف صورتیں شامل تھیں۔ اس کے ساتھ ہم ''اپ بھرنسا'' (اپ بھرنش) کو دیکھتے ہیں جو کہ سنسکرت سے دور الگ تھلگ نظر آتی ہے اور یہ بھی یقیناً پراکرت ہی کی طرح ایک گروہ کا نام تھا۔ اس میں وہ تمام زبانیں شامل تھیں جو دراوڑ گروہ سے تعلق رکھتی تھیں (براہوی، تامل، تیلگو، ملایالم، اور دیگر) نیز ''پشاچی'' گروہ کی تمام زبانیں، سندھی اور اس کی مختلف صورتیں مثلاً سرائیکی، بہاولپوری، ڈیروالی، پنجابی اور دیگر قسمیں جیسا کہ ملتانی، پوٹوہاری، ہندکو، کشمیری، ہریانوی وغیرہ اور ''دردا'' گروہ کی تمام زبانیں پشتو اور بلوچی وغیرہ۔

جس طرح تسلیم کیا جاتا ہے کہ اردو مسلمانوں اور مقامی افراد کے معاشرتی اختلاط سے ظہور پذیر ہوئی، تاریخ نے خود کو دہرایا ہے۔ مسلمانوں کے روابط اس سرزمین کے شمال مغربی علاقوں کی گزرگاہوں میں بسنے والے قبائل کے ساتھ پہلے سے استوار تھے۔ قدیم سندھ کی وسیع اور کثیر المقاصد مصروفیات کا علاقہ تھا۔ موجودہ پنجاب کا بیشتر علاقہ قدیم سندھ کی ریاستی حدود میں شامل تھا۔ اس قدیم عظیم تر سندھ کی زبانیں وہ تھی جنہیں تبدیلیوں کے اس عمل سے گزرنا پڑا جو پہلے حملہ آور آریاؤں کی وجہ سے شروع ہو چکا تھا۔ لہٰذا اس علاقہ کی زبان پر ایک گہری نظر ڈالنا

ضروری ہے تا کہ اردو کی اساس کو طے کیا جاسکے۔ یقیناً اگر ممکن ہو سکے، تو لسانی تجربہ گاہ میں اس کا خوردبینی تجزیہ بھی ہونا چاہئے، مگر افسوس کہ یہ طریقہ جدید لسانیات کے سائنسی ذرائع کی دسترس سے باہر ہے۔ مگر ایک چیز جو بار بار سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ ان زبانوں کا ایک مضبوط عنصر، جو زیادہ غالب تو نہیں، نہ صرف قبل از آریائی ہے بلکہ دراوڑ دور سے بھی قبل کی خصوصیات کا حامل ہے۔ یہاں یہ کہنا مقصود ہے کہ کچھ عناصر حیرت انگیز طور پر ''منڈا'' گروہ کی زبانوں سے مماثلت رکھتے ہیں۔ اب یہ عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ یہ قبائل وسطی بھارت کے جنگلات اور خطرناک پہاڑی گزرگاہوں میں رہا کرتے ہیں۔ بھیل، گونڈ، سنیتھال اور ان جیسے اور، تقریباً دو ہزار سال سے زیادہ مدت تک جدید معاشرے یا سماج سے ہر قسم کی معاشرتی، ثقافتی اور تہذیب یافتہ زندگی سے دور رہ کر زندگی گزارتے رہے ہیں، حتیٰ کہ قرب وجوار اور ہمسایہ علاقوں کے ساتھ بھی ان کے کوئی معنی خیز روابط نہیں رہے۔ اس لئے یہ بات مطلق قابل قیاس نہیں کہ ہزاروں میل دور شمال میں قدیم سندھ کے باشندوں کے ساتھ ان کے کسی طرح کے بھی روابط رہے ہوں۔ اگر عظیم تر سندھ کی زبانوں میں ''منڈا'' قبائل کی زبانوں کے مماثل عناصر ہیں تو پھر اس کی صرف ایک ہی وجہ ممکن ہوسکتی ہے وہ یہ کہ یہ قبائل کبھی ملک کے ان علاقوں میں رہتے ہوں گے۔ اس علاقے میں حفریات، جدید کھدائی اور فنون و آثار قدیمہ کے مطالعہ نے دلائل سے ثابت کر دیا ہے کہ دراوڑ بھی ہند کے اصل باشندے نہیں تھے بلکہ وہ بھی آریاؤں ہی کی طرح حملہ آور تھے، جب کہ اصلی باشندے یا کم از کم اس وقت بسنے والے لوگ ''منڈا'' قبائلی تھے۔

اب ہم قبل از دراوڑ دور کے ساتھ ''پتھر کے دور'' کے مبہم اور دھندلے ماحول میں داخل ہوتے ہیں۔ کچھ ماہر بشریات تسلیم کرتے ہیں کہ ان منڈا قبائل کی نسل وہی تھی جو آسٹریلیائی باشندوں کی ہے، جو خدا جانے کہیں کسی دور میں، اور نہ جانے کب آسٹریلیا بشمول نیوزی لینڈ اور دیگر علاقوں کے، درۂ خیبر تک پہنچے۔ وہ اپنے مفروضات کی بنیاد اس وسیع علاقے کے مختلف حصوں سے ملنے والی باقیات میں پائی جانے والی اعضائی مماثلت کو بناتے ہیں۔ حیرت انگریز طور پر موئن جوڈرو کی تہذیب دراوڑ دور کی معاصر ہے یا پھر اس کا احاطہ کرتی ہے۔ حال ہی کی کھدائی اور اس وسیع وعریض علاقے کے مختلف مقامات پر آثار قدیمہ کی دریافت بشمولیت بھارت میں رجستھان یا پھر کاٹھیاواڑ اور پاکستان میں موئن جوڈرو کے قریب آمڑی اور نال (بلوچستان) نے بہت مضبوط ثبوت مہیا کئے ہیں کہ اس تہذیب نے موئن جوڈر دور سے قبل فروغ پایا تھا اور بلاشبہ شمالی علاقے میں ''منڈا'' تہذیب غالب تھی۔

یہ بات عظیم تر سندھ کی زبانوں میں منڈا زبان کے لسانی عناصر کی موجودگی کی بھی وضاحت اور تشریح فراہم کرتی ہے، جس کی اب تک کوئی تشریح اور سبب بیان نہیں کیا جاسکا۔

اردو کی اصل بنیاد کے مطالعے کے لئے اب ہمیں ماضی بعید کے تقریباً دھندلاتے ہوئے قبل از تاریخ کے دور میں ایک گہرا غوطہ لگانا ہوگا۔ اختصار کے ساتھ یہ کہ میں یہ مانتا ہوں کہ سب سے پہلے منڈا قبائل کا (بھیل، گونڈ، سنتھال، منڈا، سوارا اور دیگر اقوام نیز ان کی زبانیں بھیلی، گونڈی، سنتھالی جو کہ ازروئے تعلق منڈا کہلاتی ہیں) وجود تھا اور جو آمڑی، نال روپڑ، راجستھان اور کاٹھیاواڑ میں کھدائی سے واضح ہوا ہے۔ اس کے بعد دراوڑ

آتے ہیں۔ ان کا دور اور ان کی ثقافتی برتری کا زمانہ جس کا عکس موئن جو دڑو اور ہڑپہ وغیرہ کی کھدائی میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے بعد آریہ سنسکرت کا علم بلند کئے آتے ہیں۔

اب آیئے اس دعویٰ کی طرف کہ تمام ہند آریائی زبانیں سنسکرت سے نکلی ہیں۔ یہ ثابت کرنے کے لئے زبان ''الف'' زبان ''ب'' کی ماں ہے، ان دونوں کے درمیان قواعد کی مماثلت کا مدلل ثبوت دینا ہوگا۔ اولاً مجھے با بانگِ دہل یہ کہنا ہے کہ تمام زبانیں سنسکرت سے نہیں نکلی ہیں۔ اردو اور اس کے ساتھ ہندی اپنے وجود کے لئے سنسکرت کی مطلق محتاج نہیں اور جن معنوں میں ہند آریائی زبانوں کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے، ان معنوں میں اردو اور ہند آریائی زبانیں بھی نہیں کہی جاسکتیں۔ نیز یہی نظریہ دوسری ہندوستانی زبانوں کا بھی احاطہ کرسکتا ہے جن کی اب تک بغیر حیل وحجت ہند آریائی زبان کے ساتھ گروہ بندی کی جاتی تھی۔ ہم اپنے نظریہ کو ثابت کرنے کے لئے ''ہندوستانی'' کی مدد لیں گے۔ (میں اگر چہ اس مبہم اور کچھ حد تک مغالطہ آمیز اصطلاح سے متفق نہیں ہوں لیکن آسانی کے لئے اس کا استعمال محدود حد تک کیا جائے گا۔)

اب ہم قواعد کی بنیادی ساخت کا تجزیہ کرتے ہیں اور ان میں سنسکرت کے نام نہاد پیدائشی نشانات کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اسم:

بیشتر سنسکرت کے اسم ''ان'' کی آواز کے ساتھ ختم ہوتے ہیں، جو کہ لفظ کے اوپر ایک ''انوسور'' کے ساتھ یا لفظ کے اختتام پر آدھے حرف کے اضافے کے ساتھ لکھے جاتے ہیں۔ جیسا کہ پستک یا پستکم (کتاب)، پتر یا پترم (خط)، اکشر یا اکشرم (حرف)، دگدھ یا دگدھم (دودھ) وغیرہ وغیرہ۔ یہ نون کی آواز حرف کے اوپر ایک نقطہ لگا کر لکھی جاتی ہے۔ یہ خاصیت ہندوستانی زبان میں کلی طور پر غائب ہے۔ حیرت انگیز طور پر عربی زبان میں، جو ایک سامی زبان ہے، بالکل اسی طرح کی خاصیت پائی جاتی ہے۔ عربی اسم کا اختتام بھی ''ن'' پر ہوتا ہے جو کہ ''نوئیشن'' (nuation) کہلاتا ہے۔ مثلاً کتاب ''ایک کتاب، خطاب، ایک خط، لفظ'': ایک لفظ لبن'' دودھ وغیرہ وغیرہ۔ یہ بھی دلچسپ بات ہے، جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے کہ سنسکرت میں بھی یہ آواز ''ان'' سے آتی ہے، جسے انوسور کہا جاتا ہے۔ مگر اس سے کچھ ثابت کرنا مقصود نہیں، یہ صوتی مماثلت محض اتفاقی ہے۔

جنس:

سنسکرت میں تین جنس پائی جاتی ہیں۔ مذکر، مؤنث اور غیر جنس۔ ہندوستانی میں صرف دو جنس ہیں مذکر و مؤنث۔ اس میں جنس غرجنس نہیں ہے۔ اس طرح اس میں سنسکرت کی طرح ایک عجیب حالت نہیں ہے کہ جب ''کلترم'' کو جس کا مطلب بیوی ہے، غیر جنسی کہا جاتا ہے! آریائی خاندان کی کچھ یورپی زبانوں میں بھی اسی طرح کی حالت ہے، جیسا کہ جرمن زبان میں ''مادخن'' جس کے معنی ایک لڑکی کے ہیں، غیر جنس ہے! یعنی مذکر یا مؤنث۔

جنس سے متعلق قواعد سنسکرت اور ہندوستانی میں مختلف ہیں۔ سنسکرت میں قواعد قطعی اور واضح نہیں ہیں۔

عمومی طور پر ایک لفظ کی جنس کا تعین، بغیر تمیز مؤنث مذکر، اس کے آخری حرف سے کیا جاتا ہے۔ پھر عموماً ایک اسم کے آخر میں ''ا'' کی آواز نسوانیت کی طرف اشارہ کرتی ہے جب کہ ''ای'' کا اشارہ مذکر کی طرف ہوتا ہے اور ''او'' تین میں سے کسی بھی جنس کی طرف اشارہ کر سکتا ہے۔ یہاں ہمیں اپنے موضوع سے تھوڑا ہٹنا ہوگا اور یہ امر واضح کرنا ہوگا کہ سنسکرت اور ہندوستانی کے جنس کی اقسام میں بنیادی فرق سے اردو اور جدید ہندی کے درمیان فرق پیدا ہوتا ہے۔ اردو اور جدید ہندی میں غیر جنس نہیں ہے، مگر کئی الفاظ کی جنس اردو اور جدید ہندی میں قطعی مختلف ہے۔
اب یہاں سے ہم ہندوستانی کی جگہ اردو کہیں گے اور یہ بھی اشارہ کریں گے کہ یہ بیان ہندی پر بھی صادق آتا ہے یا نہیں۔ وہ الفاظ جو ہندی نے سنسکرت سے خود لئے ہیں، چاہے ''تتسم'' یعنی بغیر تبدیلی کے، یا ''تدبھو''، یعنی بناوٹی یا بگڑے ہوئے۔ ان لفظوں میں وہی جنس پائی جاتی ہے جو کہ سنسکرت میں ہے، سوائے غیر جنس کے جہاں ہندی کی الگ الگ طریقوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

لیکن اس سے ہٹ کر اردو میں اور ہندی میں بھی، جنس کے تعین کے اصول سنسکرت سے متضاد ہیں۔ اردو میں مذکر الفاظ کا خاتمہ ''ا'' پر ہوتا ہے مؤنث کا عموماً ''ی'' پر۔ وہ الفاظ جو ہندی نے سنسکرت سے نہیں لیے اسی طریقے پر ہیں، مثلاً 'اچھا' 'برا'، 'چھوٹا'، 'بڑا'، 'لڑکا'، 'گھوڑا'، وغیرہ تمام ہندی میں مذکر ہیں اور اس کے علاوہ یہ بھی کہ ان کا اختتام ''ا'' ہے اور ان کی اصل سنسکرت نہیں ہے اور یہ کہ اردو اور ہندی میں ان لفظوں کے ''ا'' کو ''ی'' میں بدل کر مؤنث بنایا جاسکتا ہے اور یہ مبالغہ سنسکرت کے اصول سے متضاد ہے۔

اردو اور ہندی میں مؤنث الفاظ کا جسامت اور تصغیر کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، مثال کے طور پر 'پہاڑ'، 'تختہ'، 'منکا'، 'کٹورا' جیسے الفاظ چیزوں کی جسامت بھی بتاتے ہیں اور یہ مذکر ہیں، جن کے اسم تصغیر پہاڑی، 'تختی'، 'گھڑی'، 'منکی'، 'کٹوری'، تمام الفاظ مؤنث ہیں۔ یہ طریقہ سنسکرت سے متضاد ہے۔

اعداد:

سنسکرت کے اعداد کا طریقہ کافی پیچیدہ ہے۔ تین سے انیس تک جمع کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے، جو کہ مذکر یا مؤنث میں تبدیل نہیں ہوتا، جیسے ''پنچ دشا پروشا'' (مذکر) یعنی پندرہ آدمی اور ''پنچ دشا سینا'' (مؤنث) یعنی پندرہ سپاہی۔ اور بیس کے بعد نوے تک یہ واحد مؤنث ہوتے ہیں۔

اردو اور ہندی میں یہ بے قاعدگی نہیں ہے اور ان کا اعدادی نظام ماسوائے چند ایک معاملوں کے، سیدھا اور باقاعدہ ہے۔ مزید حیرت انگیز بات یہ ہے کہ عربی کا اعدادی نظام بھی کافی پیچیدہ ہے، مگر مشابہ نہیں ہے اور جس کے تین سے لے کر دس تک بنیادی اعداد کے بعد اسم آتا ہے، جس کے مضاف الیہ کی وضاحت کرتے ہیں۔ مثلاً ثلاثہ رجال، تین آدمی خمسہ کتب، پانچ کتب، ست بنات، چھ لڑکیاں۔

تین سے دس تک اعداد کی جنس اور اسم جس کی وہ ضاحت کرتے ہیں، بالکل متضاد ہوتے ہیں۔ جیسے کتب، رجال مذکر ہیں اور وہ مؤنث خمسہ، ثلاثہ کے ساتھ آئے ہیں۔ جب کہ 'بنات' مؤنث ہے اور مذکر 'ست' کے ساتھ آیا ہے۔ ست مگر 'ستہ' کے ساتھ نہیں اور اسی طرح اور بھی مثالیں ہیں۔ پھر بھی مختلف گروہ کی ان دونوں زبانوں میں پائی

جانے والی یہ مشابہت کچھ بھی ثابت نہیں کرتی یہ محض اتفاقی ہے۔

فعل:

سنسکرت اردو اور ہندی میں فعل اور زمانے کا نظام بھی خاصہ مختلف ہے۔ سنسکرت میں عربی کی طرح افعال میں واحد اور جمع کے علاوہ تیسری حشنیہ بھی ہے۔ اردو میں ہم اس نظام کے قطعی قائل نہیں۔ اردو اور ہندی میں مؤنث فعل کا اختتام ممیز اور جدا ہے۔ اردو اور ہندی فعل میں 'وہ پڑھتا ہے' کا مؤنث ہے 'وہ پڑھتی ہے'۔ مگر سنسکرت میں ''وہ (مذکر، مؤنث، بے جان) پڑھتا ہے'' کے لئے ایک ہی قسم آئے گی ''پٹھتی'' اور یہی طریقہ افعال کی تمام اقسام کا احاطہ کرتا ہے۔

زمان یا زمانہ:

اردو اور ہندی میں زمانۂ حال/ ماضی سادہ، زمانۂ حال جاری سے مختلف ہوتا ہے، یعنی'' جاتا ہے'' اور'' جارہا ہے''(اس موضوع پر مفصل اور مکمل بحث کرنا ہے)۔

ان مثالوں نے واضح کردیا کہ اردو کے پاس مربوط اور واضح قواعد ہے، جو کلی طور سنسکرت سے مختلف ہے۔ قواعد سے متعلق ان دونوں کا بنیادی فلسفہ ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہے اور کسی طرح خیال وخواب میں بھی یہ گمان نہیں کیا جانا چاہئے کہ اردو سنسکرت سے نکلی ہے۔ قواعد میں اردو نے سنسکرت سے کچھ بھی نہیں لیا اور نہ ہی ہندی نے۔ اور اگر ایسا نہ ہو جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، تو بھی اردو کو آریائی زبانوں کے قبیلے میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔ واضح طور پر اردو، (اور ہندی بھی) غیر ہند آریائی زبانوں کے گروہ سے تعلق رکھتی ہیں۔

اب ہمیں ہندوستان کی غیر آریائی زبانوں کے ساتھ اردو لسانی روابط کو پرکھنے، ان کے باہمی تعلق کا مطالعہ کرنے اور تجزیہ کرنے کی طرف متوجہ ہونا چاہئے اور برعظیم کے شمالی علاقوں کی زبانوں کا پھر سے جائزہ لینا چاہئے۔ یہ امر بالکل واضح ہے کہ لسانی اثرات مکمل طور پر ہمیشہ کے لئے کالعدم نہیں کئے جاسکتے اور زمانے کی بے رحم دست برد اور غارت گری انہیں جس حال میں بھی چھوڑتی ہے وہ برابر جہد للبقاء میں مصروف رہتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ دراوڑ اور منڈا قبائل کے الفاظ کی دریافت، مقام کا تعین، شناخت اور وضاحت ضروری ہے جو عظیم تر سندھ کے علاقوں کی زبانوں میں رائج ہیں۔ کچھ خصوصیات جن کی نہ شناخت ہوسکتی ہے اور نہ ان کی واضح گروہ بندی کی جاسکتی ہے، وہ لازماً ہڑپائی، نال اور آمزی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہم آج بھی شاید یا یقیناً ایسے الفاظ بولتے ہیں جو ان لوگوں کی زبان میں مستعمل تھے جو ان علاقوں میں پانچ، دس بلکہ شاید پچاس ہزار سال پہلے رہتے تھے۔ یہ معمہ اس حقیقت سے اور گہرا ہو جاتا ہے کہ موئن جودڑو کی کھدائی سے ملنے والے کتبے اور علامات کو آج تک پڑھا ہی نہیں جاسکا۔

اب اس سوال پر ذرا غور کرتے ہیں کہ وہ کون لوگ تھے؟ وہ کہاں سے آئے تھے؟ اور اگر ہم ان سوالات کے جواب حاصل کرلیں، قطع نظر اس کے کہ وہ محض قیاسی ہوں، تو اس سے ہمیں قیاس کرنے کیلئے ایک بنیاد مل جائے گی۔ مجھے اس بات کے کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ اس اعلیٰ سطح پر لسانیات بلکہ تمام فلسفیانہ نظام اور تمام

سائنسی علوم صرف قیاسات اور مفروضات کا مجموعہ رہ جاتے ہیں۔

اب ہم ماضی بعید کے اس دور میں جا رہے ہیں جو قبل از تاریخ کا زمانہ ہے مگر دور جدید کا خود فریبی میں مبتلا مؤرخ اپنے آپ کو کبھی اس نظریے سے وابستہ نہ کرے گا۔ مگر یہ امر ہمارے لئے باعث تشویش نہیں کیوں کہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ جیسے جیسے انسانی علم میں ترقی اور عقل ودانائی کے افق کو وسعت نصیب ہوئی، ہم نے کئی دیو قامت تاریخ دانوں کے مجسموں میں دراڑیں پڑتے اور انہیں خاک میں گر کر ریزہ ریزہ ہوتے دیکھا ہے۔ اگر چہ وہ خود اسے محض ''مؤرخانہ داستاں سرائی'' سے تعبیر کریں گے۔

ہمیں ''گاسپل'' (انجیل) سے یہ پتہ چلا ہے کہ حضرت یعقوبؑ کے بارہ لڑکے تھے جن کی وجہ سے بارہ قبیلے وجود میں آئے۔ لیکن ان میں صرف دو ہی قبیلے ''اسرائیل'' اور ''اسماعیل'' تاریخ کے اوراق میں محفوظ رہ سکے۔ بنی یعقوب کے (ہم اگر یہ اصطلاح استعمال کریں) باقی دس قبیلوں کا کیا ہوا؟ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ ستم رسیدہ قبائل اس علاقے میں داخل ہوئے جو آج ''ڈیورنڈ لائن'' کے دونوں جانب واقع ہے (افغانستان، ایران، بلوچستان اور عظیم تر سندھ) اور پھر وہ جزیرہ نمائے ہندوستان کے مغربی ساحلوں تک پھیل گئے۔ یہاں کے بسنے والوں کی ایک کثیر تعداد کی جسمانی خصوصیات ایسی ہیں جن کو انہوں نے مختلف اور بعض ناقابل فہم تاریخی اور جغرافیائی اسباب کی بناء پر قائم رکھا ہے اور جو بنی یعقوبؑ کے دوسرے دو معلوم ومعروف قبائل بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل کی خصوصیات سے بہت زیادہ مماثل ہیں اور اس مماثلت کو محض اتفاقی نہیں کہا جا سکتا۔

اگر ہم یہ راز معلوم کر سکیں اور یہ ''حتمی فیصلہ'' کر سکیں کہ حقیقتاً (قدیم اور قدیم سے مراد ہے ایسا وقت جو تعینات سے وراء ہو یا ایسے تعینات جو وقت کی حدود سے آزاد ہوں) اور عظیم تر سندھ کے باشندے ''بنی اسرائیل کی گم شدہ بھیڑوں'' میں سے تھے تو ہمیں اس بات کے سمجھنے میں دقت نہیں ہوگی کہ موئن جودڑو اور ہڑپہ کی ''نہ پڑھی جاسکنے والی زبان'' سامی الاصل ہے۔ جسے ''قدیم عربی'' کا نام بھی دیا جا سکتا ہے اور قدیم عربی ایسی ہی مبہم اصطلاح ہے جیسے قدیم سنسکرت۔ ہوسکتا ہے کہ بعض لوگ یہ سمجھیں کہ ہم اپنے موضوع سے انحراف کر رہے ہیں لیکن میں اس موضوع کی ایک حقیقت کو بیان کرنا چاہتا ہوں گا، جس کو تقریباً تمام مصنفین نے نظر انداز کیا ہے۔ ہندوؤں کے مشہور متھرا اور بنارس ہندو اساطیر کے مراکز رہے ہیں۔ تمام رنگین اور دل لبھانے والی کہانیاں ان ہی شہروں کے اطراف پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ان شہروں کی فضاء جن دل کش اور رنگین داستانوں سے معمور ہے، وہ ہندوؤں کے مقدس کردار سری کرشن اور رام چندر جی سے متعلق رومانی کہانیوں سے لبریز ہے، جو بعض حیران کن واقعات کے مرقعے محسوس ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں بیشتر مقتدر حضرات اس حقیقت کو مانتے ہیں کہ ان دو کرداروں کو آسانی کے ساتھ ایک تاریخ فریم ورک میں نہیں سمویا جاسکتا اور ہم اس کو اسی طرح قائم رکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان شہروں کو، جو موجودہ متھرا اور بنارس مانے جاتے ہیں، ہم بآسانی کسی بھی مستند تاریخی نقشہ میں تلاش نہیں کر سکیں۔

ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ متھرا اور بنارس کے اصل علاقے موجودہ پشاور شہر کے قریب تھے جو کہ پاکستان کے شمالی مغربی صوبے (سرحد) میں واقع ہے۔ یہاں آج بھی ایک قصبہ متھرا کے نام سے ہے، جو پشاور سے تقریباً سات

میل پر واقع ہے۔غریب مزدور ہر روز متھرا سے پشاور سفر کرتے ہیں، وہاں کام کرتے ہیں اور پھر اپنے گھر متھرا واپس آجاتے ہیں۔ایسی ہی حقیقت بنارس کی بھی ہے۔ایک اصلی قصبہ بنارس نام کا پشاور کے قریب ہے۔مگر ایک بات جو اور زیادہ دلچسپ ہے وہ یہ حقیقت ہے کہ بنارس خان یہاں کے علاقے کے لوگوں میں خاصا عام نام ہے۔ میں ذاتی طور پر کم از کم دو بنارس خان کو یہاں انگلستان میں بھی جانتا ہوں!۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت اور نقل مکانی کی پرانی داستان پھر دہرائی گئی ہے۔وہ قبائل جو شمال مغرب کے معروف راستوں سے ہوتے ہوئے آج سے لاکھوں سال پہلے موجودہ پاکستان میں داخل ہوئے، وہ یہیں بس رہے اور اس نئے اپنائے ہوئے ملک کو اپنا مکانی مسکن بنالیا۔اس کے بعد ہزاروں سال پر محیط عرصہ میں وہ مزید آگے بڑھتے گئے اور عظیم پنجاب اور سندھ کو عبور کرتے ہوئے وادی گنگا کی زرخیز سرزمین میں داخل ہوئے۔اور جیسا کہ آج بھی ہوتا ہے، تارکین وطن اپنے آبائی علاقوں کے ناموں کو اپناتے ہوئے نئی بستیاں بساتے ہیں اور انہیں اپنے اصلی شہروں کے نام دیتے ہیں اور اسی طرح آج کے متھرا، بنارس اور اجودھیا (ایودھیا) کے شہر بسے ہیں۔یہ لوگ شمالی مغربی علاقے سے موجودہ بھارت گئے اور یہ نام اپنے ساتھ لے گئے۔ہندوؤں کے اساطیری کرداروں کے متعلق کچھ بھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا۔ترک وطن کرکے آنے والے اپنی روایتی کہانیاں اپنے ساتھ لائے اور ان تمام کو زبانی آگے بیان کرتے رہے، اور پھر ان ہی اساطیری کرداروں کو مخصوص مقامی جغرفیائی ماحول میں سمویا گیا۔تارکین شمال مغرب کے پہاڑی راستوں اور سنگلاخ پہاڑوں سے آئے تھے اور ایسے علاقوں میں داخل ہوئے جو متھرا اور بنارس کے پاس گھرے سبز اور دریاؤں کے نیل گوں پانی والی زرخیز زمین تھی اور پھر انہوں نے ان تمام افراد کو مقامی جغرافیائی حالات میں ڈھالا۔اس طرح تمام ''پریم کہانیاں'' اور ''کنہیا اور گوپیوں'' کی شوخیوں کی روایات صرف ان کے رنگین تصورات کی من گھڑت دنیا ہے۔یہاں بلاخوف تردید پرزور طریقے سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ سری کرشن اور سری رام چندر کو آریہ قوم سے کوئی سروکار نہ تھا۔یہ کہنا بہت مشکل ہوگا کہ وہ کون سے گروہ سے تعلق رکھتے تھے؟ دراوڑ، منڈا یا ان سے بھی پہلی کوئی قوم؟ زمین کو پار کرتے ہوئے مختلف ادوار سے گزرتے ہوئے اس لمبے سفر نے ہجرت کرتے ہوئے قبائل اور مقامی باشندوں کی زبانوں کو متاثر کیے بغیر نہ چھوڑا ہوگا۔

مزید مطالعے اور تحقیق کے لئے ہم اس مفروضے کو دہراتے ہیں جسے ہم اپنی دانست میں ثابت کرچکے ہیں کہ اردو غیر آریائی زبان ہے اور سنسکرت سے اس کا مطلق کوئی تعلق نہیں ہے۔اس کی ابتدائی جڑیں موئن جوڑو، ہڑپہ بلکہ امڑی اور نال کی حفریات کی تہوں میں ڈھونڈنی چاہئیں۔اب ضرورت اس بات کی ہے کہ منڈا اور دراوڑی زبانوں اور ان کے اثرات کا امعانِ نظر سے مطالعہ کیا جائے۔

ہوسکتا ہے کہ کسی کو اس سارے بحث و مباحثہ میں محسوس ہوا ہو کہ پراکرتوں پر کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ماہرین علوم الہند اس نظریے کے حامل ہیں کہ سنسکرت نے پراکرت کو جنم دیا اور پھر پراکرت سے دیگر موجودہ ہندوستانی زبانیں وجود میں آئیں۔جیسا کہ ہم نے اپنی بحث میں اس بات کو ثابت کیا ہے کہ قواعد کا سنسکرتی فلسفہ اردو کے

قواعد کے فلسفے سے بکسر مختلف ہے۔اب جب کہ اردو اور ہندی نے اپنے بنیادی قواعد کی ساخت سنسکرت سے مستعار نہیں لی ہے تو پھر انہوں نے یہ چیز کہاں سے لی؟ یقیناً پراکرت سے اور اسی طرح دیگر موجودہ ہندوستانی زبانوں نے بھی اپنی اپنی پراکرتوں سے جہاں تک زبانوں کے بنیادی قواعد کا تعلق ہے، پراکرتیں اور اُپ بھرنسا کی اردو اور شورسینی بھی سنسکرت سے بالکل متاثر نہیں ہیں۔لہٰذا یہاں پر پراکرتوں کا تذکرہ، یہ اخذ کرتے ہوئے کہ انہوں نے قواعد سنسکرت سے مستعار لئے ہوں گے، بے معنی ہے۔

پراکرتوں کے بارے میں جیسا کہ ہم نے پہلے بتایا ہے کہ ان کی اعلیٰ ترین شکل سنسکرت سے بہت متاثر ہے اور ان کا ادبی سرمایہ سنسکرت کی دین ہے، لیکن اردو اور ہندی اس طرح کی پراکرتوں سے دور ہیں اور ان کا تعلق اپ بھرنسا سے ہے اور پھر اردو شورسینی اپ بھرنسا رفتہ رفتہ برج بھاشا کا نام اختیار کیا۔دیگر اپ بھرنساؤں مثلاً ''کلیکیاں (ہریانوی) اور پشاچی (سندھی، پنجابی، اور دیگر) نے بھی اردو پر اثر ڈالا اور یہی اثرات ہیں جنہیں تلاش کرنا ہمارا مقصد ہونا چاہئے۔

خالد محمود
شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ
نئی دہلی۔۹۵

مکالمۂ جبریل وابلیس

(ایک تجزیاتی مطالعہ)

سورۃ البقرہ کی چونتیسویں آیت میں باری تعالیٰ جل شانہ ارشاد فرماتا ہے۔

واذا قلنا للملئکۃ السجدو لآدم فسجدوا الا ابلیس.

(ترجمہ: اور جب ہم نے حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے)

علامہ اقبالؔ کی مکالماتی نظم ''جبریل وابلیس'' میں حضرت جبریلؑ نے اسی نافرمان اور باغی ابلیس کو ''ہمدم دیرینہ'' کہہ کر مخاطب کیا ہے اور اسی سے ''جہاں رنگ وبو'' کی کیفیت دریافت کی ہے۔

یہ ابلیس بھی عجیب شے ہے۔ اپنے زوال کے بعد بھی ''عالم آب وگل'' کو رنگینیوں سے ہم کنار کرنے اور ''مشتِ خاک'' میں ذوق نمی پیدا کرنے کا وسیلہ بن گیا۔ صوفیانہ ادب میں ابلیس کی بابت جو تصورات ملتے ہیں ان میں اس مغرور کو کہیں کہیں سب سے بڑا موحد بھی قرار دیا گیا ہے۔ ایک ایسی اخلاقی جرأت رکھنے والا موحد جس نے اللہ کے حکم کے باوجود غیر اللہ کو سجدہ کرنے سے انکار کردیا۔

ابلیس نے آدم کو سجدہ نہ کرنے پر منطقی استدلال بھی کیا ہے اس کی منطق یہ تھی کہ 'آدم خاکی ہے' میں ناری ہوں' نار، خاک سے افضل ہے اس لئے میں آدم سے افضل ہوں۔ افضل اور کمتر کے پروٹوکول کا ابلیس نے جو معیار قائم کیا تھا بدقسمتی سے وہی معیار آج تک جاری وساری ہے۔ اس کے برخلاف فضیلت کا جو معیار اللہ نے قائم کیا کہ تم میں جو سب سے زیادہ متقی ہے وہی سب سے زیادہ افضل ہے۔ اس کی جانب اللہ کے بندے کم ہی توجہ کرتے ہیں۔

دراصل ابلیس کی ماہیت اور حقیقت کا مسئلہ خیر وشر کا مسئلہ ہے۔ دنیا کی ہر شے اپنے مقابل سے پہچانی جاتی ہے۔ خیر وشر بھی باہمی تقابل ہی سے سمجھ میں آسکتے ہیں۔ اس کلیے کے مطابق ابلیس جو شر کا بانی ہے، خیر کی پہچان کا سب سے بڑا ذریعہ بن جاتا ہے۔ علامہ اقبالؔ نے ابلیس کی اس حقیقت کو مختلف مقامات پر الگ الگ انداز میں بیان کیا ہے۔ مگر بات کی تان بہر حال خودی وخود دارائی پر ہی ٹوٹتی ہے۔ تسخیر فطرت میں ابلیس سجدہ آدم سے انکار کی وجہ نہایت جوش وخروش سے بیان کرتا ہے۔ اپنے آپ کو حرکت کا سرچشمہ بتاتا ہے اور خدا سے کہتا ہے کہ زندگی کی تمام ہمہ ہمی اور گہما گہمی میری وجہ سے ہے میں نہ ہوتا تو یہ کائنات بالکل سنسان، ویران اور بے جان ہوتی۔

''جاوید نامہ'' میں ابلیس سے متعلق دو نظمیں ہیں۔ ایک کا عنوان ہے'' نمودار شدن خواجہ اہل فراق ابلیس'' اور دوسری نظم کا عنوان ''نالۂ ابلیس'' ہے ان دونوں نظموں میں ابلیس کی تحقیر کی جگہ کہیں کہیں اس کی ستائش کا پہلو

حاوی نظر آتا ہے۔ ابلیس کے لئے ''خواجہ اہل فراق'' کا لقب بھی نہایت معنی خیز ہے۔ دراصل اقبال انسان کی خودی کو اس بلندی پر دیکھنا چاہتے تھے جہاں خدا بندے سے کچھ کہنے اور کوئی حکم دینے کی بجائے بندے کی رضا معلوم کرے۔ ع

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال جہاں جہاں ابلیس کا ذکر کرتے ہیں اپنا سارا زور اسی کے پلڑے ڈال دیتے ہیں۔ ''مکالمہ جبریل وابلیس'' اسی خیال کی ایک رد ہے۔

''مکالمہ جبریل وابلیس'' میں کئی باتیں غور طلب ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مکالمہ دو پرانے دوستوں کے درمیان ہے۔ دوسری بات گفتگو کا آغاز حضرت جبریل کی طرف سے ہوتا ہے۔ تیسری بات حضرت جبریل دنیا کے تعلق سے اولاً ایک سادہ سا معلومات طلب سوال کرتے ہیں۔ چوتھی بات حضرت جبریل اس جہاں کو'' جہانِ رنگ وبو'' سمجھتے ہیں اور پانچویں اہم بات یہ کہ جبریل کے لہجے میں اپنائیت ہے جو نظم کے آغاز کو معنی خیز بناتی ہے۔ نظم شروع ہوتی ہے۔ جبریل کی آواز:۔

''ہمدم دیرینہ کیسا ہے جہان رنگ وبو؟''

نظم کے پہلے مصرعے کا پہلا ہی مرکب لفظ'' ہمدم دیرینہ'' جبریل وابلیس کی قدیم وطویل رفاقت کے اظہار کا بہترین وسیلہ بن کر سامنے آتا ہے۔ مصرعے کے آغاز میں اس لفظ کی ادائیگی سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جبریل کو ابلیس کی جدائی کا قلق ہے۔ وہ اپنے پرانے دنوں کو یاد کرتے ہوئے ابلیس کو بھی دیرینہ ہمدمی کے ماہ وسال یاد دلانا چاہتے ہیں۔ اس لفظ کے معانی میں ماضی کی طویل داستان پوشیدہ ہے مثلاً:۔

قیاس کہتا ہے کہ ابلیس جو ناری ہے انکار سے پہلے بھی بہت شرارتیں کرتا ہوگا۔ فرشتوں کو بہکانے اور درغلانے کی کوششیں بھی اس نے ضرور کی ہوں گی مگر چونکہ فرشتوں میں بہکنے کی صلاحیت ہی نہیں اس لئے اس کی مایوسی اور جھنجھلاہٹ دیکھنے کے لائق ہوتی ہوگی۔ اس کے دم سے ہلچل ضرور رہتی ہوگی کہ وہ ناری ہے اور ناری صفات تو اس میں ازل ہی سے اپنا کام کرتی رہی ہوں گی۔ ماقبل انکار بھی یہ بڑا شرّی اور فسادی ہوگا۔

پرانی باتوں کی یاد کرکے جب حضرت جبریل اسے'' ہمدم دیرینہ'' کہہ کر پکارتے ہیں تو ان کے لفظوں اور لہجے سے درد، ہمدردی اور پیار چھلک پڑتا ہے۔

''ہمدم دیرینہ'' سے تخاطب کا آغاز ہوا تو قرینہ کہتا ہے کہ حضرت جبریلؑ اپنے پرانے رفیق ابلیس سے اس کی خیریت دریافت کریں گے اور اس کا حال چال پوچھیں گے مگر جبریل نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ کیوں؟ شاید اس لئے کہ جبریل کو ابلیس کے بارے میں خوب معلوم تھا کہ وہ نافرمان، ملعون ومردود ہے۔ اگر اس کا حال چال پوچھتے تو ابلیس سمجھتا کہ جبریل اس پر طنز کر رہے ہیں۔ کسی معلوم چیز کے بارے میں معلوم کرنا بعض اوقات طنز کے مترادف ہوتا ہے اور نئے شکوک وشبہات پیدا کر دیتا ہے۔ اس طرح پہلے ہی مرحلے میں بات چیت ٹوٹ جاتی یا دوسرا رخ اختیار کر لیتی، جب کہ حضرت جبریل کا مقصد صریحاً مختلف تھا۔ وہ اپنے'' ہمدم دیرینہ'' کو معافی مانگنے پر

راضی کرنا چاہتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ ضدی ناری پھر بھی راضی نہ ہوا اور حضرت جبریل کی کوشش رائیگاں چلی گئی حالانکہ حضرت جبریلؑ کی کوشش کا انداز ایسا فطری ہے کہ اس میں صحیح الجہتی کا ہر تصور سمٹ کر آ گیا ہے۔

نظم کے اولیں مصرعے ''ہمدم دیرینہ کیسا ہے جہان رنگ و بو'' میں دو باتیں مزید دعوت فکر دیتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ حضرت جبریلؑ دنیا کے بارے میں اپنا ایک زاویہ نگاہ رکھتے ہیں اور اپنے سوال کے ساتھ ہی اس کا اظہار بھی کر دیتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نظر میں ہماری یہ دنیا ایک ''جہان رنگ و بو'' ہے۔

دراصل حضرت جبریلؑ نے اس دنیا کو دور سے دیکھا ہے اسے برتا نہیں ہے۔ بادی النظر میں یہ دنیا واقعی ''جہان رنگ و بو'' ہے۔ یہاں وہ کہاوت صادق آتی ہے کہ ''دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں'' ابلیس کا جواب اس کہاوت پر مہر تصدیق ثبت کر دیتا ہے۔

ابلیس کے جواب اور جواب کی تشریح و توضیح سے قبل یہ سمجھنا ضروری ہے کہ جب حضرت جبریلؑ نے دنیا کے تعلق سے اپنی ایک رائے قائم کر لی اور ''جہان رنگ و بو'' کہہ کر اس کا اظہار بھی کر دیا تو اب دنیا کے بارے میں ان کے سوال کی کیا اہمیت باقی رہ جاتی ہے، بظاہر یہ بات کچھ غیر منطقی سی معلوم ہوتی ہے کہ اب بھی سوال کیا جائے مگر جب ہم اس مصرعے کے لب و لہجے پر مزید غور کرتے ہیں تو یہ منکشف ہوتا ہے کہ ''ہمدم دیرینہ'' تمہارا یہ جہان جو ہمیں (دور سے) ''جہان رنگ و بو'' نظر آتا ہے' تم بتاؤ کیسا ہے؟ یعنی اس کی حقیقت کیا ہے۔ کیا یہ ویسا ہی ہے جیسا ہمیں نظر آتا ہے یا اس سے مختلف ہے؟ یہ ساری باتیں جبریلؑ کے استفسار میں بین السطوری ہیں جو غور کرنے پر ایک کے بعد ایک سامنے آتی رہتی ہیں۔ ابلیس بھی ان سب باتوں کو سمجھ گیا ہے اس لئے ایک ہی مصرعے میں دنیا کا مکمل تعارف کرا دیتا ہے۔ ع:

''سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو''

نظم اقبالؔ کا یہ عظیم مصرع جو ابلیس کی زبان سے ادا ہوا ہے دنیا کی تعریف و تعارف میں ایسا جامع، بلیغ اور معنویت سے لبریز ہے کہ عالم آب و گل کی ہر شے اس میں سمٹ کر آ گئی ہے اردو زبان کے پیرایۂ اظہار میں ہماری دنیا کی اس سے بہتر اور جامع تعریف ممکن نہیں۔ بظاہر یہ مصرع صرف چھ الفاظ یعنی ''سوز، ساز، درد، داغ، جستجو، آرزو کا مجموعہ ہے لیکن سارے عقلی اور نقلی انسانی علوم اور جذبہ و احساس کے تمام تر سرچشمے انہیں چھ الفاظ کی تشریح و توضیح اور تعبیر و تفسیر معلوم ہوتے ہیں۔ اب ایک لفظ سوز ہی کو لیجئے۔ عشق اور متعلقات عشق، شریعت، طریقت، تصوف اور روحانیت کے تمام مسائل و مراحل اس ایک لفظ میں طے ہو جاتے ہیں، سوز میں ساز شامل کر لیجئے تو رنگ و آہنگ، کیف و مستی اور رقص و سرود و سرور و شوق کے علاوہ حسن فطرت بھی سمٹ آتا ہے۔ درد، سوز کی آواز بھی ہے، راز بھی اور انکشاف راز بھی۔ یہ عشق کا لازمی نتیجہ ہے۔ عشق جو تمام کائنات میں جاری و ساری ہے اور اس کائنات کے لیے کشش ثقل کی حیثیت رکھتا ہے کہ اسی کے دم سے نظام عالم قائم ہے۔ کچھ یہی صورت درد کی ہے۔ درد ایک، وہ بھی ہے جو کبھی دوا سے ٹھیک ہوتا ہے اور کبھی خود دوا بن جاتا ہے جیسا کہ غالب نے کہا تھا

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا

درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا

اس کے بعد داغ کی شکل اور کیفیت ملاحظہ کیجئے۔ داغ جو کبھی درد کا حاصل ہوتا ہے اور کبھی بے دردی کا، داغ کی ایک عبرت ناک صورت وہ تھی جو حکم الٰہی سے انکار کی وجہ سے ابلیس کے حصے میں آئی اور ابلیس مرض متعدی کی طرح اس داغ کو خدا کی مخلوق میں تقسیم کر رہا ہے۔ پانچویں لفظ ''جستجو'' ہے، اس میں ارضی، سماوی، خلائی، بحری، بری الغرض عالم امکان کے اسرار و رموز کی تمام تر تحقیقات وانکشافات کا بنیادی جذبہ موجود ہے۔ آخری لفظ آرزو تمام الفاظ کا جزو اعظم ہے۔ آرزو نہ ہو تو یہ عالم لاہوت عالم ملکوت بن کر رہ جائے۔

حضرت جبریل کا دوسرا سوال ہے ؎

ہر گھڑی افلاک پر رہتی ہے تیری گفتگو
کیا نہیں ممکن کہ تیرا چاک دامن ہو رفو

اس سوال میں جبریل علیہ السلام اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ اس سوال سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ پہلا سوال دراصل ایک قسم کی تمہید تھا جس کے ذریعے جبریلؑ نے اصل سوال کے لیے فضا سازی کی تھی اور یہ بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ تمام ملائکہ ابلیس کے انکار اور انکار کی پاداش میں راندۂ دربار کئے جانے سے ملول ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس کا ''چاک دامن رفو'' ہو جائے اور اسے وہی مقام تقرب حـ ں حاصل ہو جائے جو پہلے حاصل تھا مگر ایسا اسی وقت ہو سکتا ہے جب ابلیس اپنی گستاخ پر شرمندہ ہو کر بارگاہ رب العزت میں توبہ واستغفار کرے۔

لاتقنطوا من رحمة الله ط ان الله يغفر الذنوب جميعاً ط

(ترجمہ: اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ بیشک اللہ گناہ بخش دیتا ہے)۔

حضرت جبریلؑ کی ہمدردانہ گفتگو سن کر ابلیس کے منھ سے ایک آہ نکلتی ہے'' آہ اے جبریل'' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس کف افسوس مل رہا ہے اور اپنی حالت زار پر کرب میں مبتلا ہے اور یہ کہ اپنے ہمدم دیرینہ جبریل کی ہمدردانہ باتیں سن کر اس کا دل بھر آیا ہے اور یہ آہ اس کے احساس نافرمانی کا بے ساختہ اظہار ہے۔

''آہ اے جبریل! تو واقف نہیں اس راز سے''

یہاں تک بھی یہی خیال قائم رہتا ہے کہ جبریل کو مخاطب کر کے ابلیس اپنے درد تنہائی کا اظہار کرنا چاہتا ہے مگر جب آگے بڑھتے ہیں۔ ؎

''کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سبو''

تو سارا منظر نامہ تبدیل ہو جاتا ہے اور معلوم ہوتا کہ ابلیس کی آہ، آہ ندامت نہیں بلکہ وہ تو اپنے ہمدرد جبریلؑ کی معصومیت اور کم علمی پر اظہار افسوس کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ تو میرا ہمدرد ضرور ہے مگر نادان ہے، تجھے نہیں معلوم کہ میں اپنے ''سبو'' کے ٹوٹنے سے کیسا سرمست ہو گیا ہوں۔ بظاہر یہ بات عام روش کے خلاف ہے۔ عام حالات

میں جب سبو ٹوٹتا ہے اور شراب گر جاتی ہے تو رندوں کی مستی اتر جاتی ہے اور سارا نشہ ہرن ہو جاتا ہے مگر اس مصرعے میں اقبالؔ نے رمز و کنایہ اور مجاز و استعارے کا ایسا جادو جگایا ہے کہ مصرع میں غضب کی دلکشی اور معنویت پیدا ہوگئی ہے۔ ابلیس کہنا چاہتا ہے کہ انکار و نافرمانی کی وجہ سے قرب الٰہی کی عظمت کا سبو ٹوٹ کر بیشک مجھے مردود و ملعون کر گیا ہے مگر اس کی بدولت مجھے خود اپنی عظمت کا ایسا شدید احساس و ادراک ہو گیا کہ جس کا نشہ قیامت تک زائل نہیں ہو سکتا اس لیے۔

اب یہاں میری گزر ممکن نہیں ممکن نہیں
کس قدر خاموش ہے یہ عالم بے کاخ و کو

اے جبریل جس جگہ تو مجھے واپس لے جانا چاہتا ہے وہاں اب میرا گزر نہیں ہو سکتا مصرع اول میں ''ممکن نہیں'' کی تکرار کے ذریعے اقبالؔ نے ابلیس کی انکار میں زور پیدا کر دیا ہے یہ اور اس طرح معنوی حسن کے ساتھ شعر میں حسن بیان بھی در آیا ہے۔ دوسرے مصرع میں ابلیس اپنے مقام ابلیسیت پر متمکن نظر آتا ہے۔ یہاں وہ اس عالم کا مذاق اڑا رہا ہے جہاں جہاں وہ ماقبل انکار حضرت جبریل اور دوسرے ملائکہ کے ساتھ رہا کرتا تھا۔

''کس قدر خاموش ہے یہ عالم بے کاخ و کو''

اُس عالم خاموش میں نہ محل ہیں نہ ایوان نہ کوچے نہ بازار نہ در نہ بام کچھ بھی نہیں ہر طرف خاموشی، سناٹا اور سکوت کا عالم ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی عالم ہے!؟ یہ صحیح ہے کہ میں پہلے اسی عالم میں رہتا تھا مگر اب تو ہنگامہ ہائے نو بہ نو کا ایسا عادی ہو گیا ہوں کہ میرے لیے اس کو چھوڑنا ممکن نہیں۔

اب رہا امید و نومیدی کا سوال تو اے جبریل میری بات غور سے سن۔

جس کی نومیدی سے ہو سوزِ درونِ کائنات
اس کے حق میں تقنطوا اچھا ہے یا لا تقنطوا؟

میری ''نومیدی'' تو امید سے کہیں بہتر ہے۔ مجھے نومید ہی رہنے دے مجھے معلوم ہے۔

قل یا یھا الذین اسرفوا علی انفسھم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ۔

ان اللہ یغفر الذنوب جمیعاً۔

(ترجمہ) آپ کہہ دیجئے کہ اے وہ لوگو! جنھوں نے گناہ کیے ہیں اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہوں بیشک اللہ سب گناہ بخش دے گا)۔

لیکن اے جبریل تجھے معلوم نہیں کہ اس کائنات کے لیے میری ناامیدی کی اہمیت کیا ہے۔ میری ناامیدی ہی تو ہے جس کی وجہ سے اس عالم آب و گل میں سوز و ساز ہے اس لیے خدا کی اس کائنات کے حق میں میرا ناامید رہنا بہتر ہی نہیں ضروری بھی ہے۔ اقبالؔ نے ابلیس کی زبان سے مشیت ایزدی کی ایک صداقت کی جانب اشارہ کیا ہے کائنات کے بہت سے رازوں کی طرح خدا اور ابلیس کا راز بھی پردہ خفا میں ہے۔ خدا نہ چاہتا تو ابلیس کی کیا

مجال تھی کہ وہ انکار سجدہ کے جرم کا ارتکاب کرتا اور خدا نہ چاہے تو ابلیس کی کیا طاقت کہ کسی کو گمراہ کر سکے پس اللہ کے بھید اللہ ہی جانتا ہے۔

حضرت جبریلؑ کا آخری سوال طنز و تنبیہ کے انداز میں تھا۔ جب حضرت جبریلؑ نے دیکھا کہ ابلیس کسی بھی بات کو ماننے پر آمادہ نہیں ہوتا تو انھوں نے ''مقاماتِ بلند'' کے حوالے سے اسے غیرت دلانے کی کوشش کی اور ملائکہ کی عزت و آبرو کا سوال اٹھایا۔

کھو دیئے انکار سے تو نے مقامات بلند
چشم یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو

تیری نافرمانی سے صرف یہی نہیں ہوا کہ تو مقامات تقریب خاص سے محروم ہو گیا بلکہ تیرے اس باغیانہ عمل کی وجہ سے ''چشم یزداں'' میں تمام فرشتوں کا وقار مجروح ہو گیا۔ تیرا غرور ایک فرشتے کی حیثیت سے ہمیں بھی بے آبرو کر گیا۔ تیرا انکار نہ تیرے حق میں بہتر ثابت ہوا اور نہ ہمارے حق میں۔ تو نے نہایت فاش غلطی کی ہے۔

اس طنز آمیز سرزنش کا جواب ابلیس قدرے تفصیل سے دیتا ہے یہاں اس کی رگِ ابلیسیت بھی پھڑک اٹھتی ہے۔ کبر و نخوت اور برتری کا احساس بھی بیدا ہو جاتا ہے۔ اب وہ حضرت جبریلؑ کو بھی اپنے مقابلے میں کمتر سمجھنے لگتا ہے۔ اپنی تعریف و توصیف اور طاقت و قدرت کا نہایت زور و شور سے اعلان کرتا ہے جبریل پر طنز کے تیر برساتا ہے اور پرغرور لہجے میں بہ ہزار تمکنت کہتا ہے ۔

ہے مری جرأت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو
میرے فتنے جامۂ عقل وخرد کا تار و پو
دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزم خیر وشر
کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے؟ میں کہ تو؟
خضر بھی بے دست و پا، الیاس بھی بے دست و پا
میرے طوفاں یم بہ یم' دریا بہ دریا' جو بہ جو
گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو؟
میں کھٹکتا ہوں دل یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط، اللہ ہُو اللہ ہُو اللہ ہو

اے جبریل نادان' تو مجھے میرے گذشتہ مقامات بلند یاد دلاتا ہے اور فرشتوں کی عزت و آبرو کی دہائی دیتا ہے۔ ذرا میرے موجودہ مقامات کو دیکھ اور میرے مقابلے میں اپنے حالِ زار پر غور کر۔ میرا مقام اور میرا معاملہ یہ ہے کہ اگر مجھ میں جرأت انکار نہ ہوتی اور میں بروقت اس کا مظاہرہ نہ کرتا تو یہ جہان آرزو جو تجھے ''عالم رنگ و بو'' نظر آتا ہے تیرے ہی عالم کی طرح ''بے ذوق نمو' اور عالم بے کاخ وکو' بن کر رہ جاتا۔ میں اگر اپنی عزت و وقعت

اور مقامات بلند کی قربانی نہ دیتا تو یہاں پھر کسی میں ایسی جرأت ہرگز پیدا نہ ہوتی کہ اپنی شخصیت' اپنی ہستی اور اپنے وجود کو ثابت کرنے' منوانے اور اپنی شناخت قائم کرنے کی کوشش کر سکے۔ کائنات میں یہ جرأت میری اور صرف میری بدولت ہے۔ ساری رونق اور ساری حرارت میرے دم سے ہے اور میرے ہی ایثار کا ثمرہ ہے۔ دنیا میں عقل وخرد کا تانا بانا بھی میرے ہی فتنوں کا رہین منت ہے۔ یہاں ذوق نمو ہے جب کہ جنت میں ملائکہ کی تمام اطاعت شعاری غیر مشروط ہے۔ جنت کی '' بے پکار'' زندگی میں عقل کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی جب کہ یہاں عقل کی بڑی گنجائش ہے اور اس کے استعمال کی بڑی آزادی ہے میرے فتنوں نے عقل کو مزید متحرک اور چالاک بنا دیا ہے ۔

دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزم خیر وشر
کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے میں کہ تو؟

ابلیس کہتا ہے۔ اے جبریل تیرا اور میرا کیا مقابلہ تیری حیثیت تو ان تن آسان تماشائیوں کی سی ہے جو کسی محفوظ کنارے پر کھڑے ہوکر خیر وشر کی جنگ کا نظارہ کرتے ہیں۔ بھلا '' سبکساران ساحل'' کو کیا معلوم کہ طوفان کے طمانچوں میں کیا تکلیف اور کیسی لذت پوشیدہ ہے

کجا دانند حال ماسبک ساران ساحل ہا''

جبریل اپنی کمالات وجسارت کی تعریف وتوصیف کے ذکر کو اسی طمطراق سے جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے ۔

خضر بھی بے دست وپا الیاس بھی بے دست وپا
میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جو بہ جو

اے جبریل تیرا کیا ذکر تیرا اور میرا تو کوئی مقابلہ ہی نہیں ہوسکتا۔ میری طوفان خیزیوں کے آگے تو خضر والیاس جیسے جہاں گشت وجہاں دیدہ پیغمبر بھی بے دست وپا ہیں۔ میری طوفانی قوتوں کی حشر سامانیاں جوئبار سے بحر ناپیدا کنار تک پھیلی ہوئی ہیں (اس شعر کا مصرع ثانی اس قدر رواں اور مترنم ہے کہ قاری ہو یا سامع دونوں مست ہو جاتے ہیں)

میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جو بہ جو

اپنی مدح وستائش کے بعد ابلیس حضرت جبریل کو اپنی دانست میں گویا ایک مخلصانہ مشورہ دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے اے جبریل اگر تجھے کبھی تنہائی میں خدا سے ملاقات کا شرف حاصل ہو تو ایک بات ضرور پوچھنا۔ خدا سے پوچھنا کہ یہ آدم کا قصہ کیا ہے؟ اور اس قصے کو اس قدر رنگین کس نے اور کیونکر کیا ہے؟ یہ ایک ایسا شرارت آمیز مشورہ ہے جس میں بے شمار سوال پوشیدہ ہیں۔ پہلی اور دلچسپ بات تو یہ ہے کہ ابلیس نے خدا سے تخلیے میں جبریل کی ملاقات کو '' فرصت'' اور '' اگر'' کے ساتھ مشروط کر دیا ہے۔ دراصل ابلیس بڑا شاطر ہے ابلیس جو ٹھہرا! وہ خوب سمجھتا ہے کہ خدا کی غیر مشروط اور فرصت نہ دینے والی مسلسل اطاعت کی وجہ سے ملائکہ کو اتنا وقت ہی کہاں مل سکتا ہے کہ وہ خدا سے بات کریں اور بالفرض محال اگر وقت مل بھی جائے تو انھیں اتنا قریب خاص کیونکر حاصل ہوگا۔ خود جبریل بھی ایک خاص مقام تک ہی پہنچتے ہیں اور اس کے بعد کہہ اٹھتے ہیں ۔

اگر یک سر موئے برتر پرم
فروغ تجلی بسوزد پرم

پھر کسی طرح قریب پہنچ بھی جائیں تو خدا کے سامنے منھ کھولنے کی جرأت کہاں سے لائیں گے اور جرأت بھی اس سوال کے لیے کہ ''قصہ آدم کو رنگین کر گیا کس کا لہو؟'' فرشتوں کی یہی وہ لاچاری اور بے چارگی ہے جس کی ابلیس تحقیر کر رہا ہے۔ ابلیس کے مطابق اس کے سوال کا جواب صرف ایک ہے اور وہ یہ ہے آدم کے قصے کو اسی کے انکار نے رنگین بنایا ہے۔ یہی مشیت خداوندی ہے اور خدا کی اس مشیت سے خدا کے سوا دوسرا کوئی واقف نہیں اگرچہ ابلیس بھی اپنے لب ولہجے میں اس واقفیت کا دعویدار بنا ہوا ہے۔

آخری شعر میں ابلیس احتیاط واستدلال کے سارے بندھن توڑ دیتا ہے اور بغیر کسی پاس ولحاظ کے نہایت متکبرانہ لہجے میں حضرت جبریل سے مخاطب ہوتا ہے۔

میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو

اے جبریل! میں نے خدا کے حکم سے انکار کیا تو میرا انکار خدا کو ایسا گراں گذرا کہ مجھے راندۂ درگاہ کر دیا اس کے باوجود خدا کے دل پر میرے انکار کا اثر باقی رہا۔ آج بھی میرا انکار برابر کھٹکتا ہے۔

میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح

مگر اے جبریل تیری حیثیت تو کچھ بھی نہیں، تو صرف اطاعت شعاری کر سکتا ہے، تو مجبور محض ہے، تو میرے اور خدا کے معاملات کو نہیں سمجھ سکتا اس لیے اپنے کام سے کام رکھ اور اللہ اللہ کر جیسا کہ ترا معمول ہے۔ اے جبریل! مجھے کاروبار حیات میں روح پھونکنے دے، ذوق نمو پیدا کرنے دے کیونکہ میں ہی اس ''تگاپوئے دمادم'' کا بانی اور کارزار خیر وشر کی رست خیزی کا ضامن ہوں اور اس کارگہ حیات میں یہی ''تگاپوئے دمادم'' زندگی کی دلیل ہے۔ مگر تو اس حقیقت کو سمجھ ہی نہیں سکتا کیونکہ ع

''تو فقط اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو

اُمِ ہانی اشرف
پروفیسر، عبداللہ ویمنس کالج
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

''آگ کا دریا'' ایک تجزیہ

برصغیر کی تقسیم کے پس منظر میں لکھا جانے والا قرۃ العین حیدر کا ناول ''آگ کا دریا'' ان کے بسیط افکار اور لامتناہی جہان معلوم سے ثروت مند اور تونگر ہے۔ اردو میں اتنا عظیم الشان ناول آج تک نہیں لکھا گیا اور یہ سعادت قرۃ العین حیدر کے حصے میں آئی۔ جب کہ ان کے معاصرین میں اہم نام تھے۔ انھوں نے بھی تقسیم ہند کے موضوع پر خوب لکھا، کھل کر لکھا۔ شوکت صدیقی کا ناول ''خدا کی بستی'' اہم ناول ہے مگر ''آگ کا دریا'' جیسا نہیں۔ آئن اسٹائن کا قول ہے کہ جب لوگ ایک ملک سے دوسرے ملک میں ہجرت کر جاتے ہیں تم یہ نہ سمجھو کہ وہ بہت مختصر سا سامان یا چھوٹی سی گٹھری لے جاتے ہیں بلکہ اپنے ساتھ اپنا عظیم الشان دماغ لے جاتے ہیں اور جس ملک میں بودوباش اختیار کرتے ہیں اس ملک کو ان کے دماغ سے فائدہ پہنچتا ہے۔

برصغیر میں ہجرت کا المیہ تو اہم ہے ہی ساری دنیا میں یہ عذاب پہلے بھی مسلط ہوتا رہا ہے اور آج بھی ہے اور شاید ہمیشہ رہے گا کیوں کہ اس زمین پر انسان جلاوطن ہے اسے کہیں قیام نہیں قرۃ العین حیدر کا یہ ناول انسانی زندگی کے اسی المیہ کو آشکار کرتا ہے اور ہمیں بتاتا ہے کہ ہجرت کیا ہے۔ ذہنی، روحانی، جسمانی ہجرتوں کی کیا صورت ہے ناول کیا ہے ایک سمندر ہے۔ جس کے ساحل پر بھی اور تہوں میں بھی لاکھوں گوہر آبدار دمک رہے ہیں اس سمندر کی موجوں میں موتی بہتے ہوئے نظر آتے ہیں ایک عظیم الشان سفرنامہ ہے۔ جس میں نگاہ گم ہو جاتی ہے ذہن کھو جاتا ہے خود اپنے وجود کا پتہ نہیں چلتا۔ قرۃ العین حیدر نے یہ ناول پاکستان میں لکھا تھا۔ جس پر تنازعات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں وہ واپس ہندوستان آگئی تھیں پھر ساری عمر ہندوستان میں رہیں اور ۲۱/اگست ۲۰۰۸ء کو اس جہان فانی سے رحلت کی۔ نند کشور وکرم نے اپنے مضمون قرۃ العین حیدر اور ''آگ کا دریا'' میں لکھا ہے:

''اردو میں عبداللہ حسین کے ناول ''اداس نسلیں'' شوکت صدیقی کا ''خدا کی بستی'' خدیجہ مستور کا ''آنگن'' اور جمیلہ ہاشمی کا ''تلاش بہاراں'' ان ناولوں کا بھی یہی موضوع تھا لیکن جو شہرت اور مقبولیت قرۃ العین حیدر کے ناول ''آگ کا دریا'' کو ملی وہ اردو زبان کی کسی ادبی تخلیق کو نصیب نہیں ہوئی۔ اس ناول کے بارے میں جھوٹی سچی افواہیں بھی پھیلیں اس پر پاکستان میں سنسر کیے جانے اور پابندی لگنے کی افواہ شاید اس لیے پھیلی تھی کہ مصنفہ نے کئی جملے اور پیراگراف پروف ریڈنگ کے دوران نکال کر ناول اسی طرح پریس میں چھپنے کے لیے بھیج دیا تھا۔ جس سے سنسر کیے جانے کا شک پیدا ہو گیا تھا ان افواہوں کا ذکر کرتے ہوئے قرۃ العین حیدر نے لکھا کہ

اس ناول سے متعلق افسانہ طرازی اور افواہوں کا سلسلہ اس قدر مستحکم ہو چکا ہے کہ اس کی تردید اب میرے بس کی بات نہیں رہی حال میں ہی قدرت اللہ شہاب مرحوم کا شہاب نامہ شائع ہوا جس نے بے پناہ مقبولیت حاصل کی اس کتاب میں ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ مارشل لا لگتے ہی ایک روز صبح سویرے قرۃ العین حیدر میرے یہاں آئیں بال بکھرے ہوئے چہرہ اداس آنکھیں پریشان آتے ہی بولیں اب کیا ہوگا تو گویا اب بھونکنے پر بھی پابندی عائد ہے عینی نے بڑے قرب سے پوچھا آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے جنھیں چھپانے کے لیے اس نے مسکرانے کی کوشش کی ایک ٹھنڈی سانس بھر کر لاپروائی سے کہا ارے بھائی روز بھونکنا کون چاہتا ہے لیکن بھونکنے کی آزادی بھی تو ایک نعمت ہے قدرت اللہ شہاب کا خیال ہے کہ اس چیز نے ان کے قلم کا رخ ''آگ کا دریا'' کی طرف موڑ دیا ہوگا۔''

قدرت اللہ شہاب کی اس تحریر پر قرۃ العین حیدر نے ناراضگی کا اظہار کیا تھا اسے محض افسانہ بتایا تھا انھوں نے کہا تھا کہ میں اس انداز سے کبھی بات چیت نہیں کرتی نہ کبھی اتنی پریشان ہوتی ہوں کہ آنکھوں میں آنسو آجائیں علاوہ ازیں میں نے ''آگ کا دریا'' ۱۹۵۶ء سے ۱۹۵۷ء کے درمیان لکھ دیا تھا جب کہ مارشل لا ۱۹۵۸ء میں نافذ ہوا تھا ناول کا مسودہ لاہور میں تھا جو ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا۔ پہلے ایڈیشن میں باقاعدہ تاریخ اشاعت پڑی ہے اس لیے سینسر شپ سے اس کا کچھ تعلق نہیں ہے قدرت اللہ شہاب کی تحریر محض افسانہ ہے حقیقت سے کوسوں دور۔

لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ یہ ناول متنازعہ نہیں تھا اس کی مخالفت میں خوب مضامین لکھے گئے حتیٰ کہ ایک ناول بھی لکھ دیا گیا مگر اس کے باوجود بابائے اردو مولوی عبدالحق چاہتے تھے کہ اس ناول پر پاکستان کا سب سے بڑا ادبی ایوارڈ 'آدم جی' دیا جانا چاہیے مگر یہ کہا جاتا ہے کہ خود ہی قرۃ العین حیدر نے ایسا نہیں ہونے دیا اور انعام شوکت صدیقی کی ''خدا کی بستی'' کو مل گیا۔

''آگ کا دریا'' ایک حیرت ناک ناول ہے جو ڈھائی ہزار سال طویل عرصے پر محیط ہے پورے ناول میں برصغیر کی سیاسی، سماجی، تہذیبی زندگی کو خوب صورت اور خیال انگیز طریقے سے پیش کیا گیا ہے شروع میں ہی ہماری ملاقات گوتم نیلمبر سے ہوتی ہے ماضی کا ہندوستان اس کے مذہبی نظریات گوتم ایک مفکر ہے ذہین ہے انسان دوست ہے اس کا دوست ہری شنکر بھی اس کی طرح سے حقیقت پسند ہے تیسرا کردار چمپا کا ہے جو گوتم کی طرح ہر زمانے میں موجود ہے یہ ایک علامتی کردار ہے پہلے چمپک دوسرے میں چمپا تیسرے میں چمپا بائی اور آخر میں چمپا احمد کے روپ میں سامنے آتا ہے۔ یہ ناول کا اہم کردار ہے جو مصائب میں ٹوٹتا بکھرتا نہیں ہے بلکہ ہر لمحہ زندہ و سالم رہنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ اس میں کم ہمت کمال رضا بھی ہے جو قوم پرست ہے ہر حالت میں پاکستان میں پناہ تلاش کرتا ہے چمپا ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کرتی ہے پاکستان نہیں جاتی۔ لندن کی تعلیم یافتہ ہے، تب وہ کمال رضا سے کہتی ہے:

''میں بالآخر بنارس واپس جا رہی ہوں تم کو یاد رہے کہ میں نے ٹیمس کے کنارے تم سے بوٹ ہاؤس میں کہا تھا کہ میں واپس جانا چاہتی ہوں کوئی ساتھ جانے والا نہیں اب میں نے دیکھا کہ کسی دوسرے کا

سہارا ڈھونڈنا کس قدر حماقت تھی میں خود ہی بنارس لوٹتی ہوں جانتے ہو میرے آبائی شہر کا نام کیا ہے شیو پوری ہاں مسرتوں کا شہر اس ملک کو دکھ کا گڑھ یا مسرتوں کا گھر بنانا میرے اپنے ہاتھ میں ہے مجھے دوسروں سے کیا مطلب اس نے اپنے ہاتھ کھول کر انھیں غور سے دیکھا رقاصہ کے ہاتھ آرٹسٹ یا لیکھک کے ہاتھ نہیں یہ ایک عام اوسط درجے کی ذہین لڑکی کے ہاتھ ہیں جواب کام کرنا چاہتی ہے وہ خاموش ہوگئی کچھ دیر بعد مسجد سے ظہر کی اذان کی صدا بلند ہوئی اس نے غیر ارادی طور پر ڈوپٹے سے سر ڈھانپ لیا، کچھ دیر بعد اس نے کہا مسلمانوں کو یہاں سے نہیں جانا چاہیے تھا تم کیوں نہیں دیکھتے کہ یہ تمہارا اپنا وطن ہے اس نے بے بسی سے انگلیاں مروڑیں اور تم یوں چلے گئے کیا میں تمہارے یہاں آ جاؤں تو مجھے ایک ۔ سے ایک عہدہ نہ مل جائے گا دیکھو میں پیرس کیمبرج اور لندن سے کتنی ڈگریاں لائی ہوں چمپا کا ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ ایک بہت جرأت مندانہ قدم ہے جو اس کی مستحکم قوت ارادی اور ہمت کی عکاسی کرتا ہے۔''　　(ماخوذ از ''آگ کا دریا'')

اصل میں اگر دیکھا جائے تو اس موضوع پر آگ کا دریا قرۃ العین حیدر کا تیسرا ناول ہے اس ۔ سے پہلے ''میرے بھی صنم خانے''، ''سفینۂ غم دل'' لکھے جا چکے تھے لیکن ''آگ کا دریا'' نے جو کینوس اختیار کیا ہے وہ بہت بے کراں ہے ڈھائی ہزار سال کی انسانی تہذیب کوئی معمولی چیز نہیں ہے تہذیبیں غروب ہوتی ہیں طلوع ہوتی ہیں آگ کا دریا میں بہت سے کردار ہیں لیکن انھیں جس طرح پیش کیا گیا ہے اس پر حیرت ہوتی ہے اپنے مضمون ''تقسیم ہند اور قرۃ العین حیدر کے ناول خاندانی زندگی کے تناظر میں'' فخر الکریم صدیقی نے بہت سی تفصیلات پیش کی ہیں جو تقسیم وطن کے تناظر میں ہیں اور ''آگ کا دریا'' کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''ناول ویدک زمانے سے شروع ہو کر موریہ خاندان کے ادوار اور حکومتیں عہد وسطی انگریزی سامراج اور پھر ملک کی تقسیم کے واقعات کے تاریخی اور تہذیبی پس منظر میں ہندوستانی کلچر کو پیش کرتا ہوا ختم ہو جاتا ہے اس میں آنے والی بھی قوموں کی خاندانی زندگی ان کا رہن سہن ان کے عروج و زوال کی کہانی بیان کی گئی ہے خصوصاً ناول کے آخری حصے میں تین خاندانوں کے ذریعے مشترکہ تہذیب اور پھر تقسیم کے بعد بکھراؤ کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔''

اگر ان تین خاندانوں کا جائزہ لیں تو پہلا خاندان ایک بیرسٹر کا ہے جو رائے زادہ کی کوٹھی میں مقیم ہے اس میں ان کی بیوی ایک لڑکا دو لڑکیاں ہیں بیرسٹر صاحب اردو شاعری پر مضامین لکھنے کا شوق رکھتے ہیں پریکٹس کی طرف توجہ کم ہے زمین داری سے خرچ چلتا ہے لڑکیوں کا جہیز تیار کیا جا رہا ہے اور لڑکا کیمبرج جا رہا ہے۔

دوسرا خاندان اس ناول میں نواب ابوالمکارم تقی رضا بہادر کا ہے نواب تقی رضا بہادر گل فشاں نام کی کوٹھی میں رہتے تھے یہ دونوں خاندان الگ الگ تہذیبوں کے حامل تھے اس کا ذکر تفصیل سے ناول میں کیا گیا ہے، تیسرا گھرانا متوسط ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی گھرانے ہیں جو ہندوستان کی تہذیب کو پوری طرح نمایاں کرتے ہیں اور معیار زندگی کو بھی واضح کرتے ہیں اس میں چمپا احمد بھی ہے جس کی ماں بھی متوسط طبقے کی ہے والد بھی خاندان والوں کے ساتھ ہیں۔ برصغیر میں پیدا ہونے والے سیاسی حالات کا بھی بھرپور جائزہ لیا گیا ہے

جس میں کانگریس مسلم لیگ خاص طور پر ہیں چمپا کے والد کے بارے میں قرۃ العین حیدر لکھتی ہیں:

''چمپا کے والد سیاست میں ہلکی پھلکی دلچسپی رکھتے تھے اس کے ایک چچا مراد آباد مسلم لیگ کے صدر تھے ۱۹۳۷ء میں لکھنؤ میں جب دھوم دھام سے مسلم لیگ کا اجلاس ہوا تو اس میں چمپا کے والد اور چچا دونوں شریک تھے راجہ صاحب محمود آباد جب بنارس آئے تو چمپا کے والد ان کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتے تھے اور پاکستان کے مطالبہ پر تبادلہ خیال کرتے تھے چمپا کے والد چمپا کو بھی علی گڑھ بھیجنا چاہتے تھے مگر اماں نے کہا کہ یہ ہرگز نہیں ہوگا بیٹا تو آئی ٹی میں پڑھیں گی جیسے رانی پھول کنور اور رانی صاحب بلاری کی بٹیا آئی ٹی میں پڑھتی ہیں۔'' (ماخوذ: ''آگ کا دریا'')

ناول میں دکھایا گیا ہے کہ ملک کی تقسیم کے بعد خاندان منتشر ہو جاتے ہیں ادھر اُدھر جا کر بس جاتے ہیں گویا ملک کی تقسیم ایسی تھی کہ جس نے سایہ دار اشجار کو برہنہ کر دیا تھا تمام پتے شاخوں سے اڑ گئے تھے گر گئے تھے کوئی یہاں کوئی وہاں۔

''آگ کا دریا'' میں وقت ایک بے مثال مواجِ ذخار اور بے کراں دریا ہے ناول کی بنیاد پر وقت پر ہی رکھی ہوئی ہے گویا اس رخش بے زمام کی پشت پر کاٹھیاں کسی ہوئی ہیں اور اس پر ایک انسانی نسل بیٹھی ہوئی ہے اور یہ اڑا چلا جا رہا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے ادوار کا خاص خیال رکھا ہے ان ادوار میں کئی طرح کی تہذیبیں ہیں کئی طرح کے لوگ ہیں وہ کون تھے جن سے انسانی رشتوں کی وابستگی تھی نسوانی مزاج میں کیا کیا باتیں تھیں عورتوں کے ساتھ کیا کیا سلوک تھے، ناول ۶۴۲ صفحات پر مشتمل ہے اس دریائے بے کراں کا سفر شروع کرنے سے پہلے ٹی ایس ایلیٹ کی ایک مشہور نظم درج کی گئی ہے گویا یہ نظم اس سفر کا توشہ ہے زادِ راہ ہے لیکن اس ناول کے کرداروں کی حالت دیکھ کر عرفی کا یہ شعر بے اختیار یاد آتا ہے۔

هم چو ما هی هم سمندر باش در جیحون عشق
روئے دریا سلسبیل و قعر دریا آتش است

ٹی ایس ایلیٹ کی نظم بھی کچھ اس انداز سے شروع ہوتی ہے۔ میں دیوتاؤں سے متعلق زیادہ نہیں جانتی لیکن میں سمجھتی ہوں کہ دریا

ایک طاقت ور مٹیالا دیوتا ہے تند مزاج غصیلا
اپنے موسموں اور غیظ و غضب کا مالک تباہ کن

وہ ان چیزوں کی یاد دلاتا رہتا ہے جنھیں انسان بھول جانا چاہتا ہے

وہ منتظر ہے اور دیکھتا ہے اور منتظر ہے
دریا سارے اندر سمندر نے ہمیں گھیر رکھا ہے
خاتمہ کہاں سے ہے آواز چیخوں کا
خزاں کی خاموشی ہے مرجھائے پھولوں کا
چپ چاپ اپنی پنکھڑیاں گراتے ہیں

''آگ کا دریا'' کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں شعور کی رو بے حد نمایاں ہو کر سامنے آئی ہے ہمارے ناقدین نے قرۃ العین حیدر میں شعور کی رو کے حوالے سے ورجینیا وولف سے مشابہت تلاش کی ہے۔

پروفیسر سیدہ جعفر کا خیال ہے کہ ''آگ کا دریا'' میں تلازمہ خیال اور شعور کے رو کی تکنیک کارفرما ہے ان کا کہنا ہے کہ قرۃ العین حیدر نے وجودیت کے دو بنیادی عوامل وقت اور انسانی وجود کو اس میں شریک کیا ہے اور انجام ہستی اور انسانی نسل کی مسلسل بقا کو ''آگ کا دریا'' کا مرکز محور بنایا ہے۔ انسانی وجود کا یہ نقطہ اختتام نہیں ہے ایک تسلسل ہے انھوں نے ایلیٹ کے حوالے سے بات کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ایلیٹ نے دریا کو وقت کا استعارہ کہا ہے اور ایک غضب ناک اور تباہ کن دیوتا سے تعبیر کیا ہے ''آگ کا دریا'' کا سب سے توانا فعال اور اہم محرک وقت ہے وقت تہذیبوں کے عروج و زوال کی داستانیں اور انفرادی زندگی کے تجربات اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے رواں دواں ہے ایک تسلسل ہے ایک مرحلہ ہے اور وقت کے سیل رواں کا ایک تموج ہے جو ماضی سے عبارت ہے اور حال سے اپنے تعلق کا منکر ہے۔ قرۃ العین حیدر کے یہاں ندی اور دریا وقت کے استعارے ہیں اور ان کی بے حد اہمیت ہے۔'' (ماخوذ شعور کی رو اور آگ کا دریا، مطبوعہ ایوان اردو قرۃ العین حیدر حیدر نمبر)

کہا جاتا ہے کہ تکنیک کے اعتبار سے قرۃ العین حیدر کا ناول آگ کا دریا سے زیادہ ممتاز کوئی ناول اردو میں نہیں ہے اس سلسلے میں انھوں نے خود اپنے ایک انٹرویو میں اہم باتیں کہی ہیں یہ انٹرویو ''طلوع افکار'' کراچی ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا تھا:

''جب لکھنے بیٹھتے ہیں تو تکنیک خود بخود وارد ہو جاتی ہے اس کے لیے ضروری نہیں کہ لکھنے والے اس کے بارے میں پہلے سوچے ایک موسیقار کے ساتھ تو یہ مشکل ہے کہ ایک راگ کے لیے خواہ تکنیک میں تبدیلی کرے بنیادی اصولوں سے انحراف ممکن نہیں لیکن میرے لیے یہ مشکل نہیں ہے کوئی بھی مختصر سا منظر یا امیج جو میری یادوں میں موجود ہو مجھے تحریک دیتا ہے اور میں لکھنا شروع کر دیتی ہوں تکنیک خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔''

''آگ کا دریا'' پڑھتے وقت اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے جیسا کہ قرۃ العین حیدر نے کہا کہ تکنیک خود بخود پیدا ہوتی ہے خود کلامی کا یہ انداز ناول کے صفحہ ۴۰۲ پر ملاحظہ ہو:

''سامنے دیودار کا جنگل ہے سرخ پتوں نے چاروں اور آگ لگا رکھی ہے وادی میں ٹرمینس مکانوں کے پیچھے انگنیوں پر پھیلے کپڑوں میں سے لہراتی اتراتی جا رہی ہیں مارگ میں زرد پتے اڑ رہے ہیں جھیل میں ایک کشتی ڈولتی ہے آرام کرسیوں پر عسرت زدہ پینشن یافتہ بوڑھے اپنی بے یار و مددگار آنکھوں کے سامنے دھند دیکھتے ہیں اور کانپتے ہاتھوں سے کاغذی لفافوں میں سے بن نکال کر دکھا رہے ہیں آج کا دن ایک اور دن ہے انسانوں کے گروہ یونیورسٹی لاکورٹس سٹی کو جا رہے ہیں میں کون ہوتی ہوں کہ اس میں شامل ہونے سے انکار کر دوں ہاں یہ بالکل صحیح ہے کہ مجھے ڈر لگتا ہے اس نے سوچا اور جنگل کی سرخ روشنی میں چھپ گیا اس جنگل سے میں بھی گزر رہی

ہوں ہم سب گزر رہے ہیں میں نے اس میں ہیدر کے چھوٹے چھوٹے شگوفے جمع کیے تھے طلعت نے کہا۔''

انسان جو بہت کچھ ماضی میں چھوڑ آتا ہے وہ اس کے تحت الشعور میں ہوتا ہے جب کبھی وہ پھر ان مناظر سے دوچار ہوتا ہے سارے مناظر سامنے آجاتے ہیں اس طرح کی خودکلامی اس کے اندر پیدا ہوتی ہے جس میں ایک طرح کی سرشاری ہمیشہ قائم رہتی ہے اس سوچ میں ایک لطف ہوتا ہے جسے فیض نے کہا ہے کہ ''وصل محبوب کے تصور سے موبمو چور عضو عضو نڈھال'' پروفیسر بیگ احساس نے اپنے ایک مضمون ''آگ کا دریا'' کے تکنیک کا تجزیاتی مطالعہ مطبوعہ ''روشنائی'' کراچی قرۃ العین حیدر نمبر جولائی تا ستمبر ۲۰۰۸ء'' میں ایک جگہ لکھا ہے:

''فکشن میں شعور کی رو کو قابو میں رکھنے کے لیے آزاد تلازمات کا استعمال کیا جاتا ہے اس تلازمہ کے بارے میں سبھی ماہرین نفسیات اس بات پر متفق ہیں کہ نفس یا سائکی ایک مسلسل کیفیت ہے یہ زیادہ عرصے تک کسی ایک چیز پر قانع نہیں رہتا چوں کہ شعور کو کچھ نہ کچھ مواد چاہیے یہ اسے آزاد تلازم کے ذریعے مل جاتا ہے۔ یعنی ایک چیز کسی دوسری چیز کی طرف لے جاتی ہے دوسری چیز کسی اور چیز کی طرف یہ چیزیں ایک دوسرے سے اس لیے رشتہ قائم کرلیتی ہیں کہ یا تو ان میں کچھ مشترکہ خصوصیات ہوتی یا یہ بالکل ایک دوسرے کے برعکس ہوتی ہیں کیا ان میں کوئی ایسی چیز ہوتی ہے جو بے ساختہ دوسرے کی یاد دلاتی ہیں جس کو آزاد تلازم کہتے ہیں رابرٹ ہیمفری تلازم کو قابو میں رکھنے کے لیے تین چیزیں ضروری سمجھتا ہے یادداشت، احساس اور تصور۔ ''آگ کا دریا'' میں قرۃ العین حیدر نے آزاد تلازم کی تکنیک کا استعمال بڑی خوبی سے کیا ہے۔ انھوں نے آزاد تلازم کے ذریعے رُو کو جس عمدگی سے پیش کیا ہے وہ بے مثال ہے۔''

''آگ کا دریا'' پر بہت لکھا جاچکا ہے ہزاروں پہلوؤں سے اس ناول کو دیکھا جاچکا ہے لیکن سبھی نے اس کی عظمت کو تسلیم کیا ہے۔

قرۃ العین حیدر ۲۰؍ جنوری ۱۹۲۷ء کو علی گڑھ میں پیدا ہوئی تھیں ناول کی تصنیف کا زمانہ ۱۹۵۶ء اور ۱۹۵۷ء کے درمیان کا زمانہ ہے یعنی پاکستان میں مارشل لا نافذ ہونے سے پہلے۔ گویا اس وقت ان کی عمر ۳۰؍ برس تھی ۳۰ سال کی عمر میں کوئی لڑکی اس قدر عظیم الشان کارنامہ انجام دے اسے تو بس عطیہ خداوندی ہی کہہ سکتے ہیں۔ فہمیدہ ریاض کا خیال ہے کہ ''آگ کا دریا'' کئی پرتوں کا حامل ہے۔ کئی چیزیں ایک وقت اس میں چلتی رہتی ہیں ابوالمنصور کمال الدین اہم کردار ہے چمپا اہم کردار ہے لکھنؤ کی طوائف چمپا اور چمپا احمد کیمبرج آکسفورڈ کی ڈگریاں رکھنے والی وقت کا دھارا اس میں بہتے ہوئے کردار مسلسل طبقاتی کش مکش کا شکار تاریخ کا تیز رو دھارا وہ یوں لکھتی ہیں:

''آگ کا دریا'' میں بھی انھوں نے تاریخ کا فوکس ماضی یا مستقبل سے پڑے پھر (اندرپرست یا دہلی) سے بہت دور لوئی ندی کے کنارے آباد بستیوں رجواڑوں پر مرکوز رکھا نکتہ آغاز کے لیے انھوں نے بدھ (شاکیہ منی) کے نزول سے ۱۰۰ برس بعد کا زمانہ منتخب کیا جب بدھ کے افکار پھیل رہے تھے اور ہندو فلسفہ حیات اپنی جگہ قائم تھا ناول کے ابتدائی ابواب میں ویدوں اپنشدوں اور بدھ ازم کے نظریات کی مماثلت اور تصادم کی

بحث دو کرداروں ہری شنکر اور گوتم نیلامبر کی دلچسپ ملاقات و گفتگو کے ذریعے پیش کرتی ہیں جب کہ اس دور کے ماضی کے تاریخی واقعات (مہابھارت) ابھی پوری طرح دیوتاؤں میں منقلب نہیں ہوئے تھے۔''

(قرۃ العین حیدر مطبوعہ ونیاز اد کراچی۔از: فہمیدہ ریاض)

''آگ کا دریا'' تو قرۃ العین حیدر کا بے مثال شاہکار ہے ہی لیکن انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے احساس ہوتا ہے کہ وہ قدیم سے جدید تک سارے ہندوستان کا علم رکھتی تھیں اور ہندوستان ہی نہیں دنیا کی تمام تر تہذیبوں کا انھیں درک تھا وہ تاریخ فلسفہ معاشیات اور کائنات تمام منزلوں سے واقف تھیں اور یہ سب ان پر اوائل عمری میں ہی منکشف ہونا شروع ہو گیا تھا اس میں ان کا علم ان کی دلچسپی تو اہم ہے ہی اس خاندانی ماحول کا بھی اثر ہے جس میں وہ پروان چڑھیں ان کے والد ان کی والدہ دونوں ہی معروف فکشن نگار تھے انھوں نے بھی ابتدائی عمر سے ہی لکھنا شروع کر دیا تھا ان پر الزامات لگائے جاتے ہیں کہ وہ جاگیردارانہ نظام ہی کو فوقیت دیتی تھیں ایسا نہیں ہے ''آگ کا دریا'' اس کے بعد کی تمام تحریریں اگر جاگیردارانہ نظام کی بات کرتی ہیں تو دبے کچلے انسانوں کی بھی بات کرتی ہیں حقوق نسواں ان کے یہاں بے حد اہمیت رکھتا ہے اس معاشرے کی دبی کچلی ہوئی عورتوں کا ان کے یہاں ذکر ہے ان کی عسرت کسمپرسی بے چارگی بے بسی بدحالی سب کی تصویریں ان کے یہاں ہیں اور یہ تصویریں اس زمانے کی ہیں جب انھوں نے ''آگ کا دریا'' لکھی تھی اور اس طرح کے مناظر بھی ہیں جن میں تاریخ اور فلسفے کی جھلکیاں ہیں اس کے علاوہ قدیم اور جدید انسانی معاشرے کی تصویریں بھی ہیں ہندوستان آزاد ہونے کے بعد تقسیم ہو چکا تھا زبردست خون خرابہ ہوا تھا تفریق پیدا ہوئی تھی ایسی نفرتیں جو آج تک محبتوں میں بدل نہیں سکیں حالاں کہ کوششیں جاری ہیں قرۃ العین حیدر کی نگاہ میں سب کچھ تھا ایک کرب تھا ایک درد تھا خون میں نہائی ہوئی تہذیب تھی ان انسانوں کی جو کبھی مل جل کر باہم شیر و شکر ہو کر رہتے تھے آج ایک دوسرے سے نفرت کر رہے ہیں حالاں کہ وہ سب ایک ہی مٹی سے پیدا ہوئے تھے ایک ہی ماں باپ کی اولاد تھے مگر نفرتیں ان کا مقدر بن چکی تھیں یہی وہ اضطراب تھا جو انھیں پاکستان لے گیا تھا لیکن وہاں بھی انھیں سکون نہیں ملا ۱۹۵۸ء میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا زبان و قلم پر پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ ظاہر ہے کہ قرۃ العین حیدر کی مضطرب روح وہاں قرار کس طرح پا سکتی تھی وہ واپس ہندوستان آ گئیں اور ان کے قلم سے اثمار شیریں ٹپکتے رہے قرۃ العین حیدر خود میں ایک تاریخ تھیں ایک عہد تھیں جسے ماہ و سال ساعتوں اور لمحات میں قید نہیں رکھا جا سکتا۔

اقبال کے اس شعر کے مطابق:

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں ہردم رواں ہے زندگی

غضنفر

ریڈیو فیچر

کسی بھی موضوع کے نمایاں نقوش کو حقائق کی روشنی میں ڈرامائی انداز کے سہارے سماعت کے راستے سے سامعین کے دل و دماغ تک پہنچانے کا نام ریڈیو فیچر ہے۔اس بیان میں جن لفظوں پر زور دیا گیا ہے۔وہ ہیں:

-کسی بھی موضوع

-نمایاں نقوش

-حقائق کی روشنی

-ڈرامائی انداز

-سماعت کا راستہ

ان لفظوں پر زور دینے کا مطلب یہ ہوا کہ ریڈیو فیچر کے موضوع کی تخصیص نہیں ہے۔موضوع کوئی بھی اور کچھ بھی ہوسکتا ہے۔موضوع کی تمام تر تفصیلات کی بھی ضرورت نہیں ،صرف نمایاں نقوش یا ممتاز پہلو ہی کافی ہیں مگر وہ نمایاں نقوش یا ممتاز پہلو حقائق پر مبنی ہوں۔یعنی ان میں جھوٹ یا مبالغہ نہ ہو۔ان کی پیش کش میں ڈرامائی انداز اور سمعی راستہ اختیار کیا گیا ہو۔مطلب یہ کہ انھیں حروف کی شکل میں یا کسی اسٹیج پر دکھانے کے بجائے صوت وصدا کے ذریعہ سنائے جانے کا اہتمام کیا گیا ہو۔

میں اپنے مذکورہ بالا بیان جس میں غیر تخصیصی موضوع ،نمایاں نقوش ،حقائق ،ڈرامائی انداز اور سماعت کے راستے پر زور دیا گیا ہے،کی صداقت کو ثابت کرنے اور یقینی بنانے کے لیے فیچر کا طریقۂ کار اختیار کرتے ہوئے کچھ اور راویوں کی مدد لے رہا ہوں۔میرے پہلے راوی ہیں گریرسن وہ فرماتے ہیں:ریڈیو فیچر کسی بھی حقائق کی گرافک ترجمانی ہے۔اور دوسرے راوی ہیں رمیش چندر۔رمیش چندر کا کہنا ہے

''براڈ کاسٹنگ میں فیچر کی اصطلاح ایسے وسیع تر پروگراموں کے لیے استعمال کی جاتی ہے جن میں عام طور پر مختلف تکنیکوں کو کام میں لاکر مختلف حقائق کو دستاویزی شکل میں پیش کیا جاتا ہے اور ڈرامائی انداز کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔''

تیسرے راوی بی بی سی کے معروف پروڈکشن ڈائریکٹر گلکلڈ کا بیان ہے:

''ریڈیو فیچر ڈرامے کی ہیت میں نہ ہو البتہ جب نشر کیا جائے تو اس کے پیش کش میں ڈرامانہیں ہوتا مگر اس کے لیے ریڈیو ڈرامے کے پروڈیوسر اور صدا کاروں کی ضرورت لازمی ہے۔''

ایک اور راوی سدھ ناتھ کمار کہتے ہیں:

"فیچر میں حقائق کی ڈرامائی پیش کش ہوتی ہے۔حقائق کے معانی یہاں پر خاص طور سے حقیقی واقعات ہیں۔فیچر نگار کے لیے یہ لازمی ہے کہ وہ حقیقی واقعات پر ہی فیچر کی تخلیق کرے۔

ان مشہور و معروف راویوں کے بیانات سے تصدیق شدہ میرے بیان کے مذکورہ بالا الفاظ نہ صرف یہ کہ ریڈیو کی شناخت کو اجاگر کرتے ہیں بلکہ اسے دوسرے نشریاتی پروگراموں مثلاً ریڈیو ڈراما، ریڈیو تقریر، ریڈیو مذاکرہ وغیرہ سے ممتاز و ممیز بھی کرتے ہیں۔

اپنی پیش کش کے اعتبار سے ریڈیو فیچر ریڈیو ڈراما کے قریب ہے۔اس لیے ریڈیو فیچر اور ریڈیو ڈراما کو پہچاننے میں اکثر دھوکا بھی ہوتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے بعض باتیں دونوں میں مشترک ہیں۔مثلاً دونوں کا تعلق سماعت سے ہے۔دونوں میں صوت وصدا سے کام لیا جاتا ہے۔دونوں میں ڈرامائی انداز ہوتا ہے مگر سچ یہ ہے کہ دونوں ایک نہیں ہیں۔دونوں میں فرق ہے۔پہلا فرق یہ ہے کہ ریڈیو ڈراما میں کوئی نہ کوئی کہانی ضرور ہوتی ہے جو واقعات کی منطقی ترتیب سے ارتقا پاتی ہے اور کرداروں کے عمل وتصادم (جو مکالموں سے ظاہر ہوتے ہیں) کے ذریعے اپنے کلائمکس تک پہنچتی ہے اس کے برعکس ریڈیو فیچر میں کسی کہانی کا ہونا ضروری نہیں ہے۔کسی کہانی میں کوئی کہانی ہوتی بھی ہے تو وہ اس فیچر کے موضوع کی وکالت کے لئے ہوتی ہے یا تکنیک کا کام کرتی ہے اور اس کہانی کے واقعات کی ترتیب اور اس میں مکالموں کا اہتمام اور کرداروں کے درمیان مکالماتی تصادم کا التزام اس طرح نہیں ہوتا جس طرح کسی ریڈیو ڈرامے میں کیا جاتا ہے۔دوسرا فرق یہ ہے کہ ریڈیو ڈرامے میں شروع سے آخر تک ڈراما ہوتا ہے۔اس میں ڈرامے کے تمام تر فنی تقاضوں کا خیال رکھا جاتا ہے جبکہ ریڈیو فیچر میں ڈرامے کی محض ایک خصوصیت ڈرامائیت یا ڈرامائی انداز کو برتا جاتا ہے۔ایک بڑا فرق یہ ہے کہ ریڈیو فیچر میں بیان سے کام لیا جاتا ہے۔کوئی راوی بنیادی بات یا موضوع کے اہم پہلوؤں کو بیان کرتا ہے۔مختلف حصوں کو اپنے بیان سے جوڑتا ہے۔ان میں ربط پیدا کرتا ہے۔کسی کسی فیچر میں اس کام کے لئے دو دو راوی ہوتے ہیں۔ان میں سے اکثر ایک کا تعلق صنف نازک سے ہوتا ہے۔ایسا آوازوں میں ورائٹی اور بیان میں حسن پیدا کرنے کے لئے کیا جاتا ہے۔ راوی یا راویوں کے بیان میں صداقت لانے اور اسے یقینی بنانے کے لئے بیچ بیچ میں کچھ دوسرے راویوں یا لوگوں کی مدد بھی لی جاتی ہے جو اس موضوع سے براہ راست تعلق رکھتے ہیں یا اس موضوع کے ماہر ہوتے ہیں یا اس کے متعلق مفتی کا درجہ رکھتے ہیں یا وہ موضوع اگر کوئی واقعہ یا حادثہ ہے تو اس کے چشم دید گواہ ہوتے ہیں۔یہ دوسرے لوگ یا راوی نہ صرف یہ کہ اپنے بیانات سے حقائق کو اعتبار بخشتے ہیں بلکہ اپنی اپنی آوازوں کی انفرادیت اور اپنے اپنے لب ولہجے کے آہنگ اور زیر و بم سے بنیادی راوی کی آواز کی یکسانیت سے فیچر کو بچاتے بھی ہیں اور اسے دلچسپ اور پر اثر بھی بناتے ہیں۔ بار بار بدلے جانے والے بیان اور راوی کی بدلی ہوئی آواز سے فیچر میں ڈرامائیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔جو سامعین کی دلچسپی کا باعث بنتی ہے۔لیکن ریڈیو ڈرامے میں اس طرح کا کوئی التزام نہیں ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا مباحث سے یہ نتیجہ نکلا کہ ریڈیو فیچر ایک ایسا بیانیہ ہے جو ڈرامائی تکنیک وطریقہ کار کی مدد سے کسی

موضوع کے حقائق کو ایک سے زیادہ آوازوں میں خوش آہنگ اور پر اثر بنا کر پیش کرتا ہے۔

ریڈیو فیچر کی دو بڑی خصوصیات ہیں ایک یہ کہ اس کا دائرہ کافی وسیع ہے۔ اس میں ہر طرح کے موضوعات کی گنجائش ہے۔ کسی بھی موضوع پر خواہ وہ سماجی ہو یا سیاسی تاریخی ہو یا سائنسی، ادبی ہو یا ثقافتی، علمی ہو یا غیر علمی، شخصی ہو یا غیر شخصی فیچر تیار کیا جا سکتا ہے۔ اس میں تنوع بھی بہت ہے۔ رزم، بزم، دہشت، امن، آسمان، زمین، سورج، چاند، چرند، پرند، شجر حجر، سمندر، صحرا، تصنیف، فلسفہ، رقص، موسیقی، مصوری اس میں سبھی کو دیکھا جا سکتا ہے۔ فیچر خالص معلوماتی بھی ہو سکتا ہے اور تخلیقی شان بھی رکھ سکتا ہے۔

اور دوسری بڑی خصوصیت یہ کہ دیگر اصناف کی طرح فیچر کسی ایک ہیئت، کسی ایک تکنیک اور کسی ایک طریقۂ کار کی قید و بند میں محصور نہیں رہتا۔ اس کے پیش کش میں اتنی آزادی ہے کہ اس کو جس طرح چاہے پیش کیا جا سکتا ہے اس کے لئے کوئی بھی فارمیٹ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ مختلف ہیئتوں تکنیکوں اور طریقوں اور اصناف کی مدد لی جا سکتی ہے۔ اس کی پیش کش میں نثری اور شعری افسانوی اور غیر افسانوی ہر طرح کے طریقۂ کار کو اپنایا جا سکتا ہے۔ اسے بیانیہ علامتی، مکالماتی تمثیلی، استعاراتی، علامتی، ڈرامائی ہر طرح کے رنگ و آہنگ سے سجایا اور سنوارا جا سکتا ہے۔ ریڈیو فیچر کی پیش کش کی یہ آزادی ریڈیو مصنف کو آسانی تو فراہم کرتی ہی ہے، سننے والوں کو بھی رنگا رنگی و بوقلمونی اور صوت و صدا کی مختلف کیفیتیں عطا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ریڈیو فیچر میں ہر طرح کے اہل ذوق کی تسکین کے سامان مل جاتے ہیں۔

موضوعات کی وسعت اور طریقہ کار کی آزادی فیچر نگار کے تخیل کو ایسا کھلا ماحول فراہم کرتی ہے کہ اس کی تخلیقیت اپنے کھلے پروں سے جی بھر کر اڑان بھر پاتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معلوماتی نوعیت کی اس ریڈیائی صنف میں تخلیقی آن بان اور شان پیدا ہو جاتی ہے۔

رفعت سروش صاحب کی یہ بات اپنی جگہ درست سہی کہ فیچر میں تخلیقیت کی اتنی ضرورت نہیں جتنی تحقیق و جستجو اور وافر معلومات کی۔ مگر اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ تخلیقیت فیچر کو زیادہ دلچسپ، زیادہ بامعنی اور زیادہ دیرپا اثر رکھنے والا فن پارہ بنا دیتی ہے۔ تخلیقیت کے بغیر فیچر محض معلومات کا پلندہ ہے یا خبروں کے مجموعے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ فیچر کو خبر سے الگ اور معلومات سے ممتاز تو تخلیقیت ہی کرتی ہے اور وہی اسے دائمی حیثیت بھی عطا کرتی ہے اس لئے میرے خیال میں فیچر کے لئے جتنی ضرورت تحقیق و جستجو اور وافر معلومات کی ہے اتنی ہی تخلیقیت کی بھی۔

ریڈیو فیچر کا ایک قابل توجہ فیچر یعنی پہلو اس کی زبان بھی ہے۔ فیچر ایک ریڈیائی صنف ہے اور ریڈیائی نشریات کا سب سے اہم، کارگر اور موزوں حربہ لفظ ہوتا ہے۔ یہاں لفظ اپنی صورت نہیں دکھاتا بلکہ صرف اپنی صوت کا جادو جگاتا ہے اور لفظ کی صوت یعنی آواز کی جادوگری یہ ہے کہ لفظ تصویر بن جائے۔ لفظ سُر میں ڈھل جائے۔ لفظ تال میں تبدیل ہو جائے۔ لفظ رقص کرنے لگے۔ لفظ بھاؤ بتانے لگے۔ لفظ طبلے کی طرح کھنک اور گھنگھرو کی مانند چھنک اٹھے، لفظ پھول بن کر کھل جائے، لمس بن کر رگ و ریشے میں گھل جائے، لفظ رنگ میں

بدل جائے، لفظ خوشبو ہو جائے، لفظ روشنی نظر آئے۔

لفظ کی یہ جادوگری ریڈیائی نشریات خصوصاً ریڈیو فیچر میں زیادہ دیکھنے کو ملتی ہے۔ ریڈیو فیچر میں یہ منیجر کاری سماعت کے راستے سے آنکھوں میں پہنچتی ہے۔ صوت وصدا سے صورت گری کا کام آسان نہیں ہوتا۔ اس کے لئے سخت محنت، نشریاتی تکنیک سے پوری طرح واقفیت، لفظ ومعنی پر قدرت، ان کے تخلیقی استعمال میں مشق وریاضت اور نظم وضبط والی ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ساتھ ہی ریڈیو فیچر کے مصنف کے لئے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ وہ صوت اور صورت کے فرق کو جانے۔ دونوں کے مقصد اور منزل کو پہچانے۔ حرف اور آواز کا ہنر اسے آئے، ترسیل، ابلاغ کے مختلف راستوں سے وہ اچھی طرح واقف ہو۔ راہ کے روڑوں کو ہٹانا اور صوت وصدا کو سماعت تک پہنچانا اسے آتا ہو، اس لئے کہ ریڈیو کی زبان میں مشکل، غریب ادق، ثقیل اور نامانوس الفاظ اظہار کے راستے کا پتھر بن جاتے ہیں یہاں مرکب اور پیچیدہ جملوں کی گنجائش بھی بہت کم ہوتی ہے کہ وہ خیال کے بہاؤ کو روکتے ہیں، بیان پر بند باندھتے ہیں۔ اظہار وابلاغ کے راہ میں روڑا اٹکاتے ہیں۔ یہاں ایسے لفظوں کی ضرورت ہوتی ہے جو سہل سلیس اور سبک ہوں، جو عام فہم اور روزمرہ کے قریب ہوں، جو زیادہ بولے اور سنے جاتے ہوں۔ ایسے جملوں کی ضرورت پڑتی ہے جو آب دریا کی طرح رواں ہو اور جن میں بلا کا زور بیان ہو، یہاں لفظوں کے انتخاب، ان کی ترتیب اور ادائیگی میں ایسی فن کاری دکھانی ہوتی ہے کہ لفظ تمام حواس کی تسکین کے سامان بن جاتے ہیں۔ یہاں تحریری زبان میں نظر آنے والے مندرجہ ذیل اور درج بالا جیسے جملے نہیں ہوتے، قوسین اور واوین میں بند اقتباسات کا گزر بھی اس زبان میں نہیں ہوتا۔ ریڈیائی اسکرپٹ میں کرداروں کے ناموں میں سے بھی ہوشیاری اور فن کاری سے کام لینا پڑتا ہے کیونکہ صوتی تکرار والے یا آپس میں ملتے جلتے نام شناخت، میں دشواری پیدا کرتے ہیں اور ان کی وجہ سے تفہیم بھی متاثر ہوتی ہے۔

ریڈیو فیچر کے لئے جو طریقہ اپنائے جاتے رہے ہیں ان میں سب سے زیادہ چلن جس طریقہ کار کا ہے اسے نموناً یہاں درج کیا جارہا ہے۔

اس طریقے کی تکنیک یہ ہے کہ کسی موضوع کو کوئی راوی بیان کرتا ہے۔ اس راوی کے بیان کی صداقت کو ثابت کرنے یا حقائق کو یقینی بنانے کے لئے بیچ بیچ میں دوسرے راویوں سے بھی بیان دلوایا جاتا ہے۔ یہ دوسرے راوی وہ ہوتے ہیں جن کا تعلق براہ راست ان موضوع سے ہوتا ہے یا جو اس موضوع کے ماہر ہوتے ہیں یا کسی نہ کسی اعتبار سے وہ اس سے جڑے ہوتے ہیں۔ یہ بیان ان کی اپنی آواز میں بھی ہوسکتا ہے اور کسی دوسرے کی آواز میں بھی۔ مثلاً غزل کے فن اور ارتقا پر کوئی ریڈیو فیچر تیار کیا جارہا ہے تو مرکزی راوی کے ساتھ ساتھ بیچ بیچ میں حسب ضرورت اور حسب موقع غزل کے فن اور ارتقا پر غزل کے نقاد، غزل کے شاعر، غزل کے مداح اور پرستار بھی اظہار خیال کریں گے۔ ان کے بیان یا تو خود ان کی آواز میں ہوں گے یا ان کے اقوال وارشادات کو دوسرے راویوں کی آواز میں پیش کیا جائے گا۔ مثال کے طور پر غزل کے فن سے متعلق کسی راوی کی آواز میں کلیم الدین احمد کا یہ قول۔

''غزل ایک نیم وحشی صنف سخن ہے'' بیان کیا جائے گا تو کسی دوسرے راوی کی آواز میں رشید احمد صدیقی

کی یہ رائے پیش کی جائے گی کہ غزل اردو شاعری کی آبرو ہے۔

جہاں یہ فیچر کا مرکزی راوی یہ بیان کر رہا ہو کہ غزل جب ایران سے نکل کر ہندوستان پہنچی اور دکن میں قیام کیا تو یہ ہندوستانی رنگ اور دکنی زبان کے آہنگ سے ہم آہنگ ہوگئی تو اس بیان کی تصدیق کے لئے دکنی دور کے کچھ اشعار پیش کیے جائیں گے۔ مثلاً ولی کے یہ اشعار ہے۔

نہیں کوئی دھرم دھاری جو کہے پیتم سوں سمجھا کر
کہ دکھیا کوں، بجوہی سوں، اتا بیزار کرنا کیا
مجھ دل کے کبوتر کوں پکڑا ہے تری لٹ نے
یہ کام دھرم کا ہے ٹک اس کوں چھڑاتی جا

اور جس جگہ راوی یہ بیان کر رہا ہو کہ غزل واحد ایسی صنف ہے جس میں موسیقیت کا عنصر زیادہ پایا جاتا ہے اور اسی لئے غزل آسانی سے سنگیت کے سروں میں ڈھل جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ سب سے زیادہ گائی بھی جاتی ہے۔ وہاں ساز و آواز کے ساتھ کسی گائی گئی غزل کے کچھ اشعار پیش کیے جائیں گے مثال کے طور پر شہریار کی غزل کے یہ اشعار۔

سینے میں جلن آنکھوں میں طوفان سا کیوں ہے
اس شہر میں ہر شخص پریشان سا کیوں ہے
کیا کوئی نئی بات نظر آتی ہے ہم میں
آئینہ ہمیں دیکھ کے حیران سا کیوں ہے

راویوں کے بیانات: مختلف رنگ کے اشعار اور ساز و آواز یا موسیقی کی دھن پر گائی گئی غزل کے ساتھ ساتھ غزل کے فن کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے اور اس کے ارتقائی سفر میں آنے والے مختلف موڑ، اور اس موڑ سے بدلنے والے اس کے رنگ و آہنگ کو دکھانے اور سنانے کے لئے مختلف طرح کے صوتی اثرات سے بھی مدد لی جا سکتی ہے۔ صوتی اثرات کے استعمال سے بیان کا حسن بڑھ جاتا ہے۔ اس کی اثریت دوبالا ہو جاتی ہے۔ صوتی اثرات راوی کے سر میں سر ملا کر آواز کے زیر و بم کو تو بڑھاتے ہی ہیں، حقائق کو رنگ و آہنگ سے سجا کر معنویت میں بھی اضافہ کرتے ہیں مگر یہاں اس بات کا خیال ضروری ہے کہ صوتی اثرات والی آوازیں اس طرح بجائی یا سنائی جائیں کہ راوی کی آواز دبنے نہ پائے ورنہ ان آوازوں کا effect غلط ہو سکتا ہے اور راوی کی آواز پس منظر کی آوازوں میں دب کر فیچر کو بے لطف اور بے معنی بنا سکتی ہے۔ یہاں اس بات کا احساس بھی ضروری ہے کہ راوی کا کردار ریڈیو فیچر میں بڑا اہم مقام رکھتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ وہ بنیادی باتوں کو بیان کرتا ہے بلکہ بہت سارے بیانوں اور فیچر کے مختلف اور متضاد حصوں میں ربط بھی پیدا کرتا ہے۔ اس ربط کو قصیدے کے گریز کی طرح فطری ہونا چاہئے اور اس فطری ربط و تسلسل کے لئے راوی کے کردار کے انتخاب اور اس کے پیش کش میں فنی چابک دستی سے کام لینا ضروری ہوتا ہے۔

اوپر فیچر کی پیش کش کے سلسلے میں جس طریقہ کار یا تکنیک کا ذکر کیا گیا، اس کا اسکرپٹ پہلے لکھ لیا جاتا ہے اور اس اسکرپٹ کے مطابق فیچر کی رکارڈنگ شروع کی جاتی ہے۔اور یہ کام اسٹوڈیو میں ہوتا ہے۔فیچر میں شریک ہونے والے راویوں اور کرداروں کے بیانوں اور مکالموں کو اسٹوڈیو میں رکارڈ کیا جاتا ہے۔جو لوگ اس دنیا میں موجود نہیں ہیں ان کی آوازوں کے رکارڈ آرکائیو سے حاصل کر کے حسب ضرورت ان کا استعمال کیا جاتا ہے۔ صوت اثرات بھی یہیں داخل کیے جاتے ہیں۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ بہت سی آوازوں تقریروں، بیانوں، انٹرویوز، تقریبات وتہواروں کی کارروائیوں، مختلف طرح کے جلسوں اور میلے ٹھیلے میں ہونے والے پروگراموں کی رکارڈنگ پہلے کر لی جاتی ہے اور ان رکارڈ شدہ مواد کی روشنی میں فیچر کا اسکرپٹ تیار کیا جاتا ہے اور مختلف طرح کے اجزا اور بیانوں میں ربط پیدا کرنے کے لئے کسی راوی کی مدد لی جاتی ہے اور اس طرح راوی کی مدد سے پہلے سے رکارڈ کئے گئے مواد کی کڑیوں کو جوڑ کر ریڈیو فیچر کی صورت دے دی جاتی ہے اس طرح کے فیچر کو باہر کی رکارڈنگ پر مبنی فیچر کیا جاتا ہے۔فیچر کی دو اور قسمیں بھی ہیں۔ایک کو دستاویزی فیچر اور دوسرے کو غنائیہ فیچر کا نام دیا جاتا ہے۔دستاویزات پر مبنی فیچر کو دستاویزی ریڈیو فیچر کہا جاتا ہے۔اس زمرے میں وہ فیچر آتے ہیں جن میں کسی شخصیت کسی ادارے یا کسی واقعے وغیرہ کو دستاویزی صورت دی گئی ہوتی ہے چوں کہ اس طرح کے فیچر کی حیثیت دستاویز کی ہوتی ہے اس لئے اس میں بیان کیے گئے ایک ایک واقعے کو یا ایک ایک بات یا ایک ایک جزو کو حقائق کی روشنی میں پیش کیا جاتا ہے اور ہر ایک کے ثبوت فراہم کیے جاتے ہیں ہندوستان کی جنگ آزادی، یوم جمہوریہ، گاندھی، نہرو، مولانا آزاد، خدابخش خاں لائبریری، نیشنل میوزیم وغیرہ پر تیار کیے گئے فیچر دستاویزی فیچر کے نمونے ہیں۔اور ایسا فیچر جو پورا کا پورا منظوم ہو اور جس کے ایک ایک لفظ کو گایا جائے۔اس میں ڈراما اور موسیقی کا خوبصورت امتزاج ہو اسے غنائیہ فیچر کہتے ہیں۔اسے منظوم ڈراما یا میوزیکل ڈراما بھی کہا جاتا ہے۔اردو میں ریڈیو فیچر کی روایت بہت پرانی نہیں ہے۔اردو میں یہ صنف ریڈیو ڈرامے کے بعد شروع ہوئی۔ریڈیو ڈراما بھی ایک نئی صنف تھی مگر اس کے لئے اسٹیج ڈرامے کی روایت موجود تھی۔ اس نے اسٹیج ڈراموں سے اپنے لئے روشنی حاصل کی اور اس روشنی میں اپنے رنگ وروپ کو نکھارا اور ریڈیائی تقاضے کے مطابق اپنا آہنگ تیار کیا لیکن اردو فیچر کے پاس فیچر کی ایسی کوئی روایت موجود نہ تھی اس کے باوجود اس نے مختلف تکنیکوں اور ہیئتوں کی مدد سے اپنے خدوخال تیار کیے اور ریڈیو ڈرامے کے پروڈیوسروں، صداکاروں اور جدت پسند اور فن شناس تخلیق کاروں کی مدد سے بہت جلد ایک مستقل صنف کا درجہ حاصل کر لیا۔اس نئی ریڈیائی صنف میں ایسے ایسے دلچسپ اور کامیاب نمونے پیش کیے گئے کہ تقریباً تمام ریڈیو اسٹیشنوں کی اردو سروسز نے اسے پروڈکشن کا ایک اہم اور ضروری حصہ بنالیا۔اور اتنے اچھے اچھے اور معیاری فیچر پیش کیے کہ اس ریڈیائی صنف کی جانب بڑے بڑے اردو ادیب بھی متوجہ ہونے لگے۔تخلیقی پروڈیوسروں، ادب شناس افسروں اور اچھے قلم کاروں کی ہم آہنگی اور ان کی مشترکہ کاوشوں نے اردو میں معیاری اور کامیاب ریڈیو فیچروں کا ایک سلسلہ قائم کر دیا۔اس سلسلے میں بہت سارے فیچر مثلاً ساغر نظامی کا اسوۂ حسنہ، محمد حسن کا اکبر اعظم اور نقش فریادی، قرۃ العین

حیدر کا متاعِ غالب، رفعت سروش کا دستک، قمر جمالی کا مدھیہ پردیش درشن، ایس ایل سنہا کا آزاد ہند گورنمنٹ، شمیم حنفی کا خیر تحیر عشق پر جاڑوں کی رت آئی، زنجیر کا نغمہ اقبال مجید کا داراشکوہ، مظفر حنفی کا شاد عارفی کی شخصیت وفن، اخلاق اثر کا مچھیرا وغیرہ جڑتے چلے گئے۔ اور اردو ریڈیو فیچر کا فن بجتا سنورتا چلا گیا اور اس کی آواز نگاڑے کی آواز کی مانند تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی مگر افسوس کہ ایسی وسیع القلب متنوع موضوعات، کثیر الجہات اور مختلف الاصوات رکھنے اور عوام وخواص دونوں کے ذوق کو تسکین پہنچانے والی صنف جلد ہی انحطاط کا شکار بھی ہوگئی۔ اس کے انحطاط کے دو اسباب ہیں۔ ایک بصری ترسیل وابلاغ کے ذرائع کی یلغار۔ یعنی ٹیلی وژن وکمپیوٹر کا زور اور ٹیلی پروگروں کے شور نے اس کی گونج کو دبا دیا۔ دوسرا سبب ریڈیو اسٹیشنوں سے تخلیقی پروڈیوسروں اور فن شناس پروگرام افسروں کے غیاب اور خالی عہدوں پر نئے اسامیوں کی بحالی کے سلسلے میں سرکار کا سرد رویہ۔ یعنی سرکار نے ایسی سرد مہری دکھائی کہ یہ صنف سرد خانے میں پڑے رہنے والے کسی بے کسے ڈھول کی طرح بے بول ہو کر رہ گئی۔ ضرورت ہے کہ صوت وصدا کا جادو جگانے والی اس صنف کو سرد خانے سے نکال کر اسے گرمایا جائے تا کہ اس کے بول پھر سے سنائی دے سکیں۔

☆☆☆

CENTRAL COUNCIL FOR RESEARCH IN UNANI MEDICINE

LIST OF PUBLICATIONS

S. No.	Name of Publication	Price (Rs)
1.	C/R English	30/-
2.	C/R Urdu	30/-
3.	C/R Hindi	36/-
4.	C/R Telugu	23/-
5.	C/R Tamil	55/-
6.	C/R Arabic	44/-
7.	C/R Gujrati	44/-
8.	C/R Kannada	34/-
9.	C/R Oriya	34/-
10.	C/R Bengali	19/-
11.	C/R Punjabi	16/-
12.	C/R Persian	125/-
13.	Aljamili Maf. Vol-I	71/-
14.	Aljamili Maf. Vol-II	208/-
15.	Aljamili Maf. Vol-III	275/-
16.	Aljamili Maf. Vol-IV	350/-
17.	Amraz -e- Qalb	205/-
18.	Amraz -e- Ria	150/-
19.	A. Sarguzisht (Urdu)	7/-
20.	A. Sarguzisht (Hindi)	40/-
21.	M. Buqratia-I	360/-
22.	M. Buqratia-II	270/-
23.	M. Buqratia-III	240/-
24.	K. Umda-I	57/-
25.	K. Umda-II	93/-
26.	K. Kulyat (Urdu)	71/-
27.	K. Kulyat (Arabic)	107/-
28.	K. Mansoori	169/-
29.	K. Abdal (Urdu)	109/-
30.	K. Abdal (English)	100/-
31.	K. Taiseer	50/-
32.	K. AL-Hawi-I	195/-
33.	K. AL-Hawi-II	190/-
34.	K. AL-Hawi-III	180/-
35.	K. AL-Hawi-IV	143/-
36.	K. AL-Hawi-V	151/-
37.	K. AL-Hawi-VI	182/-
38.	K. AL-Hawi-VII	197/-
39.	K. AL-Hawi-VIII	151-
40.	K. AL-Hawi-IX	153/-
41.	K. AL-Hawi-X	230/-
42.	K. AL-Hawi-XI	195/-
43.	K. AL-Hawi-XII	138/-
44.	K. AL-Hawi-XIII	165/-
45.	K. AL-Hawi-XIV	160/-
46.	K. AL-Hawi-XV	-
47.	K. AL-Hawi-XVI	-
48.	Risala -e- Judia	109/-
49.	Uyoonal Anba-I	131/-
50.	Uyoonal Anba-II	143/-

51.	K. Mukhtarat-I (Urdu)	275/-
52.	K. Mukhtarat-II (Urdu)	385/-
53.	K. Mukhtarat-III (Urdu)	320/-
54.	K. Mukhtarat-IV (Urdu)	-
55.	K. Taklees (Urdu)	142/-
56.	Sanat -al- Taklees (pb)	198/-
57.	Sanat -al- Taklees (hb)	228/-
58.	NFUM-I Urdu	175/-
59.	K. Al - Fakhir (Arabic) 1/1	272/-
60.	K. Al - Fakhir (Arabic) 1/2	500/-
61.	Physico Chemical-I	43/-
62.	Physico Chemical-II	50/-
63.	Physico Chemical-III	107/-
64.	Physico Chemical-IV	225/-
65.	Stds. of Single Drgs-I	86/-
66.	Stds. of Single Drgs-II	129/-
67.	Stds. of Single Drgs-III	188/-
68.	Stds. of Single Drgs-IV	255/-
69.	Stds. of Single Drgs-V	-
70.	Chemistry of Medical Pts.	340/-
71.	Birth Control	131/-
72.	Med Pts. of Tamil Nadu	143/-
73.	Med Pts. of A.P.	164/-
74.	Med Pts. of Gwalior	195/-
75.	Med Pts. of Aligarh	90/-
76.	Anti Malarial Hrb. Drgs	90/-
77.	Hkm. Ajmal Khan	185/-
78.	Unani Pharmacopoeia 1/II	-
79.	Unani Pharmacopoeia 1/III	-
80.	NFUM-I (Eng.) (pb)	237/-
81.	NFUM-II (Eng.) (hb)	259/-
	Dept. of Ayush	
82.	NFUM-III (Eng.)	200/-
83.	NFUM-IV (Eng.)	200/-
	Under Mansucript	
84.	Qarabadin -e- Jadeed (pb)	376/-
85.	Qarabadin -e- Jadeed (hb)	409/-
86.	Qdn-Azam -o- Akmal (pb.)	952/-
87.	Qdn-Azam -o- Akmal (hb.)	1038/-
88.	Qarabadeen -e- Azam	-
89.	Qarabadeen -e- Sarkari	-
90.	Qarabadeen -e- Jalalee	-
91.	Qarabadeen -e- Ahsani	-
92.	Al. Qarabadeen	-
93.	Qanoon -e- Shaikh	-
94.	Ramooz -e- Azam-I	-
95.	Ramooz -e- Azam-II	-
96.	Kamil -al- Sana -I (pb)	640/-
97.	Kamil -al- Sana -I (hb)	714/-
98.	Kamil -al- Sana -II (pb)	882/-
99.	Kamil -al- Sana -II (hb)	984/-
	WHO	
100.	Ilaj -ul- Amraz (Urdu)	1183/-
101.	Kimya -e- Anasari (Urdu)	977/-

To have the books by post, Bank Draft covering the cost of the books ordered issued in the name of Director, CCRUM, New Delhi and payable at New Delhi, be sent in advance. If the order is less than Rs. *100/-* postal charges will be borne by the buyer. The books can be had from: *Central Council for Research in Unani Medicine, 61-65, Institutional Area, Opp. D-Block, Janakpuri, New Delhi - 110058.*
Tel.: 285258-31, 52, 62, 83,97, 28525982. Fax: 28522965

رؤف خیر

مدیر ''نقوش'' سے عزیز احمد کی سودے بازی

ادب کا بہت بڑا المیہ ہے کہ اب خطوط لکھے ہی نہیں جا رہے ہیں۔ادب ہی کیا کسی بھی فن کے نابغۂ روزگار کے خطوط بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔تحریر کا حسن اور واقعیت خطوط ہی سے تو جھلکتی ہے جو لکھنے والے کا ذہن پڑھنے میں مدد کرتی ہے۔ادب کے حوالے سے ہم جائزہ لیں تو غالبؔ کے خطوط جہاں اردو نثر کے ارتقاء کا اہم حصہ سمجھے جاتے ہیں وہیں غالب کے دور کے حالات کے غماز بھی ہیں۔غالب کے شاگردوں اور چاہنے والوں کے حوالے سے ان کے اپنے علاقوں کی صورت حال اور غالب سے ان کے تعلقات کی نوعیت پر روشنی بھی ڈالتے ہیں۔مراسلے کو مکالمہ بنانے کی روایت بھی تو غالب نے ڈالی تھی۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی اسی بہانے غبار خاطر کو قول فیصل کی صورت دی۔کلام کے ساتھ ساتھ خطوط نے اقبالؔ کو زندہ رود بنا ڈالا۔حتیٰ کہ بعض قلم کاروں نے اپنی اقبال مندی کی خاطر اپنے ٹکسال میں مراسلت کے سکے ڈھالے جن پر تحقیق جاری ہے کہ یہ کہاں تک قلب سازی کے مظہر ہیں۔

پنڈت جی نے اپنی بیٹی کے نام خطوط لکھے تو قاضی جی نے لیلی کے خطوط ڈھونڈ نکالے جس کے جواب میں مجنوں کی ڈائری منظر عام پر آئی۔

غرض ادب کا انمول سرمایہ یہی خطوط سمجھے جاتے ہیں۔آج بھی اگر شکسپیئر، غالبؔ یا اقبالؔ کا کوئی خط کہیں سے دستیاب ہو جائے تو ہزاروں ڈالروں اور روپیوں میں اسے تولا جا سکتا ہے۔

کئی رسالوں نے ادیبوں شاعروں کے خطوط پر مبنی نمبر نکالے اور ان کی شخصیت اور ذہنیت سے روشناس کروایا۔کئی ادیب شاعر اپنے خطوط کی وجہ سے سرخ رو ہوئے کئی مشاہیرین نے اپنے ہی قلم سے اپنی قبریں بھی کھودی ہیں۔

آیئے اپنے دور کے ایک مشہور و ممتاز ادیب، شاعر، مفکر کے خطوط کا جائزہ لیں۔

عزیز احمد اردو ادب کی ایک مشہور و ممتاز شخصیت کا نام ہے۔یہ جب جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں زیر تعلیم تھے تب ہی سے شعر و ادب سے وابستگی کا ثبوت دینے لگے تھے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''عزیز احمد ایک جائزہ'' میں لکھا ہے کہ عزیز احمد ۱۱/نومبر ۱۹۱۳ء کو بارہ بنکی میں پیدا ہوئے جب کہ خود عزیز احمد نے اپنے فکر و فن پر ریسرچ کرنے والی شمیم افراقمر کو اپنے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہوئے لکھا کہ وہ ۱۹۱۴ء میں حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے۔

عزیز احمد کی پہچان ایک حیدرآبادی ہی کی طرح قائم رہی۔ان کی ابتدائی تعلیم عثمانیہ ہائی اسکول، عثمان آباد میں ہوئی جو نظام ہفتم میر عثمان علی خاں کے نام پر آباد تھا اور ممالک محروسۂ عالی کا حصہ تھا۔پولیس ایکشن کے

بعد لسانی بنیادوں پر علاقوں کی تقسیم عمل میں آئی تو یہ مقام مہاراشٹرا میں شامل کر دیا گیا۔ ابتدا میں وہ عزیز احمد عثمان آبادی کے نام سے لکھا کرتے تھے۔ پندرہ سال کی عمر میں عزیز احمد کا ایک افسانہ ''کشاکش جذبات'' کے عنوان سے مجلہ مکتبہ حیدر آباد کے نومبر ۱۹۲۹ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ انہوں نے انیس سال کی عمر میں رابندر ناتھ ٹیگور کی ایک کہانی کا ''پجارن'' کے عنوان سے ترجمہ کیا جو ''نیرنگ خیال'' ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا۔ ان کی نظمیں مجلہ عثمانیہ میں شائع ہوئیں۔ انہوں نے کئی افسانے اور مضامین بھی لکھے جو مختلف اخبار و جرائد میں چھپتے رہے۔ چونکہ عثمان آباد بعد میں مہاراشٹرا میں شامل کر دیا گیا تھا، اسی لیے ''مرہٹواڑہ اور اردو افسانہ ایک جائزہ'' پیش کرتے ہوئے عنایت علی نے عزیز احمد کا تفصیلی تعارف کرایا ہے۔ (ملاحظہ ہو مرہٹواڑہ کے اردو افسانے کی ایک انتھالوجی ''مٹی میرے دیار کی'' مرتبہ عنایت علی)، عزیز احمد پچاسوں کتابوں کے مصنف تھے جن میں افسانوں کے پانچ مجموعے (رقص ناتمام، بیکار دن بیکار راتیں، آب حیات، بیٹھی چھری اور کایا پلٹ) اور دس ناول ہوس، مرمر اور خون، گریز، آگ ایسی بلندی ایسی پستی، شبنم، مثلث، تری دلبری کا بھرم، خدنگ جستہ اور جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں (تاریخی ناول) مشہور ہیں۔ ابتدائی دو ناول ہوس اور مرمر اور خون کو خود عزیز احمد اپنے کمزور ناول سمجھتے تھے۔ تاہم ''ہوس'' کا دیباچہ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے لکھا۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے زیر نگرانی نکلنے والے رسالے ''سیاسیات'' میں عزیز احمد سیاسی اور تاریخی نوعیت کے مضامین لکھا کرتے تھے۔ اقبال فہمی کے سلسلے میں ''اقبال نئی تشکیل'' عزیز احمد کو ماہرین اقبال میں شمار کراتی ہے۔ عزیز احمد کی تحریریں ہندو پاک کے معیاری رسائل میں شائع ہوتی تھیں جیسے سویرا، ہمایوں، ادبی دنیا، نقوش وغیرہ ان کے ناول ''ایسی بلندی ایسی پستی'' کا انگریزی ترجمہ The Shore & Waves کے نام سے رالف رسل نے کیا۔ جو لندن سے چھپا۔

عزیز احمد صرف فکشن ہی میں ممتاز نہ تھے بلکہ وہ ایک کامیاب منفرد شاعر بھی تھے۔ ان کی طویل ڈرامائی نظمیں ''ماہ لقا''۔ عمر خیام، فردوس بر روئے زمیں، سنوریتا اور آخری دور کی درد ناک غزلیں (جب وہ کینسر (سرطان) کے شکار موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا تھے) ''صیدتن و شکنجہ خرچنگ دوستو'' میں اور آخر کار ۱۶ ردسمبر ۱۹۷۸ء کو چونسٹھ برس کی عمر میں وہ اس کشاکش زندگی سے آزاد ہو گئے۔

عزیز احمد نے بڑی خوش حال زندگی گزاری۔ جامعہ عثمانیہ سے جب بی اے میں امتیازی حیثیت سے ساری یونیورسٹی کا نام روشن کیا تو سرکاری وظیفے پر اعلیٰ تعلیم کے لیے انہیں لندن بھیجا گیا جہاں سے انگریزی ادب میں بی۔ اے آنرز ۱۹۳۸ء میں کامیاب کر کے لوٹے تو عثمانیہ یونیورسٹی میں لکچرر کی حیثیت سے ان کا تقرر عمل میں آیا۔ ۱۹۴۱ء تک انگریزی کے لکچرر رہنے کے بعد وہ شہزادی درشہوار کے پرائیویٹ سکریٹری بنائے گا۔ یہ خدمت انہوں نے ۱۹۴۶ء تک انجام دی۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے مسائل اور پھر پولیس ایکشن کے اثرات نے انہیں پاکستان پہنچا دیا جس میں ان کے ناول ''ایسی بلندی ایسی پستی'' کا دخل بھی سمجھا جاتا ہے۔ ۱۹۴۸ء میں وہ حکومت پاکستان کے محکمہ مطبوعات و فلم سازی Department of Advertising, Films & Publications میں پہلے اسسٹنٹ ڈائریکٹر، ڈپٹی ڈائریکٹر اور پھر ۱۹۵۳ء میں ڈائریکٹر ہو گئے۔ ۱۹۵۷ء میں لندن یونیورسٹی میں اردو

کے لکچرر کے طور پر بلائے گئے اور ۱۹۶۲ء تک وہ خدمت انجام دیتے رہے ۱۹۶۲ء میں ٹورنٹو کینڈا میں اسلامیات کے اسوسئیٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۸ء میں پروفیسر ہو گئے۔

انھوں نے انگریزی میں بھی کئی کتابیں لکھیں۔ خاص طور پر سسلی کی تاریخ لکھنے پر انہیں انعام واکرام سے بھی نوازا گیا۔ ان کی ہمہ جہت علمی حیثیت کے اعتراف میں لندن یونیورسٹی نے انہیں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی تھی۔

ادھر اختر اورینوی کی زیرنگرانی شمیم افزا قمر نے عزیز احمد کی ناول نگاری پر مقالہ لکھ کر ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔

عزیز احمد کے کارناموں کی فہرست بہت طویل ہے۔ انہوں نے زندگی کے ایک ایک لمحے کی اہمیت محسوس کی۔ جم کر لکھا اور خوب لکھا۔ اس مضمون میں ان کی ذہانت اور ذہنیت کی ایک ہلکی سی جھلک دکھانے کی کوشش کی گئی ہے ''ایسی بلندی ایسی پستی'' کے خالق کے نشیب وفراز کی داستان ان کے خطوط سے جھانکتی دکھائی دیتی ہے جو انہوں نے مدیر ''نقوش'' محمد طفیل کے نام لکھے ہیں۔

''نقوش'' کوئی سرکاری رسالہ نہیں تھا اس کے باوجود وہ اپنے لکھنے والوں کو ان کی تحریروں کا معاوضہ بھی پیش کرتا تھا۔ ویسے ''نقوش'' ایسا معیاری رسالہ تھا کہ لکھنے والے اس میں اپنی تخلیقات کے چھپ جانے ہی کو بہت بڑا انعام سمجھتے تھے۔ نقوش کے معیاری ضخیم نمبر تاریخی ودستاویزی حیثیت کے حامل شمار ہوتے ہیں جیسے ادبی معرکے نمبر، رسول نمبر، خطوط وغیرہ وغیرہ خود محمد طفیل نے ''جناب'' اور ''صاحب'' کے عنوان سے اہم شخصیات پر دلچسپ خاکے بھی لکھے ہیں۔

عزیز احمد نے مدیر ''نقوش'' سے اپنی تحریروں کے معاوضے کے سلسلے میں جو سودے بازی کی ہے وہ چونکاتی ہے۔''

محمد طفیل نے ادارہ ''نقوش'' سے مشہور ناول ''امراؤ جان ادا'' چھاپا تھا۔ دراصل انہوں نے ''سلسلہ روح ادب'' کے تحت کلاسیکی ادبی سرمائے کی نشاۃ ثانیہ کا بیڑہ اٹھایا تھا جو کافی مقبول ہوا۔

عزیز احمد لکھتے ہیں:

> ''بہرحال آپ نے یہ سلسلہ شروع کر دیا ہے تو اردو ادب پر بڑا احسان کیا ہے۔ اسے 'WORLD'S CLASSIC' کی طرح جاری رکھئے۔ ایک اور بڑا بے مثل ناول ''نشتر'' ہے جو امراؤ جان ادا سے بھی پہلے لکھا گیا اور جس کا شمار اردو کے بہترین ناولوں میں کیا جا سکتا ہے۔ آپ کہیں تو اُسے EDIT کر کے مقدمے کے ساتھ آپ کے پاس بھیج دوں۔ مقدمہ، EDITING وغیرہ کا جملہ معاوضہ مجھے دو سو روپے Rs.200/- دینا ہوگا جو ایسا زیادہ نہیں ہے۔''

اور بھی اس سلسلے میں کیا پروگرام ہے؟

اگر میں کوئی مدد کر سکتا ہوں تو حاضر ہوں۔

فقط عزیز احمد

(خط مورخہ ۲۶ فروری ۱۹۵۰ء) خطوط نمبر ''تحقیق نامہ''

''تحقیق نامہ'' معاصرین کے مکاتیب (مدیر ''نقوش'' محمد طفیل کے نام) خصوصی شمارہ ۰۶۔۲۰۰۵ء شعبۂ اردو جی۔سی یونیورسٹی لاہور۔

اس عرصے میں عزیز احمد کا ایک مضمون اور ایک افسانہ ''نقوش'' میں شائع ہوا تھا۔ مگر محمد طفیل صاحب کی طرف سے ان کا معاوضہ بھیجنے میں تاخیر ہوگئی تھی۔ چنانچہ کراچی سے عزیز احمد انہیں لکھتے ہیں:

مکرمی جناب طفیل صاحب

آپ نے اب تک مضمون وغیرہ کے معاوضے کے -/Rs. 65 روپے نہیں بھیجے۔

''نشتر''۔ پر میں نے کام شروع کر دیا ہے۔ دو ہفتے میں آپ کے پاس بھیج دوں گا۔ فقط عزیز احمد

(خط مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۵۰ء)

اس دوران عزیز احمد کا تبادلہ کراچی سے راولپنڈی ہوگیا۔ وہاں سے انہوں نے مدیر ''نقوش'' کے نام خط لکھا:

مکرمی طفیل صاحب تسلیمات

نقوش کا نیا پرچہ دیکھنے کو ملا۔ خود مجھے نہیں ملا۔ شاید اس لیے کہ میں تبادلہ ہو کے راولپنڈی آگیا ہوں۔ ایک پرچہ روانہ فرمائیں اور نیز معاوضہ چالیس -/40 روپے بھی..........

''نشتر مع اصلاح و دیباچہ کب تک مطلوب ہے تحریر فرمایئے۔

فقط عزیز احمد

(خط مورخہ ۱۷ جولائی ۱۹۵۰ء)

اپنی تحریر کے معاوضے کے لیے وہ اس قدر اتاؤلے ہو رہے تھے کہ پانچ دن بعد اک اور خط لکھا:

مکرمی جناب طفیل صاحب تسلیمات عرض ہے

گرامی نامہ ملا۔ براہ کرم آپ چالیس -/40 روپیہ مجھے خود براہ راست فوراً بھیج دیجئے۔ آپ کے کراچی کے آفس کو میرا پتہ نہیں معلوم ہے۔ اس کے علاوہ میں معاوضے میں تاخیر نہیں چاہتا۔ میرا دوسرا افسانہ ''آخر کار'' آپ بلا معاوضہ قطعاً نہیں شائع کر سکتے۔ میں اتنی رعایت کر سکتا ہوں کہ بجائے چالیس -/40 کے اس کا معاوضہ آپ سے تیس -/30 روپیہ لوں۔ اس سے زیادہ رعایت نہیں ہو سکتی۔ یہ منظور نہ ہو تو افسانہ مجھے فوراً واپس بھیج دیں۔ تقاضہ اور تکرار خوشگوار چیز نہیں۔

''نشتر'' عنقریب تیار ہو جائے گی۔ مگر یہی خیال رہے کہ اس کا معاوضہ فوراً مل جائے''

فقط عزیز احمد

(خط مورخہ ۲۱ جولائی ۱۹۵۰ء)

ادبی دنیا میں ''نقوش'' کا معیار و مرتبہ مسلمہ تھا۔ محمد طفیل کی اپنی ادبی شناخت بھی مسلمہ تھی۔ انہوں نے عزیز

احمد کے افسانے کا معاوضہ ادا کرتے ہوئے ان کا دوسرا افسانہ واپس کر دیا۔ اور ''نشتر'' شائع کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ تب شاید عزیز احمد کو کچھ احساسِ زیاں ہوا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

مکرمی جناب محمد طفیل صاحب تسلیمات

چالیس -/40 روپیہ اور '' آخر کار'' کا مسودہ واپس مل گئے۔ بہت بہت شکریہ ''نشتر'' کی حد تک مجھے حیرت ضرور ہوئی لیکن جو آپ کی مرضی۔ اس کا شائع ہو جانا ہی میرے لیے ایک طرح کا انعام اور معاوضہ ہے۔ اس کا دیباچہ میں لکھ چکا تھا۔ لیکن خیر۔ اور کوئی کام اگر میرے لائق ہو تو پس و پیش نہ کیجئے گا۔ معاوضہ کا معاملہ البتہ بالکل کاروبار قسم کا ہونا چاہئے۔'' فقط عزیز احمد

(خط مورخہ ۱۰ راگست ۱۹۵۰ء)

اسی زمانے میں جلال الدین احمد تین نئے ناول کے عنوان سے قسط وار ایک ایک ناول کا تفصیلی جائزہ لے رہے تھے جس کی دوسری قسط قرۃ العین حیدر کے ناول ''میرے بھی صنم خانے'' (مطبوعہ مکتبہ جدید لاہور ۱۹۴۹ء) پر مشتمل تھی جو ''نقوش'' کے سالنامہ (دسمبر ۱۹۵۰ء) میں شائع ہوئی۔ تیسری قسط، اعلان کے مطابق عزیز احمد کے ناول ''ایسی بلندی ایسی پستی'' پر شائع ہونے والی تھی۔ چنانچہ عزیز احمد نے محمد طفیل کو لکھا:

جناب طفیل صاحب السلام علیکم

نقوش کا سالنامہ ملا۔ بہت پسند آیا۔ آپ کو اور وقار صاحب کو مبارک ہو۔ احمد ندیم قاسمی کی کہانی بہت خوب ہے۔ میرے خیال میں تو یہ ان کی بہترین کہانی ہے۔ نقوش کا اس طرح ناغہ نہ کیا کیجئے۔ پابندی سے شائع ہو تو رسالہ کا مارکیٹ بندھا ہوا رہتا ہے۔ اور کوئی خدمت میرے لائق ہو تو تحریر فرمائیں۔

''نقوش'' کے آئندہ نمبر میں جلال الدین احمد کے مضمون کی تیسری قسط کا انتظار رہے گا جو غالباً میرے ناول پر ہے۔ فقط عزیز احمد

(خط جنوری ۱۹۵۱ء)

اس سالنامے کے بعد محمد طفیل ''نقوش'' کا ایک ''ناولٹ نمبر'' شائع کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے عزیز احمد سے بھی لکھنے کی فرمائش کی۔ جواباً عزیز احمد نے جو شرائط پیش کیں وہ ان کے مزاج کی عکاسی کرتے ہیں:

مکرمی و محبی جناب محمد طفیل صاحب۔ تسلیمات عرض

میں ضرور آپ کے ناولٹ نمبر کے لیے ایک طویل مختصر افسانہ لکھنے کو تیار ہوں بشرطیکہ:

۱۔ اس کی ''ضخامت نقوش'' کے تیس صفحے کے لگ بھگ ہوگی نہ کہ ساٹھ صفحے۔ نقوش کے ساٹھ صفحے چھوٹی تقطیع (کذا) کے ۱۲۰ صفحوں سے بھی زیادہ ہو جائیں گے جن کا معاوضہ عام طور پر ہزار روپے ملا کرتا ہے۔

۲۔ اس کو آپ نقوش میں تو شائع کر سکیں گے۔ نقوش ہی کے دوسرے ایڈیشن میں بھی اسے شامل کر سکیں گے لیکن اسے کتابی صورت میں نہ شائع کر سکیں گے۔

۳۔ اس کا معاوضہ دو سو روپے -/200 مسودہ ملتے ہی مجھے ارسال فرما دیں گے۔

اگر یہ منظور ہو تو فروری کے ختم تک انشاء اللہ طویل مختصر افسانہ یا ناولٹ بھیج دوں گا......فقط عزیز احمد

(خط مورخہ ۲۵؍جنوری ۱۹۵۱ء)

مدیر ''نقوش'' نے ناولٹ کے لیے دوسو روپے -/200 ادا کرنے کی حامی بھر لی تھی مگر نقوش کے تیس صفحات کے بجائے ساٹھ صفحات پر مشتمل ناولٹ پر اصرار کیا تھا۔ چنانچہ عزیز احمد انہیں خط لکھتے ہوئے تیقن دلاتے ہیں:

''ناولچہ میں ضرور لکھ دوں گا اور کوشش کروں گا کہ پچاس ساٹھ صفحے کا ہو مگر اس کا معاوضہ وہی ہوگا جو آپ خود متعین کر چکے ہیں یعنی محض نقوش کے ایک یا ایک سے زیادہ ایڈیشن کے لیے دوسو روپے -/200 اس میں کمی کا امکان نہیں۔

اور کوئی خدمت......فقط......عزیز احمد

(خط مورخہ ۳۰؍جنوری ۱۹۵۱ء)

شاید اس دوران مدیر نقوش کی طرف سے یاددہانی کرائی گئی تھی۔ عزیز احمد نے بڑے دوٹوک انداز میں محمد طفیل صاحب کو خط لکھا:

مکرمی و محبی طفیل صاحب سلام علیکم۔

گرامی نامہ کا شکریہ۔ آپ کو ناولٹ ''نقوش'' کے لیے مل جائے گی اور مجھے دوسو روپیہ معاوضہ جو خود آپ کا تجویز کیا ہوا ہے۔ اس لیے بحث ختم ناولٹ نمبر ہی میں جلال الدین احمد کے بقیہ مضمون کو بھی شامل فرما دیجئے جو ''ایسی بلندی ایسی پستی'' پر ہے۔ اور سب خیریت ہے۔ فقط عزیز احمد

(خط مورخہ ۶؍فروری ۱۹۵۱ء)

مگر اپریل ۱۹۵۱ء تک بھی عزیز احمد ناولٹ لکھ نہ سکے۔ حالانکہ ۲۵؍جنوری ۱۹۵۱ء کے اپنے خط میں اپنی شرائط پیش کرتے ہوئے انہوں نے فروری کے ختم تک ناولٹ بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔ اب وہ محمد طفیل کو لکھتے ہیں:

مکرمی و محترمی طفیل صاحب

گرامی نامہ کا شکریہ۔ ناولچہ نہ بھیج سکنے کا افسوس ہے لیکن میں نے آپ سے حتمی وعدہ تو نہیں کیا تھا۔ کوشش کرنے کے لیے لکھا تھا۔ باوجود کوشش کے میں اس کی تکمیل نہ کر سکا اور نہ مستقبل قریب میں اس کے مکمل ہو سکنے کی کوئی توقع ہے۔ بتایئے میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں نے کوشش تو بہت کی کہ آپ کی فرمائش کی تکمیل کروں۔ لیکن کام کی چیز لکھنے کے لیے وقت درکار ہے اور وقت آپ نے ہمیشہ بہت کم دیا۔ اگر آپ نے بجائے آخر فروری کے مجھے آخر اپریل تک شروع ہی میں مہلت دی ہوتی تو بہت اچھا ناولٹ اب تک تیار ہو گیا ہوتا۔ اب آپ کا جی چاہے تو میرا انتظار کئے بغیر ناولٹ نمبر شائع کر دیں۔ یا مجھے کم از کم ایک ماہ کی مہلت دیں......مخلص......عزیز احمد

(اس خط پر تاریخ درج نہیں ہے مگر قرائن سے یہ اوائل اپریل ۱۹۵۱ء کا لگتا ہے)

مئی ۱۹۵۱ء میں ''نقوش'' کا ناولٹ نمبر شائع ہو گیا۔ رقمی معاوضے کے علاوہ اب عزیز احمد اس پر اصرار کرنے لگے کہ ان کے ناول کے بارے میں جلال الدین احمد کا لکھا ہوا مضمون ''نقوش'' میں شائع کیا جائے۔ ان کا

ایک خط بڑا حیران کن ہے:

مکرمی ومحبی طفیل صاحب تسلیمات عرض

.......آپ سے ایک چھوٹی سی شکایت بھی ہے جلال الدین احمد کے مضمون ''تین نئے ناول'' کے دو حصے تو آپ نے شائع کیے لیکن تیسرا حصہ جو ''ایسی بلندی ایسی پستی'' کے متعلق تھا آپ نے اب تک شائع نہیں کیا۔ اس ناراضی کا باعث کیا ہے؟ یہ حصہ شائع ہولے تو پھر میں بھی ''نقوش'' کے لیے کچھ لکھوں گا اور پہلی چیز جو میں آپ کے لیے لکھوں گا بلا معاوضہ ہوگی لیکن اس کے لیے مجھے جلال الدین کے مضمون کا انتظار رہے گا جنہیں خود شکایت ہے.......کم ترین.......عزیز احمد (خط مورخہ ۶رجنوری ۱۹۵۲ء)

اس عرصے تک عزیز احمد نے ''نقوش'' کے لیے کچھ نہیں لکھا۔ ایسا لگتا ہے اندر اندر وہ مدیر ''نقوش'' سے خفا خفا سے تھے۔ ان کی فرمائش کے جواب میں وہ لکھتے ہیں:

مکرمی ومحبی جناب طفیل صاحب.............السلام علیکم

آپ کے دو خط ملے ایک شکایت کا دوسرا میرے خط کے جواب میں۔

میں آپ کو مضمون یا افسانہ ضرور بھیجوں گا۔ اس کا حتمی وعدہ کرتا ہوں لیکن اس شرط پر کہ پہلے آپ ''ایسی بلندی ایسی پستی'' پر جلال الدین احمد والا مضمون شائع کریں۔ آخر آپ نے مجھ سے یہ امتیاز کیوں برتا؟ اگر مجھ سے ''نقوش'' کے لیے لکھنے میں تاخیر ہوئی تو احسن فاروقی اور قرۃ العین نے اتنا بھی نہیں لکھا جتنا میں نے لکھا۔ اگر آپ اب تک ''نقوش'' کے لیے کچھ نہ بھیجنے کی وجہ پوچھتے ہیں تو عرض یہ ہے کہ وجہ محض یہی تھی کہ آپ نے ایک مضمون کا محض وہ حصہ شائع کرنے سے اجتناب کیا جو مجھ سے متعلق تھا اور یہ تضاد میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ایک طرف تو مجھ سے مضمون کا تقاضہ اور اخلاص کا دعویٰ اور دوسرے میرے ہی خلاف ایسا امتیازی سلوک!

اس لیے میں آپ کو ایک نہیں کئی مضامین یا افسانے بھیجنے کو تیار ہوں جن میں سے صرف پہلا بلا معاوضہ ہوگا لیکن اگر آپ کو اپنے اخلاص کا دعویٰ سچا نظر آتا ہے تو آپ کو بھی میرے خلاف یہ قدم نہیں اٹھانا چاہئے تھا اور اب یہی صورت ہوسکتی ہے کہ پہلے آپ ''ایسی بلندی ایسی پستی'' والا مضمون شائع فرمائیں۔ میں اس کو پڑھ لوں۔ اس کے بعد شمارے کے لیے افسانہ یا مضمون بھیجنے کا میرا حتمی اور پکا وعدہ ہے۔ مجھے نقوش سے کوئی بیر نہیں۔ ہمدردی ہے کیونکہ آپ اس ناموافق زمانے میں اتنی گراں قدر ادبی خدمت انجام دے رہے ہیں......

مخلص......عزیز احمد

(خط مورخہ فروری ۱۹۵۲ء)

عزیز احمد حکومت پاکستان کے Department of Advertising, Films & Publications میں ڈپٹی ڈائریکٹر اور پھر ڈائریکٹر ہوگئے تھے ۱۹۵۰ء میں یعنی آج سے ساٹھ برس پہلے کے تیس چالیس روپے آج کے تیس چالیس ہزار روپیوں کے برابر تھے۔ ایک ناولٹ کے لیے عزیز احمد کا دو سو روپے طلب کرنا گویا دو لاکھ روپے کا مطالبہ کرنا ہے۔ مدیر ''نقوش'' کی ہمت کی داد دینی پڑتی ہے کہ وہ اپنے لکھنے والوں کو

ایسی کثیر رقم بطور معاوضہ دینے پر قادر تھے۔

عزیز احمد کو روپے پیسے کی کبھی کمی نہیں رہی۔ حیدرآباد میں وہ بادشاہ کی بہو درشہوار کے پرائیویٹ سکریٹری رہے جو بہت باعزت منصب تھا۔ پاکستان میں بھی وہ اہم عہدوں پر اچھے خاصے مشاہرے کے حامل رہے۔ اس کے باوجود وہ اگر مدیر نقوش سے سودے بازی کرتے دکھائی دیتے ہیں تو دراصل وہ اپنے قلم کی اہمیت جتانا چاہتے تھے۔

اشاریات

۱۔ ''تحقیق نامہ'' معاصرین کے مکاتیب۔ (مدیر نقوش: محمد طفیل کے نام) خصوصی شمارہ ۰۶۔۲۰۰۵ء شعبہ اردو جی۔سی۔ یونیورسٹی لاہور)

۲۔ مٹی مرے دیار کی'...... مرتبہ عنایت علی۔ دارالمصنفین۔ اورنگ آباد۔ مارچ ۲۰۰۱ء ۲۰۰۹ء

۳۔ ''سوغات'' نمبر ۶ بنگلور (مدیر: محمود ایاز) مارچ ۱۹۹۴ء

☆☆☆

ڈاکٹر منور حسن کمال

سیکولرزم اور کیفی اعظمی

اردو شاعری کا مزاج وخمیر اس کے آغاز سے ہی سیکولر کردار کا حامل رہا ہے، سیکولر عناصر شروع سے ہی اس کے رگ و پے میں سرایت کرتے گئے، جو اس کے ارتقا کے ساتھ ساتھ مزید مضبوط و مستحکم بنیادوں پر استوار ہوئے۔اردو شاعری کے آغاز وارتقا کی مکمل تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ فرقہ واریت اور مذہبی تعصب سے اس کا دامن کبھی داغ دار یا آلودہ نہیں ہوا۔اس کی پیشانی مندر و مسجد دونوں جگہوں پر سجدہ ریز ہوتی رہی۔اس کو کفر و اسلام سے کوئی سروکار نہیں رہا۔اگر ایک طرف اردو شاعری کا دامن خوب سیرت اور روح کو سرشار کرنے والی نعت ومنقبت سے مالا مال ہے تو دوسری طرف بھجن و کیرتن سے بھی اس کی گود خالی نہیں ہے۔رواداری، فراخ دلی اور وسیع المشربی ہمیشہ اردو شاعری کا شیوہ رہی ہے۔انسانی سماج میں نفرتوں کے بیج بونے والوں کے گھناؤنے کردار کو اجاگر کرنا اس کا مقصد رہا ہے۔انسان کو عظمت انسان کے اشلوک پڑھانا اس کی سرشت میں داخل ہے۔

اسی طرح لسانی نقطۂ نظر سے اردو شاعری اپنے تمام تر قولی، بصری اور سمعی اختلافات کے باوجود سیکولر ہی رہی ہے۔گیارہویں صدی عیسوی میں برصغیر ہند میں مسلمانوں کی آمد کے بعد سنسکرت، عربی اور فارسی الفاظ کی آمیزش نے اس کو ابتداءً "ہندی" نام دیا۔اس سلسلے میں ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

"شمال سے آنے والے مسلمانوں کی زبان فارسی تھی، جب یہ فارسی ہندی سے آ کر ملی، وادی سندھ کی بولنے کی زبان ایک بار پھر "اپ بھرنش" میں تبدیل ہو گئی۔اور اس میں ہندی کے پہلو بہ پہلو فارسی اور عربی کے الفاظ بھی نظر آنے لگے۔"
اردو شاعری کا مزاج ص ۱۸۱۔ڈاکٹر وزیر آغا

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو اپنے آغاز سے ہی سیکولر رہی، اس لیے کہ وہ زبان جس کو ہندی نام دیا گیا تھا، فارسی اور عربی کے الفاظ کو اپنے اندر سموتی گئی۔یہی زبان ترقی کرتے ہوئے اردو کہلائی۔

اردو شاعری کے سیکولر کردار کی روشنی میں جب ہم ترقی پسند شاعروں میں ممتاز شخصیت کے حامل سید اطہر حسین بہ تخلص کیفی اعظمی (۱۹۱۸۔۲۰۰۲) کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں سیکولر روایتیں اپنی واضح شکل میں سامنے آتی ہیں۔"نہرو" نظم میں سیکولر انداز دیکھیے:

وہ ہمیشہ ادا سب سے پہلے شہید
سب سے پہلے وہ سولی پہ چڑھتا رہا
خون میں وید گونجے ہوئے

اور جبیں پر فروزاں اذاں
اور سینے پہ رقصاں صلیب

شہادت پانا، سولی پر چڑھنا، خون میں وید گونجنا، جبیں پر اذان کا فروزاں ہونا اور سینے پر صلیب کا رقصاں ہونا ان سیکولر اور مذہبی روایتوں کی جانب اشارہ ہے، جو قومی یکجہتی کی تابندہ امثال ہیں۔

''دائرہ'' میں کیفی اعظمی اس طرح مخاطب ہیں۔

اپنے ہاتھوں کو پڑھا کرتا ہوں
کبھی قرآں ، کبھی گیتا کی طرح
چند ریکھاؤں میں سیماؤں میں
زندگی قید ہے سیتا کی طرح

یہاں گیتا اور قرآن کو ایک ساتھ رقم کرنا سیکولر شاعری ہے۔ کیفی اعظمی نے جنھیں خوب صورت استعاروں کی جگہ استعمال کیا ہے۔

علی رفاد فتیحی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ترقی پسند ادیبوں کی تخلیقات اشتراکی فکر و فلسفہ کی ترجمان ہیں۔ ان کی یہ ترجمانی سماجی تفکرات کی روشنی میں ابھر کر سامنے آتی ہے۔ اسلوبیاتی تنقید: ص ۱۵۷، علی رفاد فتیحی)

ترقی پسندوں کا یہ اسلوب فطری شاعری سے ذرا ہٹ کر ہے۔ ان کے ہاں سیکولر روایتیں جا بہ جا نظر آتی ہیں۔ حالاں کہ فطری شاعری یعنی غزل اپنے بنیادی ماخذ کے ساتھ ہے لیکن کیفی اعظمی اور ان کی قبیل کے دوسرے شعرا نے اس میں بھی سیکولر مزاج ڈھونڈ نکالا۔ غزل کو نظم کا لباس پہنایا۔

کیفی اعظمی کی ایک مثنوی خانہ جنگی ہے یہ مثنوی سیکولر روایات اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی برقرار رکھنے کی دعوت فکر دیتی ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے لکھا ہے کہ اس مثنوی میں ابنائے وطن کو فرقہ وارانہ فسادات سے باز رکھنے کی کیفی اعظمی نے بھرپور کوشش کی ہے۔

فطرت شری میں فساد نہیں
رہزنی داخل جہاد نہیں
گیت گا کر مہاتما جی کے
پیٹ ماؤں کے چاک کر ڈالے

اسی نظم میں آگے شاعر اپنی سیکولر روایات کا آئینہ اس طرح پیش کرتا ہے۔

لاش علم و ادب کی، حکمت کی
لاش کلچر کی آدمیت کی
لاش سوراج کی، خلافت کی
لاش ہر جہد ہر بغاوت کی

لو محمد علی کی لاش ہے یہ
لو تلک سے بلی کی لاش ہے یہ
لو بھگت سنگھ سے جواں کی لاش ہے یہ

ایک طرف وہ اسلامی شریعت کا حوالہ دیتے ہیں کہ وہاں فساد اور رہزنی جہاد میں شامل نہیں، دوسری طرف ان پر بھی نشانہ باندھتے ہیں کہ مہاتما جی کے گیت گاتے ہوئے وہ کس طرح ماؤں کے پیٹ چاک کر ڈالتے ہیں۔ اس میں لطیف اشارہ اس بات کی جانب بھی ہے کہ مہاتما جی اہنسا کے پجاری تھے۔ خلافت، بغاوت، سوراج اپنے تمام تر مفاہیم کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ اسی طرح کیفی کی نظم "زندگی" میں سیکولر عناصر جگہ پاتے ہیں:

زندگی کہنے کو بے مایہ سہی
غم کا سرمایہ سہی
میں نے اس کے لیے کیا کیا نہ کیا
کبھی آسانی سے اک سانس بھی یم راج کو اپنا نہ دیا

سوم رس میں نے پیا
رات دن رقص کیا
ناچتے ناچتے تلوے مرے خوں دینے لگے
میرے اعضا کی تھکن
بن گئی کانپتے ہونٹوں پہ بھجن
ہڈیاں میری چٹخنے لگیں ایندھن کی طرح
منتر ہونٹوں سے ٹپکنے لگے روغن کی طرح
اگنی ماتا مری اگنی ماتا
سوکھی لکڑی کے یہ بھاری کندے
جو تری بھینٹ کو لے آیا ہوں
ان کو سویکار کر اور ایسے دھدھک
کہ مچلنے شعلے
کھینچ لیں جوش میں سورج کی سنہری زلفیں
آگ میں آگ ملے
جو امر کر دے تجھے
ایسا کوئی راگ ملے

اگنی ماں سے بھی نہ جینے کی سند جب پائی
زندگی کے نئے امکان نے لی انگڑائی
دفعتاً دور سے کانوں میں یہ آواز آئی

بدھم شرنم گاچھامی
دھمم شرنم گاچھامی
سنگھم شرنم گاچھامی

آ رہا تھا میں کئی کوچوں سے ٹھوکر کھا کر
ایک آواز نے روکا مجھ کو
کسی مینار سے نیچے آ کر
اللہ اکبر، اللہ اکبر
ہوا دل کو یہ گمان
کہ یہ پُر جوش اذاں
موت سے دے گی اماں
پھر تو میں پہنچا جہاں
میں نے دہرائی کچھ ایسے یہ اذاں

گونج اٹھا سارا جہاں
اللہ اکبر، اللہ اکبر
اسی آواز میں ایک اور بھی گونجا اعلان

کل من علیها فان

یہ بہت طویل نظم ہے۔اس نظم میں ''یمراج'' ''سوم رس'' ''بھجن'' ''منتر'' ''اگنی ماتا'' ''مینار'' ''اللہ اکبر'' ''اذان'' ''امان'' کل من علیہا فان۔ ہندو مسلم اتحاد، قومی یکجہتی اور سیکولر روایات کے وہ استعارے ہیں جنہیں ساتھ ساتھ پیش کر کے کیفی اعظمی نے سیکولر اقدار کی ترجمانی کی ہے۔

کیفی اعظمی تقسیم کے خلاف تھے، چاہے قوموں کی تقسیم ہو یا طبقاتی نظام کی تقسیم۔ان کے خلاف انہوں نے مسلسل احتجاج کیا اور سیکولر روایات کی پاسبانی کرتے رہے۔انہوں نے بار ہا اپنی شاعری میں انسانی مساوات کا درس دیا۔وہ یہی دعوت فکر دیتے رہے۔سماجی استحصال سے گریز کی دعوت دینا انہوں نے اپنا مشن بنالیا تھا۔کیفی اعظمی نے جو تجربے کئے اس سے ان کے ادراک شعری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ان کے ہاں بے حسی نہیں پائی

جاتی۔ وہ اپنی سیکولر مزاج کی چھاپ ہر جگہ چھوڑتے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے سیکولر مزاجی سے اردو شاعری کو مالا مال کیا ہے۔ اردو شاعری میں 1960ء کے بعد جو نئے ابعاد، سماجی عناصر اور سیکولر روایتیں نظر آتی ہیں، انہیں نیا پیراہن عطا کرنے میں کیفی اعظمی کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔

سیکولر روایات کے اسی تانے بانے میں کیفی اعظمی نے بعض قابل اعتراض باتیں بھی کہہ ڈالی۔ مثلاً آوارہ سجدے میں انہوں نے صفاتِ ربانی پر قلم اٹھایا اور انہیں نامکمل اور ناقص قرار دیا۔ جس پر انہیں خوب لعن طعن کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ ایک اچھے شاعر تھے، لیکن مذکورہ نظم میں اس کا رخ غلط سمت میں موڑ کر کیفی نے بہت بڑی فکری غلطی کی جس کا انہیں خمیازہ بھی بھگتنا پڑا، ایک عرصہ تک خاموش رہے، فراموش کردیے گئے، فلمی دنیا میں زندگی تلاش کرتے رہے۔ اپنی شاعری کا رخ اس طرف بھی موڑا۔ خوب صورت لفظوں کی صناعی سے نئے بت تراشے۔ ''تصور'' کیفی کی ایک ایسی ہی نظم ہے:

یہ جسم نازک یہ نرم بانہیں، حسیں گردن، سڈول بازو شگفتہ چہرہ، سلونی رنگت، گھنیرا
جوڑا، سیاہ گیسو نشیلی آنکھیں، رسیلی چتون، دراز پلکیں، مہین ابرو تمام شوخی، تمام بجلی،
تمام مستی، تمام جادو۔

یہ الفاظ کا زیر و بم، یہ کانوں کو لبھانے والی گھن گرج بھی کیفی کا طرہ امتیاز رہی ہے، ''خانہ جنگی'' میں بھی ان کا قلم ایک جگہ ایسی ہی جلوہ سامانیاں بکھیرتا نظر آتا ہے:

انکھڑیوں کا سرور چھین لیا
عصمتوں کا غرور چھین لیا
عارضوں کے گلاب توڑ لئے
ماہتاب آفتاب توڑ لئے

سطور بالا میں جن علامتی الفاظ اور فکر و سخن کے پھوٹتے سوتوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان کے لطیف پردوں میں اردو شاعری کی سیکولر روایات کا نور مختلف انداز سے چھنتا نظر آتا ہے۔ اگر بعض جگہ اجنبی الفاظ و علامتیں نظر آتی ہیں تو شاعر کی بلندی فکر کی دین ہیں۔ لیکن اکثر علامتیں اور استعارے ہمارے دیکھے بھالے ہیں، ہمارے اردگرد جابہ جا بکھرے پڑے ہیں۔ انہیں سمیٹ کر کیفی اعظمی نے جس انداز سے پیش کیا ہے یہ ان کی ذہانت پر دال ہے۔ اگر ''آوارہ سجدے'' کو ایک طرف رکھ دیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے اسلامی تلمیحات اور ہندو مذہبی تلمیحات کو برابر استعمال کیا ہے۔ یہ کیفی اعظمی کا وہ فکری کارنامہ ہے، جو مذہبی حد بندیوں سے بالاتر ہو کر سیکولر نظریے اور رویے کا آئینہ دار ہے، جس نے ان کی شاعری کو استحکام بخشا ہے۔ اور یہ استحکام تادیر ہمارے ادبی سرمائے میں محفوظ رہے گا۔

☆

اردو کے افسانہ نگاروں کو دعوت فکر

اردو کے افسانہ نگاروں سے مجھے 30 مارچ 2010 تک یوتھانیزیا (Euthanasia، لاعلاج مریض کا اپنی مرضی سے موت قبول کرنا) کے موضوع پر کہانیاں درکار ہیں۔ یوتھانیزیا ہماری موجودہ ملٹی نیشنل صارف تہذیب کا وہ دکھتا ہوا موضوع ہے جن پر علمائے کرام (ماہرین سائنس، جینیات، نشریات، نفسیات اور دینیات وغیرہ) کی بحثیں عوام تک پہنچنے میں ناکام رہتی ہیں، کیوں کہ جس جارگن (Jargon یعنی پیشہ ورانہ الفاظ) میں یہ لوگ گفتگو کرتے ہیں وہ عوام کے پلے نہیں پڑتی۔ مزید اس موضوع پر اکثر علما کے نجی مفادات بھی وابستہ ہیں۔ یہ موضوع اب عوام کی زندگی کو براہ راست متاثر کرتا ہے۔ چوں کہ موجودہ دور کی زندگی کی تگ و دو میں علمائے کرام اپنی اپنی اخلاقی یا مذہبی اقدار کے پیش نظر کوئی حتمی راہ پیش کرنے میں مذبذب ہیں عوام میں اضطراب ہے۔ میرے نزدیک جن خیالات کی مدد سے عوام اپنی ذاتی رائے قائم کرنے میں مدد لیتے ہیں، ان کی ترسیل کا ذریعہ کہانیوں سے بہتر کوئی نہیں کیوں کہ کہانیاں ان کے دل کو چھوتی ہیں۔ اس لیے میں اس نازک موضوع پر کہانیوں کا گلدستہ (Anthology) شائع کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے مجھے ایسی کہانیاں درکار ہیں جو:

☆ کمپیوٹر یا ٹائپ مشین پر لکھی ہوئی ہوں۔

☆210x297 میلی میٹر یعنی اے فور (A-4) سائز کے کاغذ پر اور ہر صفحے پر زیادہ سے زیادہ تیس (30) سطریں ہوں۔

☆ طوالت جہاں تک ممکن ہو چار صفحات کی ہو۔

☆ مواد اچھی طرح سے ریسرچ کیا ہوا ہونا چاہیے، یعنی اس کے اخلاقی، نفسیاتی، دیناتی اور طبی پہلو پر کہانی کار کی تحقیقی دیانت دارانہ ہو۔

جن کہانی کاروں کی کہانیاں شائع ہوں گی ان کو کتاب شائع ہونے پر دو عدد نسخے مفت دیے جائیں گے لیکن میں ان کو کہانی لکھنے کا کوئی نقد معاوضہ ادا نہیں کر سکتا۔ کتاب شائع ہونے کے بعد ہر کہانی کار کو اختیار کلی ہوگا کہ کتاب کا حوالہ دے کر وہ اپنی کہانی جہاں چاہیں شائع کروا سکتے ہیں۔

کہانیاں **30 مارچ 2010**ء تک ذیل کے پتے پر بھیجیں۔

Dr. Sifat Alavi, 21 Wimborne Drive, Allerton, Bradford,

West Yorks, BD157AH, UK

یا ان پیج میں ای میل کریں: sifatalavi@hotmail.com

سید اطہر رضا بلگرامی

اقتصادیات کا نظریہ قدر: جائزہ برائے عوام

اُصولِ معاشیات کی تمام مروجہ و مستند کتابوں کا پہلا حصہ جہاں صارفین کے طرزِ عمل (CONSUMER BEHAVIOUR) کی تشریحات ملتی ہیں اُن میں سب سے دلکش تشریح نظریہ قدر (UTILITY) کی ہے جو معاشیات کے روائتی خشک وغیر دلچسپ انداز بیان و تشخیص سے ہٹ کر انسانی اِحساسات و مشاہدات کے قریب لگتی ہے۔ اِکنامکس کی پر پیچ غیر مانوس و مختلف النوع اِصطلاحات سے لبریز اُصولوں کی وضاحتوں کے درمیان نظریہ قدر کی تفصیلات اور اُس سے وابستہ نظریوں کو پڑھئے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انتہائی اُمس میں کہیں سے کوئی فرحت بخش ہوا کا جھونکا آ گیا، بے آب و گیاہ صحرا میں نخلستان نظر آ گیا۔ چلئے آج اِس کی تشریح پڑھئے اور محسوس کیجئے کہ معاشیات کا یہ نظریہ آپ کی زندگی سے کیسا مانوس ہے۔

معاشیات کی کتابوں میں نظریہ قدر کی تشریح بیانیہ انداز میں بھی ہے اور ریاضی و الجبرے کے فارمولے اور جیومیٹری کی خاکے نما تصویروں کی مدد سے بھی ہے۔ میں تکنیکی زبان اپنانے سے قبل بیانیہ انداز اپنا رہا ہوں۔ تا کہ نظریہ قدر معاشیات کے دائرے میں رہتے ہوئے آپ کے قریب رہے اور پھر پڑھتے پڑھتے جب آپ کی فکر میں بالیدگی پیدا ہونے لگے تو پھر ریاضی و الجبرے کی تکنیکی زبان اپنا کر اور جیومیٹری کی پُر پیچ لکیروں میں مقید ہو کر انہیں تشریحات کو زیادہ گمبھیر بنا لیجئے گا۔

پہلا سوال یہ ہے کہ آپ کسی شئے میں کوئی کشش کیوں محسوس کرتے ہیں؟ کیوں کسی شئے کو دیکھتے ہی اُس کے کارآمد ہونے کا احساس کرتے ہیں؟ یا اِس کے برعکس کسی شے میں آپ کوئی کشش محسوس نہیں کرتے، دیکھتے ہی اُس کے بے مصرف ہونے کا احساس کرتے ہیں، کیوں؟ معاشیات میں اِس کا جواب یہ دیا گیا کہ کائنات کی ہر شئے میں اِنسان کی کسی نہ کسی ضرورت کی تسکین کی قوت پوشیدہ ہے اور اِسی باطنی قوت کا احساس انسان میں اُس شئے کے لیے قدر پیدا کرتا ہے، وہ شئے باعث کشش بن جاتی ہے۔ جب تک اِنسان اُس شئے کی اِس صفت یا قوت سے بے خبر رہتا ہے، اُس کے لیے کوئی کشش نہیں پاتا، وہ شئے اُس کے لیے بے قدر و قیمت ہی رہتی ہے۔
معاشیات میں قدر (UTILITY) کو محسوس کرنے کی پہلی و بنیادی شرط یہی ہے کہ کسی شئے میں اِنسان کی کسی نہ کسی ضرورت کی تسکین کی قوت ہو اور اِنسان کو اُس کا علم بھی ہو۔

معاشیات کے دائرے میں قدر کی دوسری اہم شرط/ شناخت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ کمیابی میں اُبھرتی ہے، افراط میں نہیں۔ ہوا، پانی، سورج کی روشنی و اُس کی تمازت سب خدا کے عطیات ہیں اور یہ اتنے قیمتی ہیں کہ اُن پر بنی نوع انسان ہی نہیں، حیوانات، نباتات سبھی کی بقا ٹکی ہوئی ہے۔ اِن کی قدر و افادیت کا تعین بھی مشکل ہے۔ لیکن یہ سب اتنی افراط میں ہیں کہ اِنسان کو اُن کی قدر کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ ذرا اُن کے دائیرے دستیابی کو محدود کر

دیکھئے تو فوری طور پر قدر اُبھر آتی ہے۔ انتہائی حبس و اُمس میں ایک ہلکے سے فرحت بخش ہوا کے جھونکے کی قدر بتلائیے کتنی ہوتی ہے، بے آب و گیاہ صحرا میں بھٹکتے ہوئے مسافر کو کہنیں دور نظر آنے والا تھوڑا سا پانی کا ذخیرہ اُس کی کتنی قدر و منزلت کو بڑھا دیتا ہے، محسوس کیجئے۔ سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں جہاں آکسیجن نہیں ہوئی غوطہ خور کی پشت پر لگا ہوا آکسیجن کا سلنڈر کتنا قیمتی و اہم بن جاتا ہے، غور کیجئے۔ وہ غوطہ خور اپنی نارمل زندگی میں کبھی دھیان بھی نہیں دیتا کہ سانس کی آمد و شد میں آکسیجن کی کیا اہمیت ہے کیونکہ اِفراط اس کا احساس ہی نہیں ہونے دیتی۔ ہاں جہاں آکسیجن کی شدید کمی ہو، وہاں سلنڈر میں بند اُس کی محدود مقدار کی قدر کا احساس کیجئے جو غوطہ خور کی زندگی کی ضمانت ہے۔ یہی صورت ہسپتال میں کسی مریض کے سرہانے لگے آکسیجن سلنڈر کی بھی ہے جہاں محدود مقدار اُس کی زندگی کو قائم رکھنے میں معاون ہو رہی ہے۔ یہاں اُس سے اور اُس کے تیمارداروں سے اُس سلنڈر کی قدر و قیمت پوچھئے۔ یہ مثالیں تو مخصوص ہیں، آپ تو معمولاتِ زندگی میں دیکھئے کہ جس وقت گھریلو اشیاءِ صرف کی تعداد میں افراط ہو جائے، اُن کی قدر گھٹ جاتی ہے اور جب یہی تعداد بہ وجہ استعمال گھٹنے لگے تو بتدریج قدر و منزلت بڑھنے لگی ہے، خرچ میں سلیقہ و تنظیم بھی پیدا ہو جاتا ہے، احتیاط بھی برتی جانے لگتی ہے اور یہ سارے افعال قدر و منزلت کا ہی عکس ہوتے ہیں۔ مریض کی نازک حالت میں بروقت ڈاکٹر کی دستیابی اُس کی قدر کو کتنا بڑھا دیتی ہے، سوچئے۔

معاشیات میں قدر کا اہم رشتہ قیمت سے ہے۔ کسی شئے کو حاصل کرنے کے لیے جو ہم قیمت ادا کرتے ہیں وہ دراصل اُس شئے کی قدر کا پیمانہ ہوتی ہے۔ نایاب ہیرے یا کسی تاریخی نادر و نایاب اشیاء کی انتہائی بلند قیمت اُس کے ''نادر یا نایاب'' ہونے کی قیمت ہے اور صاحب حیثیت اُس کو حاصل کر کے گویا ایک منفرد عظمت وحشمت کے احساس کی تسکین کرتا ہے۔ قیمت کی ادائیگی کی اِستعداد، جس کو ہم قوتِ خرید کہتے ہیں اور جس کو آمدنی کی سطح سے ناپا جاتا ہے، مختلف ہوتی ہے۔ اِس لیے قدر کی نوعتیں بھی جُداگانہ ہوتی ہیں لیکن جداگانہ ہونے کے باوجود مطمین ہونے کی سطح LEVEL OF SATISFACTION مساوی رہتا ہے۔ اگر ایک صاحب حیثیت کے لیے قیمتی کار اُس کو کسی قدر و قیمت کی سطح کا احساس کرا کر مطمئن کرتی ہے تو کسی دوسرے کم صاحب حیثیت شخص کو اُسی قدر و قیمت کا احساس موٹر سائیکل یا محض سائیکل کرا سکتی ہے۔ یہاں قوت خرید کے فرق کے باوجود قدر کی سطح اور نتیجتاً مطمین ہونے کی سطح LEVEL OF SATISFACTION مساوی ہوگی۔ ایک کروڑ پتی کے لیے ادنیٰ کرنسی نوٹ ہو سکتا ہے کوئی قدر و قیمت نہ رکھتا ہو، اُس کو دیکھ کر اُس کے ذہن میں کوئی جھماکا نہ ہو، آنکھوں میں کوئی چمک پیدا نہ ہو لیکن کسی فقیر، نادار و غریب سے پوچھئے کہ وہ اُس کی کیا قدر و قیمت آنکتا ہے، ایک وقت پیٹ کی آگ بجھ جانے کا یقین اُس نوٹ کی قدر قیمت کو اُس کی نگاہ میں کن اونچائیوں پر پہنچا دیتی ہے، ذرا سوچئے۔ اُس کے لیے اِس نوٹ کی قوتِ خرید کی عظمت کا احساس کیجئے۔ قیمت سے منسلک قدر و قیمت کی باقاعدہ تشریح بعد میں دوں گا۔ ابھی تو محض معاشیات کے دائیرے میں قدر کا تعارف پڑھئے۔ یہاں ایک بات کی وضاحت اور کرتا چلوں کہ قیمت جو قوتِ خرید کا مظہر ہے قدر کا پیمانہ بنتی ہے لیکن بلند قیمت ہونے پر کمزور یا پست قوتِ خرید والے اگر

اس شئے کو حاصل کرنے سے محروم رہتے ہیں تو اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ اُن کو اُس شئے کی قدر کا احساس نہیں ہے۔ یہ شخص اس شئے کے افادہ سے بخوبی واقف ہے لیکن فی الوقت اُس کی نگاہ میں اُس شئے کی قدر اس لیے نہیں ہے کہ اُس کو خرید کر اپنے مصرف میں لانے کا اہل نہیں ہے۔

مدتِ وقت (زمانہ) اور فاصلے بھی قدر اور اُس کے معیار کا تعین کرتے ہے۔ شراب کُہنہ کی بڑی قدر ہے، بڑی اونچی قیمت ہے۔ محض اس لیے نہیں کہ کمیاب ہے، دیگر شرابوں کی دستیابی کے مقابل محدود ہے، بلکہ اس لیے بھی کہ اُس کی تیاری میں دوسری شرابوں کے مقابل، زیادہ وقت لگا ہے۔ اب جتنا وقت زیادہ لگے گا (جتنی کُہنہ ہوگی) اتنی ہی قیمتی ہوگی، اُتنی ہی زیادہ اُس کی قدر ہوگی۔ چاول کے کچھ اقسام بھی وقت و مدت کے لحاظ سے اپنی قدر و قیمت بڑھاتے ہیں۔ یہی صورت فاصلے کی ہے۔ گنگا کے کنارے رہنے والوں کو گنگا کی پاکیزگی کا وہ احساس نہیں جتنا اُن کو جو اُس سے بہت فاصلے پر رہتے ہیں۔ حرم شریف سے متصل رہنے والوں کے دلوں میں وہ عقیدت نہیں ہوگی جو اُس سے ہزاروں میل دور دراز کے ملکوں میں رہنے والوں کے دلوں میں ہوگی۔

اِنسانی شعور کی بالیدگی بھی قدر کی سطح کو طے کرتی ہے۔ نوجوانوں میں ہوسکتا ہے کہ بہت سی اشیا و خدمات کی فی الوقت کوئی قدر نہ ہو لیکن طویل عمر کا تجربہ رکھنے والے بزرگ، عمر کے نشیب و فراز کو جھیل کر دور بینی پیدا کرنے والے معمّر حضرات واقف ہیں کہ آئندہ، آنے والے زمانے میں اِن کی کیا قدر ہوگی۔ انسان میں پس انداز کرنے کا جذبہ اِسی پختہ شعور سے پرورش پاتا ہے اور بیشتر وہی حضرات زیادہ مطمئن نظر آتے ہیں جو حال کے ساتھ ساتھ مستقبل پر بھی نگاہ رکھتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے جو مستقبل کی قدر و قیمت کو حال میں طے کرتے ہیں۔

یوں تو قدر کی کیثر الجہتی سمتیں ہیں لیکن معاشیات نے اُس کو ایسی صفت یا قوت سے آنکا ہے جو اِنسان کی کسی ضرورت کی تسکین کا وسیلہ بن جائے۔ قیمت کی ادائیگی اِسی سے منسلک ہے اِس لیے قدر کو قیمت کے توسط سے بھی متعارف کرایا جاتا ہے۔ اب میں خالص معاشیات کے دائیرے میں رہ کر قانونِ قدر کی وضاحت کروں گا۔

اِقتصادیات کی کتابوں میں بتلایا گیا کہ اگر دیگر باتیں یکساں رہیں تو صرف کی پہلی اکائی (یونٹ) سب سے بلند قدر دے گی اور جیسے جیسے صَرف کی یہ اکائیاں بڑھتی جائیں گی۔ ہر اگلی اِکائی پر قدر کی سطح گھٹتی جائیگی۔ صَرف کی ایک سطح وہ ہوگی جہاں قدر صفر ہوجائیگی اور یہی سطح "MAXIMUM SATISFACTION" ''اطمینانِ کُل'' کی ہوگی۔ اِس سطح کے بعد اگر مزید صَرف کی اکائیوں کو بڑھایا جاتا ہے تو قدر بجائے مثبت ہونے کے منفی ہو جائیگی۔ یعنی DIS-SATISFATION غیر مطمئن ہونے کی کیفیت پیدا ہو جائیگی۔ اب اِس کی وضاحت چند روز مرہ کے امور سے کیجئے اور دیکھئے کہ یہ قانون کہاں تک صحیح ہے۔ آپ کو جس وقت شدید پیاس لگی ہو تو پانی سے بھرے گلاس کا پہلا گھونٹ جو فرحت و آسودگی کا احساس کرائے گا، دوسرا گھونٹ اُس سے کم اور آخری گھونٹ سب سے کم کرائیگا۔ آب یہ بات دیگر ہے کہ پیاس ایک گلاس پانی سے بجھتی ہے یا دو گلاس پانی سے۔ اگر دوسرے گلاس کی بھی ضرورت محسوس ہورہی ہے تو اس کا آخری گھونٹ سب سے کم آسودگی کا احساس

کرائیگا۔ یہی بات بھوک میں کھانے پر بھی صادق آتی ہے۔ بھوک میں کھانے کا پہلا نوالہ جو آسودگی کا احساس کرائیگا، دوسرا، تیسرا نہیں۔ ہرنوالے پر آسودگی بتدریج گھٹتی جائیگی اور یہاں تک آخری روٹی یا نوالہ سب سے کم آسودگی دے گا۔

پیاس میں پانی کے ہر گھونٹ کے ساتھ اور بھوک میں ہرنوالے کے ساتھ احساسِ تسکین بڑھتا رہے گا۔ اِس لیے ہر اگلے گھونٹ یا ہر اگلی روٹی یا اگلے نوالے میں قوت تسکین گرتی جائیگی۔ ہر شئے کے استعمال پر یہ قانون صادق آتا ہے۔ آپ ملبوسات کی تعداد لے لیجئے، کار، موٹر سائیکل کی تعداد لے لیجئے، مکان لے لیجئے۔ جس کی آپ کو ضرورت ہے اُس کی پہلی اکائی سب سے زیادہ تسکین کا ذریعہ بنتی ہے اور جیسے جیسے اُس کی تعداد میں اضافہ کرتے جاتے ہیں، ہر اگلے اضافہ پر سابقہ اکائی کے مقابل تسکین کی سطح کم ہوتی ہے۔ اِس قانون کے لیے بھی شرائط ہیں جن کو سمیٹ کر ہم ''اگر دیگر باتیں یکساں رہیں'' کے جملے میں بیان کرتے ہیں۔ اِس قانون کے صحیح طور پر نافذ ہونے کے لیے پہلی شرط یہی ہے کہ اِنسان معقول فکر وذہن کا ہو۔ کنجوس اور ہوس والے اِنسان کبھی مطمئن نہیں ہوتے RATIONAL HUMAN BEING ہی جب کسی چیز کا استعمال کرتا ہے تو اُس شئے کی پہلی اکائی میں سب سے زیادہ تسکین کا احساس کرتا ہے اور ایک سطح وہ آتی ہے جب وہ اس شئے کی آخری اکائی سے سب سے کم تسکین پاتا ہے، یعنی اُس کی ضرورت مکمل طور پر پوری ہوگئی اور وہ پوری طور پر مطمئن ہوگیا۔ یہ صفت کنجوس اور ہوس والے انسانوں میں نہیں پائی جاتی اُس لیے اس قانون کا اطلاق اُن پر نہیں ہوتا۔

دوسری شرط یہ ہے کہ اِستعمال کے اوقات اور کوالٹی واقسام میں تبدیلی نہ ہو۔ اگر آپ پیاس میں وقفہ دے کر پانی پیتے ہیں تو بہت ممکن ہے کہ ہر وقفہ کے بعد پہلا گھونٹ مساوی تسکین دے۔ یا اگر پہلا گھونٹ سادہ پانی کا پیا اور دوسرا گھونٹ ٹھنڈے پانی کا پیا تو دوسرا گھونٹ پہلے کی بہ نسبت زیادہ تسکین دے۔ یہی صورت بھوک میں کھانے کی ہے۔ اگر پہلا نوالہ باسی روٹی کا لیا اور دوسرا تازی وگرم روٹی کا تو دوسرا نوالہ زیادہ تسکین دے گا۔ یا کھانے کے درمیان کوئی اچھی اور زیادہ ذائقہ دار چیز سامنے آگئی تو اس کا نوالہ سابقہ نوالوں کی بہ نسبت زیادہ تسکین کا احساس کرائے گا۔ یہی صورت وقت کے بدلنے میں پیدا ہوسکتی ہے۔ بھوک کا اپنا ایک وقت ہے۔ اگر وہ ٹل گیا اور بے وقت کھانا کھایا تو وہ تسکین حاصل نہیں ہوگی یا معینہ وقت سے بہت پہلے، یعنی بھوک سے قبل، کھالیا تو بھی وہ تسکین حاصل نہیں ہوگی۔

تیسری شرط اِنسان کی آمدنی، مقام اور ذہنی سطح کی ہے۔ ان سب میں بھی تبدیلیاں وتغیر نہیں ہونا چاہئے۔ کسی ذہنی انتشار میں یہ قانون منطبق نہیں ہوتا۔ یہی حال آمدنی کے تغیر اور مقامات کی تبدیلیوں کا ہے۔ آمدنی کے اُتار چڑھاؤ سے ترجیحات بدلتی ہیں اور اُسی کے ساتھ مطمئن ہونے کی سطح بدلتی ہے۔ گندی بستیوں سے نکل کر صاف ستھرے ماحول میں آکر رہنے، گاؤں قصبوں سے نکل کر بڑے شہروں میں آکر بسنے، انتہائی گرم موسم سے گھبرا کر کسی ٹھنڈے اور فرحت بخش مقام پر چلے جانے سے بھی ہمارے مطمئن ہونے کا معیار تبدیل ہوجاتا ہے اور قانونِ قدر منطبق نہیں ہوتا۔ یہی صورت اچانک خوشی یا اچانک غم وصدمہ کی بھی ہے۔ ان دونوں ہی صورتوں میں یہ

قانون فعال نہیں رہتا۔

گویا قانونِ قدر ایک نارمل صورت حال میں فعال رہتا ہے، کوئی غیر معمولی کیفیت اُس کے عمل میں مانع ہو جاتی ہے۔ اب اگر ان تمام بیانیہ تفصیلات کو سمیٹ کر ہندسوں اور شکلوں میں منتقل کر دیا جائے تو شاید قانون اپنی ''عملی شکل'' میں واضح ہو جائیگا۔ میں ایک چھوٹی سی مثال کو ہندسوں اور شکل میں منتقل کر رہا ہوں۔ تصور کیجئے آپ کو شدید پیاس لگی ہے۔ قانون یہ بتلاتا ہے کہ پیاس کی شدت میں پانی سے بھرے گلاس کا پہلا گھونٹ سب سے زیادہ تسکین کا باعث ہوگا۔ یعنی اُس کی قدر سب سے بلند ہوگی۔ اب اگر یہ بلندی 80 مان لی جائے تو پہلے گھونٹ کی قدر 80 کی سطح کو مس کرے گی۔ اب پانی کا دوسرا گھونٹ بھی یقیناً بہت تسکین دے گا لیکن یہاں تسکین کا احساس سابقہ پہلے گھونٹ کے مقابل تھوڑا کم ہوگا۔ یہاں مان لیجئے یہ سطح ۷۰ رہتی ہے۔ اسی طرح یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ آپ گھونٹ، گھونٹ پانی پیتے رہیں گے، پیاس دھیرے دھیرے بجھتی رہے گی اور ایک سطح وہ آئے گی جب آپ کو مزید پانی کی کوئی خواہش نہیں ہوگی۔ یہ کامل تسکین کی سطح ہے جہاں پانی کی قدر صفر ہو جائیگی۔ اب اس کے بعد کسی کے اسرار پر بہ لحاظ تہذیب، آپ نے مزید پانی پی بھی لیا تو معاشیات کے دائرے میں اُس کی قدر منفی ہوگی، یعنی بجائے تسکین کے تکلیف کا احساس پیدا کرے گی۔ یہی صورت بھوک میں کھانے کی ہے۔ پوری بھوک میں پہلی روٹی یا پہلا نوالہ سب سے بلند قدر کا احساس کرائے گا اور جیسے جیسے نوالوں کی تعداد بڑھتی جائیگی، چونکہ بھوک مٹتی جائیگی، اس لیے ہر اگلا نوالہ سابقہ نوالے کے مقابلہ کم قدر کا احساس کرائیگا۔ یہاں تک جب پیٹ بھر جائیگا تو روٹی یا نوالے کی قدر صفر ہو جائیگی۔ اب اِس کامل تسکین کے بعد اگر کچھ کھایا تو بجائے تسکین کے تکلیف کا احساس ہوگا، یعنی قدر منفی ہو جائیگی۔ اِس کی وضاحت ذیل کے نقش میں دیکھئے۔

یہاں صرف پانی کی مثال لی گئی ہے جہاں ہر گھونٹ کی افادیت (قدر) بہ تدریج گھٹتی جارہی ہے یہاں تک کہ آٹھویں گھونٹ پر پیاس بُجھ جاتی ہے۔ یہ مکمل تسکین کی سطح ہے جہاں قدر صفر ہو جاتی ہے۔ اب اس کے بعد مزید پانی کے گھونٹ کوئی افادہ کا احساس نہیں کراتے بلکہ منفی قدر کا احساس کراتے ہیں۔ اِسی کیفیت کو ذیل کی شکل میں گرتے ہوئے خط کے ذریعہ دکھلایا گیا ہے۔ اس قانون کی وضاحت کے لیے یہ انتہائی آسان سی مثال لی گئی ہے۔ لیکن دراصل صَرف کا عمل پیچیدہ ہے۔ آپ بھوک میں اگر کھانے کی مثال ہی لیں تو آپ کے سامنے دو تین طرح کے مختلف ذائقہ کی ڈشیں تو عموماً ہوتی ہی ہیں۔ اور بھوک میں ہر ایک سے افادہ کا احساس ہوتا ہی ہے، کسی ڈش میں بہت زیادہ اور کسی میں کم۔ یہی حال دیگر مصرف میں آنے والی اشیاء کا ہے۔ اس پیچیدگی کا حل یہ نکالا گیا کہ ہم اِفادہ (قدر) کو مجموعی (یعنی کل) اور حاشیائی یعنی اضافی افادہ میں تقسیم کر کے اِس قانون کی وضاحت کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں کل افادہ بڑھ رہا ہوگا لیکن بڑھنے کا انداز مسلسل گھٹنے کا انداز اختیار کیے ہوگا۔ یعنی حاشیائی یا اضافی افادہ (قدر) تسلسل سے گھٹ رہا ہے۔ جو قانون قدر کو واضح کر رہا ہے۔ مثلاً ذیل کے ٹیبل کو غور سے دیکھئے:
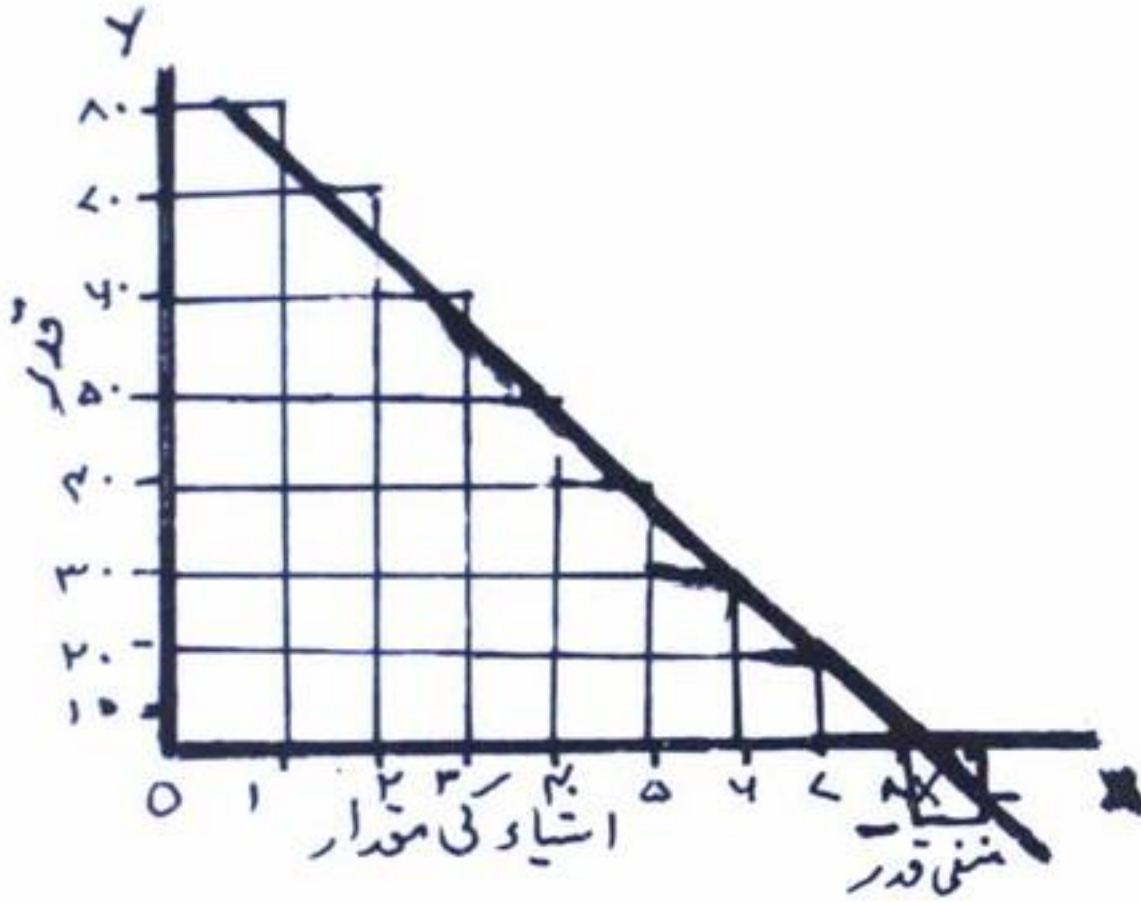
مقدار صرف	مجموعی قدر	حاشیائی قدر	کیفیت
0	0	0	0
1	8	8-0=8	8
2	14	14-8=6	6
3	18	18-14=4	4
4	20	20-18=2	2
5	20	20-20=0	0
6	18	28-18=-2	-2

اب اِن تفصیلات کو اور سمیٹئے اور مختصراً حروف تہجی کی مدد سے یوں واضح کیجئے۔ اگر یہ وضاحتیں ذہن میں ہیں تو ریاضی و الجبرے کے چھوٹے چھوٹے فارمولوں کے ذریعہ یہی بات مختصر طور پر اور زیادہ جامع انداز میں کہی جاسکتی ہے

ہم کُل افادہ یعنی مجموعی قدر کو کسی شے X کی مقدار صرف کا عمل کہہ سکتے ہے۔ اِسی بات کو آپ Tu = f (x) کی طرح کہہ سکتے ہیں۔ اگر آپ ٹیبل میں دیکھیں تو قدر کی بلند ترین سطح 20 ہے۔ حاشیائی قدر کا کل میزان بھی 20 ہے۔ اِس طرح ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ TU = ΣMU یعنی کُل مجموعی قدر حاشیائی قدر کا مجموعہ ہے۔ یہاں "Σ" نشان مجموعہ کو بتلاتا ہے۔

حاشیائی یا اضافی قدر کو بھی اِسی طرح سمیٹ کر ایک فارمولے کی شکل میں واضح کیا جاسکتا ہے۔ حاشیائی قدر سابقہ قدر کے اضافہ کا ہی نام ہے۔ اِس لیے کسی سطح پر جو قدر کی سطح ہے اُس کو سابقہ قدر کی سطح سے گھٹا دیا جائے

تو جو اضافہ ہوگا وہی اضافہ قدر ہوگی۔ مثلاً ہمارے ٹیبل میں مقدار صرف 2 پر جو قدر کی سطح ہے وہ 14 ہے۔ اس سے قبل کی سطح 8 تھی۔ اس لیے اگر 14 میں 8 کو گھٹا دیا جائے تو اضافی قدر 6 ہوگی۔ اسی طرح صرف کی سطح 3 پر قدر 18 ہے جبکہ سابقہ قدر 14 ہے تو اس طرح سطح 3 پر حاشیائی قدر 14-18 یعنی 4 ہوئی۔ اب اسی کو فارمولے کے ذریعہ ہم یوں کہیں گے- $MUn^{th} = Tu\ n^{th} - TU$ -یعنی حاشیائی قدر، کل قدر منفی سابقہ کل قدر ہوگی۔ اب ٹیبل میں حاشیائی قدر کی نوعیت کو دیکھئے تو وہ متواتر گھٹتی نظر آئیگی۔ جس سطح کو لیں گے اس سے سابقہ سطح بلند یا بڑی ہوگی۔ یعنی 2 سے بلند 4 اور 4 سے بلند 6 وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح MU1 بڑی ہے MU2 سے اور MU2 بڑی ہے MU3 سے۔

یہ قانون اتنا معتبر ہے کہ آپ بالعموم ہر طرح کے صَرف پر اس کا اطلاق کر سکتے ہیں۔ ہاں کچھ مخصوص اشیاء ایسی ضرور ہیں جن پر اس قانون کو منطبق نہیں کیا جا سکتا ہے۔ قیمتی پتھر، تاریخی نوادرات، قیمتی مصوری کے شاہکار، ڈاک ٹکٹ وغیرہ لیکن چونکہ ان کا استعمال یا ان کی طلب سماج کے مخصوص طبقہ سے تعلق رکھتی ہے۔ اس لیے یہ اشیاء خصوصی ضمن میں آتی ہیں۔ ورنہ بالعموم عوام کا جو عمومی صرف کا انداز ہے وہاں یہ قانون قدر پوری طور پر اثر انداز ہوتا ہے۔ خصوصی ضمن کی اشیاء میں اُن کی حاشیائی قدر بجائے گھٹنے کے ہر اکائی کے بڑھانے پر بڑھتی رہتی ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے۔ جس کا اطلاق محدود ہے۔

معاشیات کا نظریہ قدر آپ کے صَرف کے عمل سے خاموشی کے ساتھ لپٹا ہوا ہے۔ آپ کے ذہن، طبعت ومزاج اور سوچ وفکر کے ساتھ وابستہ ہے۔ اب یہ بات اور ہے کہ اہل معاشیات نے اس پر خصوصیت سے توجہ کی اور ایک نظریہ وقانون کی شکل دیکر صارفین کے طرز عمل (CONSUMER BEHAVIOUR) کے تحت اس کو متعارف کرایا اور زیادہ سے زیادہ سائنٹفک بنانے کی خاطر مختلف النوع ریاضی والجبرے اور جیومیٹری کی پر پیچ شکلوں کے ذریعہ اس کی تشریحات پیش کی۔ ان تمام مشقوں میں مرکزی کردار تو صارف اور اُس کے طرز عمل کا ہی ہے جس کو پوری طور پر مُقید نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں موٹے طور پر اُس کے طرز عمل کی جو شناختیں، معقولیت کے دائرے میں واضح ہیں اُن کی عکاسی یہ قانون ضرور کرتا ہے۔ اس نظریہ کو مزید بہتر طور پر خط بے نیازی INDIFFERENCE CURVE کی صورت واضح کیا گیا۔ جس کو آئندہ بیان کروں گا۔

شعری مجموعے

کتاب	شاعر	قیمت	کتاب	شاعر	قیمت
کلیات مجروح سلطانپوری		300/-	کلیات جگر		75/-
کلیات بشیر بدر		200/-	دیوان حالی		60/-
کلام طنز و مزاح		90/-	انتخاب کلام نظیر اکبرآبادی		150/-
بہترین مزاحیہ شاعری		75/-	دیوان بیخود دہلوی		100/-
کلیات مجاز		100/-	مسدس حالی		40/-
کلیات ساحر لدھیانوی		150/-	کلیات اختر شیرانی		100/-
کلام مظفر وارثی		100/-	کلیات شکیل بدایونی		165/-
کلیات حسرت موہانی		150/-	انتخاب کلیات جوش		50/-
کلیات مجید امجد		200/-	انتخاب کلیات شورش کاشمیری		90/-
کلیات یگانہ		250/-	بہر شگال۔قتیل شفائی		100/-
کلام ریاض خیرآبادی		50/-	آہنگ مجاز لکھنوی		180/-
کلیات منیر نیازی		50/-	دیوان درد		80/-
کلیات اقبال		85/-	کلیات شبلی		27/-
کلام قتیل شفائی		100/-	روح غزل		75/-
نسخہ ہائے وفا	کلیات فیض	100/-	حرف حرف روشنی	حمایت علی شاعر	35/-
ماہ تمام کلیات	پروین شاکر	250/-	پرانی بات ہے	زبیر رضوی	30/-
کلام حفیظ جالندھری		125	پیار کی باتیں (رومانی شاعری)		58/-
کلیات دلاور فگار		172/-	دیوان میر عبدالحئی تاباں		210/-
کلیات حالی		86/-	اردو شاعری (انتخاب)		30/-
کلیات اکبرالہ آبادی	فاروق ارگلی	300/-	نظمیں (منتخب غزلیں)		30/-
کلام دبیر		150/-	سرمایہ چشتی		150/-
کلیات سودا		165/-	شاعر ہند فراق گورکھپوری		125/-
کلیات ناصر کاظمی		200/-	لہو لہو آنکھیں	ماجد دیوبندی	150/-
آواز دے کہاں ہے (کلیات تنویر نقوی)		150/-	غبار منزل	غلام ربانی تاباں	45/-
دیوان غالب		60/-	محفل قوالی		50/-
کلیات غزلیات جوش		56/-	آنکھوں آنکھوں رہے	وسیم بریلوی	250/-
کلیات فانی		100/-	میرا کیا	وسیم بریلوی	200/-
کلیات جاں نثار اختر		300/-	ذکر رسولؐ	ماجد دیوبندی	150/-
کلیات میراجی		300/-	حرف حرف گلاب	اظہر ندوی	200/-
کلیات میر		155/-	دشت الم ہے بیراں	اظہر ندوی	150/-
کلیات داغ		150/-	عکس جمال	اظہر ندوی	100/-
کلام امیر مینائی		50/-	ساز سخن	ادا جعفری	45/-
کلیات مخدوم محی الدین		100/-	شہر میرے ساتھ چل	ندا فاضلی	100/-
کلام انیس		150/-	شام کا پہلا تارا	زہرا نگاہ	21/-
عدم کی بہترین غزلیں		100/-	انتخاب غزلیات		51/-

'کچھ اور چاہیے وسعت...' کا ایک افق

اردو سے فائدہ اٹھانے والے تو بے شمار ہیں لیکن اردو کی فکر کرنے والے بہت ہی کم ہیں۔ ان کم لوگوں میں ایک نام پروفیسر اختر الواسع کا بھی ہے۔ اختر الواسع کا تعلق اردو سے اس طرح کا نہیں ہے جس طرح کا تعلق ہم جیسے ہزاروں لوگوں کا ہے کہ جن کی کفالت اردو اور صرف اردو کرتی ہے۔ اختر الواسع شعبۂ اسلامک اسٹڈیز سے وابستہ ہیں اور ان کے معاش کا بوجھ ان کا اپنا شعبہ اٹھاتا ہے اس کے باوجود اردو سے ان کا رشتہ اردو والوں سے زیادہ استوار، زیادہ پائدار زیادہ جذباتی اور زیادہ محبت کا ہے۔ اردو والے تو زیادہ تر ایسے ہیں جو دونوں ہاتھوں سے اردو کا مال بٹورتے ہیں مگر اردو کے لیے کچھ کرنے کی بات تو الگ اردو کو اپنا کہنے میں بھی عار محسوس کرتے ہیں اور اس کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ وہ اپنے بچّوں کو پالتے تو ہیں اردو کی کمائی سے مگر انہیں اردو سے دور رکھتے ہیں۔ ایسا وہ شاید اس لیے کرتے ہیں کہ ان کے بچّوں پر پس ماندگی یا پچھڑے پن کا لیبل نہ لگ جائے۔ اس کے برعکس پروفیسر اختر الواسع نہ صرف یہ کہ اردو کو اپنی مادری زبان سمجھتے ہیں بلکہ اس بات کا فخر کے ساتھ اعلان بھی کرتے ہیں:

> ''اپنے نطق کے ہر صدا اور قلم کے ہر لفظ کے لیے ہمیشہ اپنی ماں کا احسان مند رہوں گا کیوں کہ اردو میری مادری زبان ہے اور ظاہر ہے یہ ان سے ہی مجھے ورثے میں ملی ہے۔''

اختر الواسع صرف بیان ہی نہیں دیتے بلکہ اس سلسلے میں عملی ثبوت بھی فراہم کرتے ہیں۔ اردو کو صحیح معنوں میں مادری زبان سمجھنے والوں کا ایک روّیہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی زبان کی ترقی چاہتے ہیں اور اس کی ترقی پر خوش اور تباہی پر غم زدہ ہوتے ہیں اور ان کی خوشی اور غم دونوں کا اظہار ان کی تحریر و تقریر سے ہوتا رہتا ہے۔ اختر الواسع کے اس احساس کا ایک ٹھوس ثبوت ان کی تازہ ترین کتاب ''کچھ اور چاہیے وسعت...'' ہے۔

اس کتاب میں بارہ مضامین ایسے ہیں جن کا تعلق صرف اور صرف اردو زبان سے ہے۔ ان مضامین کے عنوانات سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ لکھنے والا اپنی زبان سے کس حد تک جڑا ہوا ہے اور اس کے تئیں کس قدر فکر مند رہتا ہے۔ شاید اسی لیے اس نے اِن تمام مضامین کے لیے جو باب قائم کیا ہے، اس کا نام ہی بابِ فکر رکھا ہے۔

بابِ فکر کی فکر اور مصنف کے سروکار، اردو کے تئیں اس کے احساسات و جذبات اور اس کے روّیے کو سمجھنے کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایک بار پھر سے کتاب کے اس باب کے تمام عنوانات پر غور کر لیا جائے:

۱۔ اردو اور خود احتسابی کا آئینہ

۲۔ اردو رسم خط کا مسئلہ: ترجیحات و مضمرات

۳۔ اردو زندگی اور زمانے کی زبان

۴۔ ذرائع ابلاغ اور اردو'

۵۔ اردو تہذیب؟ تنوع کا رواں دواں آئینہ

۶۔ اردو ہندی ایک فرضی تقسیم

۷۔ مدراس کی تعلیم کو بہتر بنانے میں اردو زبان کا رول

۸۔ تحریکِ آزادی اور قومی یک جہتی میں اردو زبان کا حصہ

۹۔ اردو اور ہم: ناطقہ سر گریباں ہے اسے کیا کہیے

۱۰۔ خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھیے

۱۱۔ کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

۱۲۔ تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

یہ عنوانات درجہ ذیل نکات سامنے لاتے ہیں:

☆"زبان کا رسم خط سے وہی تعلق ہوتا ہے جو روح کا جسم سے۔ جسم روح کا مظہر ہے اسی طرح رسم خط زبان کا"۔ زبان کی انفرادیت اسی وقت تک باقی رہتی ہے جب تک اس کا بنیادی رسم خط باقی رہتا ہے۔ اردو رسم خط نہ ہا تو اردو نہ ہوگی۔ آپ جڑ کاٹ دیں اور چاہیں کہ پیڑ سر سبز و شاداب رہے یہ ناممکن ہے۔"

(اردو رسمِ خط کا مسئلہ۔ ترجیحات و مضمرات)

☆''اگر آپ ہندوستانی فلموں کی زبان اور مختلف ٹیلی ویژن چینل سے نشر کی جانے والی زبان کا جائزہ لیں تو اسی نتیجے تک پہنچیں گے کہ زندگی کی زبان صرف کتابی نہیں ہوتی اور اردو اوّل و آخر زندگی کی زبان ہے۔'' (اردو، زندگی اور زمانے کی زبان)

☆''کسی نے کہا تھا کہ ہندی زبان عوامی آہنگ اور اسلوب اختیار کرتے ہی اردو بن جاتی ہے۔ اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اردو اور ہندی کے بیچ کی دوری بڑی حد تک سمٹ جاتی ہے لیکن ماس میڈیا کے واسطے سے اردو کو زندہ رکھنے اور اردو کو ماس میڈیا کا ایک موثر وسیلہ بنانے کا سب سے اہم راستہ صرف یہ کہ اردو کو اردو کے نام سے جانا جائے''۔ (ذرائع ابلاغ اور اردو)

☆''اردو ایک ایسی زبان جس نے ہندوستان کی اجتماعی تاریخ کے دورِ جدید میں غیر معمولی رول ادا کیا ہے۔جس نے انقلاب زندہ باد سے لے کر غریبی ہٹاؤ تک ہماری اجتماعی زندگی کو سب سے بڑے نعرے دیے ہیں، اس زبان کو دراصل اسی کے نام سے پکارنا اور پہچاننا چاہیے۔''(ذرائع ابلاغ اور اردو)

☆''انسانی وجود کی آزادی کا جذبہ اردو کی ادبی وشعری سرشت اور روایت کے اساسی عناصر میں شامل رہا ہے اسی طرح قید و بند اور اسیری کے خلاف اور خلقی وجبلی بغاوت بھی اردو روایت کے بنیادی رویے کا جزوِ اعظم رہی ہے۔''(تحریک آزادی اور قومی یکجہتی میں اردو کا حصہ)

☆''اردو کا جنم ہی قومی یک جہتی کے بطن سے ہوا تو اس میں قطعاً تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ اس کے موضوعات سب کے سب نہیں تو غالباً اکثریت میں ہندوستان سے متعلق ہیں۔ اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب کی ترویج واشاعت میں بھی اردو نے ایک نہایت اہم رول ادا کیا ہے اور یہ بات بڑے فخر کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ شریمت بھگوت کے جتنے تراجم اردو میں ہیں شاید ہی اس کے علاوہ اس سے زیادہ کسی زبان میں ہیں۔''(تحریک آزادی اور قومی یکجہتی میں اردو کا حصہ)

۔ ''آج ملک کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے مدارس درس و تدریس کا ایک ایسا وسیع و

عریض

میدان ہیں ۔ جہاں اردو زبان کسب علم اور علمی اظہار کا باضابطہ اور مستحکم ذریعہ ہے۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اردو زبان علمی اظہار اور ذریعۂ تعلیم کی شکل میں جہاں تمام لفظی مجاز اور مباحثوں سے دور پوری طرح محفوظ و مامون ہے ،وہ یہی مدارس ہیں۔'' (مدارس کی تعلیم کو بہتر بنانے میں اردو زبان کا رول)

☆''لہٰذا ضروری ہے کہ اردو کی بقا و فروغ سے متعلق غور و فکر، گفتگو اور کوششوں میں اس زبان کے علمی فروغ و استحکام کے مسائل کو بھی مناسب جگہ دی جائے تا کہ اس سلسلے میں کسی اجتماعی کوشش کا ڈول ڈالا جاسکے۔ایسا نہ کیا گیا تو اردو کے بچے کھچے علمی رسائل و جرائد بھی چند دن بعد دم توڑ دیں گے''۔(اردو اور ہم: ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے)

☆ ''یہاں ان باتوں کا مقصد اس روشن حقیقت پر سیاہی ڈالنا نہیں کہ اردو ادب اور تہذیب نے روز اول ہی سے آفاقی انسانی اقدار کی پرورش اور پاسداری کی ہے اور اس نے تمام بڑی مذہبی اور تہذیبی روایات سے قوت حاصل کی ہے اور تمام مذاہب اور ثقافتوں کے اظہار کا وسیہ رہی ہے۔ مقصد صرف اس جانب توجہ دلانا ہے کہ اردو زبان وادب اور تہذیب کا آفاقی اور سیکولر کردار کسی ایک کتاب کی جارحانہ کردار کشی کی کوشش سے کسی بھی طرح متاثر ہونے والا نہیں ہے''۔ (خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھیے)

اختر الواسع کے مختلف مضامین سے ماخوذ یہ نکات اختر الواسع کو اردو کا سپاہی ثابت کرتے ہیں۔ ایک ایسا سپاہی جو اپنی زبان کے لیے مختلف محاذ پر جنگ کرتا ہے اور ہر وہ حربہ استعمال کرتا ہے جس سے اس کی زمینی سرحد کی حفاظت ہو سکے۔ انہیں اس بات کا بھی عرفان ہے اور احساس بھی کہ ''تہذیبیں اور زبانیں بنیادی طور پر حکومتوں کی سرپرستی اور رحم وکرم سے کہیں زیادہ خود اپنی باطنی قوتوں سے فروغ اور استحکام حاصل کرتی ہیں۔

یہاں اختر الواسع ہم اردو والوں کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ اگر ہم اردو کی بقاء چاہتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ اردو کے راستے کی دیواریں گر جائیں اور رکاوٹیں دور ہو جائیں تو ہمیں چاہیے کہ ہم صرف حکومت کے بھروسے نہ رہیں بلکہ خود بھی اپنی زبان کے فروغ واستحکام میں ہاتھ بٹائیں۔ حکومتیں بھی حرکت میں اُسی وقت آتی ہیں جب اُنہیں تحرک دلانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس لیے کہ بغیر تیز گرمی کے برف نہیں پگھلتی۔ جہاں اختر الواسع اردو والوں کو یہ نکتہ سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ اردو کے لیے خود آگے آئیں۔ جوش دکھائیں۔ زور لگائیں اور گرمی کا سامان پیدا کریں تا کہ حکومت کا جمود ٹوٹے اور وہ حرکت میں آئے وہیں وہ اپنی حکومت کے سامنے مارشس کی یہ مثال بھی رکھتے ہیں:

☆''یہاں (مارشس میں) کسی بھی زبان کے لیے کسی قسم کے تعصب یا جانب داری یا منافرت کا جذبہ نہیں پایا جاتا۔ یہاں اردو والے اردو اسی طرح بولتے ہیں جس طرح ہندی والے ہندی بولتے ہیں یا کریوں بولنے والے کریوں بولتے ہیں۔ ساری زبانوں کو یکساں جذباتی استحکام اور احترام حاصل ہے۔'' (تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں)

اس مثال سے اختر الواسع اپنے ملک کے حکمرانوں اور اسکے سیکولر ڈھانچے کو قائم ودائم رکھنے کی فکر کرنے والے سیاست دانوں اور دانشوروں کو یہ احساس دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہندوستان کو اس چھوٹے سے ملک سے سبق لینا چاہیے اور یہاں بھی اردو کو اُسی طرح پھلنے اور پھولنے کا موقع دینا چاہیے جس طرح ہندی اور انگریزی کو دیا جا رہا ہے۔

اردو زبان سے محبت، اس کی بقاء کی فکر اور جدو جہد کے رنگ وآہنگ اختر الواسع کے صرف انہیں مضامین میں نہیں دکھائی دیتے جو اردو کے موضوع ومسائل کے لیے مختص ہیں بلکہ ان کی دیگر تحریروں میں بھی اردو

کے ان پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی طرف ان کا قلم برسرِ عمل رہتا ہے۔ خواہ مضمون کا کوئی بھی موضوع ہو اختر الواسع اس میں بھی اردو کی وکالت کا موقع نکال لیتے ہیں۔ مثلاً ان تحریروں کو ملاحظہ کیجیے:

۱۔ اردو زبان صدیوں سے جاری اپنے تہذیبی وثقافتی تفاعل کی وحدت کے ساتھ عمل پذیر تھی یعنی ابھی اس پر اردو اور ہندی کی بد بختانہ تقسیم کی ضرب نہیں لگی تھی۔ یہ زبان مختلف زبانوں کے الفاظ اور مختلف مذہبی و جدانات کے عکس و اثرات کی پر اسرار تخلیقی ترکیب و آمیزش سے قوت مند اور ثمر بار تھی۔ (ولی دکنی: ہند اسلامی تہذیب کا شعری صورت گر)

۲۔ ہر انسان کسی نہ کسی زبان کا حامل ہوتا ہے اور یہ زبان اسے غیر ارادی طور پر اور بے طلب حاصل ہوتی ہے اور یہ زبان ہی جس کے توسط سے انسان، انسانی تہذیب میں داخل ہوتا ہے اور شعر وادب تہذیب کا جز ولا ینفک ہونے کی وجہ سے بالکل لاشعوری طور پر انسان کو ایک ورثے کے طور پر منتقل ہو جاتے ہیں۔ (میر کی آفاقی بصیرت)

۳۔ ''اردو اور ہندی میں اختلاف اور مفارقت کا سلسلہ جن بنیادوں پر شروع ہوا تھا اسے انہی بنیادوں پر ختم بھی کیا جا سکتا ہے۔ پریم چند کی مثال اس سلسلے ایک بار پھر ہمارے کام آسکتی ہے کہ یہی وہ نقطۂ اشتراک ہے جو اردو اور ہندی کی ادبی وتہذیبی روایتوں اور اس طرح ہند اسلامی تہذیب کے منقسم حصوں کے درمیان قربتوں اور رابطوں کی زمین تیار کرنے میں مددگار ہو سکتا ہے۔'' (پریم چند: گاندھیائی فکر کا ادبی نقش گر)

۴۔ '' آزادی کے بعد سے ہندوستان میں اردو زبان و ادب اور اور تہذیب جن محرومیوں، نا انصافیوں اور ابتلاؤ کی شکار رہی ہے اس سے ہم سب واقف ہیں۔ یہ ایک ایسی داستان ہے جس میں اپنوں اور بیگانوں کے سلوک میں کوئی فرق نہیں رہا ہے کیوں کہ غیروں نے کیا ستم روا رکھے ہوں جو اپنوں نے نہیں کیے۔ یہ عظیم زبان ایک طرف تعلیمی نظام اور سرکاری دفتروں سے دور ہوتی گئی تو دوسری طرف ان گھروں سے بھی نکال دی گئی جو کبھی اس کی پرورش و پرداخت اور ترقی وتحفظ کے ضامن ہوا کرتے تھے۔ اردو زبان وادب کی کس مپرسی اور دربدری کے اس زمانے میں بھی بعض ادب پرستاران زبان وادب اپنی تمام تر قوتوں کا استعمال کرتے ہوئے شعر وشاعری، افسانہ نگاری اور نقد ونظر کے شعبوں میں سرگرم رہے جس سے اس زبان کا مندا ہوتا ہوا بازار ابھرا ابھرا نظر آتا تھا ان ادیبوں میں محترمہ قرۃ العین حیدر کو بڑا نمایاں اور ممتاز مقام حاصل تھا۔'' (کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور)

یہ تحریریں اختر الواسع کے ان مضامین سے ماخوذ ہیں جو باب ذوق میں شامل ہیں۔ان کی نگارشات میں شعوری اور غیر شعوری طور پر بار بار اردو کا ذکر آنا اس بات کا ثبوت ہے کہ اختر الواسع کو اپنی زبان اردو سے کس حد تک محبت ہے اور اس کے لیے وہ کس درجہ فکر مند رہتے ہیں۔ہمیں اختر الواسع کے اس رویہ سے سبق حاصل کرنا چاہیے اور ان کی طرح ہمیں بھی اردو سے اپنی محبت اور اپنے تعلق کا ثبوت دینا چاہیے۔بلکہ ہم پر یہ ذمہ داری زیادہ عائد ہوتی ہے کہ ہمارا گزر بسر اردو کی مرہون منت بھی ہے۔اردو کا ہم پر قرض ہے اور اس قرض کو ادا کرنا ہم پر واجب ہے۔ہمیں تو اردو کے فروغ اور بقاء کی جدو جہد کے لیے اس لیے بھی آگے آنا چاہیے کہ اگر اس زبان کا فروغ رک گیا تو ہمارے معاش کا ذریعہ بھی بند ہو سکتا ہے۔اگر اردو کے لیے نہیں تو ہمیں اپنے لیے آگے بڑھنا چاہیے اور اختر الواسع کے اس سُر میں سُر ملانا چاہیے کہ زبانیں بنیادی طور پر حکومتوں کی سرپستی اور رحم وکرم سے کہیں زیادہ خود اپنی باطنی قوتوں سے فروغ اور استحکام حاصل کرتی ہیں۔

اس کتاب میں جو باقی مضامین ہیں وہ اختر الواسع کے ادبی ذوق اور اردو ادب سے ان کے گہرے لگاؤ کی ترجمانی کرتے ہیں اور اس بات کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ اختر الواسع کو اردو زبان سے صرف اس لیے محبت نہیں ہے کہ وہ ان کی مادری زبان ہے بلکہ اس لیے بھی ہے کہ اردو ایک نہایت شیریں اور پراثر زبان ہے۔یہ ایک ایسی راہ ہے جو جذبات ومحسوسات اور خیالات وتجربات کو ایک دل ودماغ سے نکال کر دوسرے دل ودماغ تک سلیقے سے پہنچاتی ہے اور رگ وریشے میں کیف ومسرت کی کیفیت دوڑا دیتی ہے۔اختر الواسع اردو کے اس وصف کا پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں اور اپنی تحریر وتقریر دونوں کو پر لطف بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔اختر الواسع بظاہر تو اسلامیات کے ماہر معلوم ہوتے ہیں مگر دیکھا جائے تو اصلاً وہ ایک ادیب ہیں جس کا ثبوت ان کی تحریر کی وہ چاشنی ہے جو ان کے صحافتی اور اسلامی تحریروں میں بھی محسوس ہوتی ہے۔ان کے ادیب ہونے کا ایک سبب یہ بھی کہ ان کی تحریر اور تقریر دونوں میں تخلیقی کارفرمائی وتخلیقی شان نظر آتی ہے۔۔خیالات کی ندرت،اسلوب کی جدت،تشبیہات کی شمولیت اور لفظوں کی ترتیب کے ساتھ ساتھ مضامین کے عنوان میں بھی ان کے ادیبانہ اپروچ کو دیکھا جا سکتا ہے۔مثلاً اسی کتاب جس پر ہم گفتگو کر رہے ہیں کے درجہ ذیل مضامین کے عنوانات پر نظر ڈالیں تو ان کے اس ادبی اپروچ کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے:

۱۔ کس منہ سے شکر کیجیے۔۔۔(اس لطفِ خاص کا)
۲۔ جب نام تیرا لیجیے تب چشم بھر آوے
۳۔ ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے
۴۔ خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھیے
۵۔ کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا
۶۔ تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

۷۔ بوئے گل کی بھی کہیں خوئے سفر جاتی ہے

۸۔ میں سورج ہوں ابھرنا چاہتا ہوں

۹۔ کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

یہ سارے 'عنوانات کچھ اور چاہیے وسعت۔۔۔' کے مضامین کی ترجمانی کے لیے قائم کیے گئے ہیں۔ یہ عنوانات بلکہ خود کتاب کا عنوان بھی دراصل مختلف مشہور شعروں کے مصرعے ہیں جنھیں مصنف نے اپنے خیالات اور نقطۂ نظر کی وضاحت کے لیے وسیلہ بنایا ہے۔ ایسا وہی کر سکتا ہے جس کو اردو شعر و ادب سے گہرا شغف ہو اور جو شاعری کے رمز و ادا سے اچھی طرح واقف ہو۔

طالب علمی کے زمانے سے لے کر موجودہ عہد تک کی اختر الواسع کی کامیابیوں پر نظر ڈالیں تو ان کے پیچھے ان کی مادری زبان یعنی اردو کا ہاتھ بھی نظر آئے گا اور اردو کا یہ ہاتھ یہ اشارہ بھی کرتا ہوا دکھائی دے گا کہ جو شخص بھی اس زبان کو دل سے اپناتا ہے، اس کی بقا کے لیے کوشاں رہتا ہے اور اس کی ترقی میں ہاتھ بٹاتا ہے یہ بھی اسی طرح اس شخص کی ترقی کی راہیں روشن کرتی ہے اور اسے سرخ روئی سے ہمکنار کرتی ہے۔ کاش اختر الواسع کی طرح ہم بھی اردو کا اشارہ سمجھ پاتے!

سینٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن
(وزارت صحت و خاندانی بہبود، حکومت ہند)
جواہر آیوش بھون ۶۵۔۶۱، انسٹی ٹیوشنل ایریا، روبرو، ڈی بلاک، جنک پوری، نئی۔۱۱۰۰۵۸
فون:28525715 ,28521981، فیکس:28522965، ای میل:unanimedicine@gmail.com

اہل علم حضرات سے اپیل

طب یونانی ہمیشہ سے مشرقی علوم کا ایک اہم حصہ رہی ہے جس کے فروغ وارتقاء میں عرب وایرانی طبیبوں اور فلسفیوں نے اہم کردار ادا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ طب یونانی کا قدیم لٹریچر عربی اور فارسی زبانوں میں محفوظ ہے۔ یہ سرمایہ مخطوطات کی شکل میں ہندوستان اور دنیا کے دوسرے ملکوں میں کتب خانوں اور ذاتی ذخیروں میں پھیلا ہوا ہے۔ مختلف اوقات میں مختلف سطحوں پر یہ کوشش کی جاتی رہی ہیں کہ طبی مخطوطات ونادر کتابوں کے بارے میں اطلاعات اور اعداد وشمار دستیاب ہوں۔ اس کام میں کسی حد تک کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے۔ مشہور کتب خانوں کے کیٹلاگ میں طب وسائنس کے ذیل میں طبی مخطوطات کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن غیر معروف کتب خانوں، مدارس اور ذاتی ذخیروں میں موجود مخطوطات کے باقاعدہ اعداد وشمار دستیاب نہیں ہیں جس کی وجہ سے ان سے استفادہ مشکل ہے۔ ان مخطوطات کی نشان دہی اور دستیابی کے علاوہ جدید طریقوں سے ان کا تحفظ بھی بہت ضروری ہے۔
اس ضرورت کے پیش نظر حکومت ہند نے شعبۂ آیوش، وزارت صحت وخاندان بہبود کے زیر نگرانی اس قسم کے مخطوطات کے سروے اور ڈیجی ٹائزیشن کا فیصلہ کیا اور یہ طے کیا ہے کہ سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن کی جانب سے قومی سطح پر اس کام کے لیے تحریک شروع کی جائے۔ معروف کتب خانوں میں موجود مخطوطات بہت حد تک محفوظ ہیں اور ان تک رسائی بھی نسبتاً آسان ہے لیکن غیر معروف کتب خانوں، مدارس، خانقاہوں اور ذاتی ذخیروں میں موجود مخطوطات تک پہنچنے کے لیے ہمیں آپ کے تعاون کی سخت ضرورت ہے۔ اس مقصد کے لیے کونسل آپ سے درخواست کرتی ہے کہ درج ذیل معلومات فراہم فرمائیں۔

- ☆ ایسے سرکاری یا غیر سرکاری کتب خانوں، مدارس وخانقاہوں اور ذاتی ذخیروں کی نشان دہی فرمائیں جہاں طبی مخطوطات موجود ہیں۔ اگر مخطوطات کی لسٹ فراہم ہو سکے تو بہت بہتر ہے۔
- ☆ اگر کسی جگہ مخطوطات کا ان کی اصل صورت اور Digitized شکل میں تحفظ ہوا ہے تو اس سے متعلق تفصیلات سے آگاہ فرمائیں۔
- ☆ مخطوطات کے شائع شدہ کیٹلاگ کی تفصیلات فراہم فرمائیں۔
- ☆ طبی مخطوطات ونایاب کتب کی نشان دہی اور دستیابی سے متعلق مفید مشوروں سے نوازیں۔

طب یونانی اور مشرقی علوم کی بازیافت میں آپ کے گراں قدر تعاون کے لیے کونسل ہمیشہ شکر گزار رہے گی۔
طبی مخطوطات کی بازیافت کے موضوع پر ایک ورکشاپ عنقریب نئی دہلی میں منعقد کی جائے گی جس میں ماہرین فن موضوع کے مختلف پہلوؤں پر تبادلۂ خیال کریں گے۔ اس ورکشاپ کا مقصد مخطوطات کی مہم کے لیے ایک جامع خاکہ تیار کرنا ہے۔ قارئین میں سے جن حضرات کے پاس اس حوالہ سے مفید معلومات ہوں، کونسل ورکشاپ میں ان کو خوش آمدید کہتی ہے۔ ورکشاپ کے انعقاد کی تاریخ کا اعلان جلد ہی کیا جائے گا۔

خادم طب
ڈاکٹر محمد خالد صدیقی
ڈائرکٹر جنرل

محمد متین ندوی ریویو آرٹیکل

یٰسین احمد کے افسانہ ''جواز'' پر ایک نظر

یٰسین احمد دور حاضر کے ان نمائندہ افسانہ نگاروں میں سے ہیں، جن کے قارئین کا دائرہ بہت وسیع ہے، وہ اپنے تجربات ومشاہدات کو افسانہ کی شکل میں بیان کرنے پر قدرت رکھتے ہیں، ان کے افسانوں کے کردار روزمرہ کے انسان ہیں، وہ بڑی سادگی کے ساتھ افسانے لکھتے ہیں، ان کے افسانے کو پڑھنے اور انہیں سمجھنے کے لئے کسی فلسفی یا نقاد کا ہونا ضروری نہیں صرف اردو زبان کے ساتھ ادبی ذوق کا حامل ہونا کافی ہے، خواہ مخواہ افسانہ کو پیچیدہ اور بے معنی نہیں بناتے۔

وہ عریانیت اور ننگے پن سے احتراز کرتے ہوئے بھی افسانوں میں دلکشی پیدا کرنے میں کامیاب ہیں، جو لوگ یہ سوچتے ہیں کہ بغیر عریانیت یا سیکس کے افسانے میں دلکشی نہیں پیدا ہوسکتی انہیں یٰسین احمد کے افسانے غور سے پڑھنا چاہئے تاکہ وہ اپنی خام خیالی سے آگاہ ہوسکیں اور یہ سمجھ سکیں کہ ان کا خیال صحیح نہیں، ابھی چند روز قبل ہی ان کی ایک کتاب ''یہ کیا جگہ ہے؟'' زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آئی ہے، اس سے قبل ان کی تین کتابیں ادبی دنیا سے داد وتحسین حاصل کرچکی ہیں، مذکورہ کتاب بھی انشاء اللہ ادبی دنیا میں پسند کی جائے گی، کیونکہ اس میں کتابوں کے مقابلہ میں پختگی میں اضافہ ہی ہوا ہے، جیسا کہ عام طور پر فن اور زبان میں روز ترقی ہوتی رہتی ہے۔

فی الحال میں ان کے افسانہ جواز پر مختصر گفتگو کرنا چاہوں گا جو کہ ''نئی کتاب'' شمارہ نمبر چار میں شائع ہوا ہے، اس افسانہ کا مرکزی کردار ایک ایسا شخص ہے، جو ایک آزاد صحافی تھا اور شہر کے مذہبی مقامات پر ایک آرٹیکل لکھنا چاہتا تھا، جس کے لئے وہ مختلف عبادت گاہوں کی تصویریں کھینچتا ہے، اسی دوران پبلک گارڈن سے گزرتے ہوئے اسمبلی تک پہنچ جاتا ہے اور بے خیالی کے عالم میں اس آہنی ریلنگ کے اندر داخل ہوجاتا ہے، جو عارضی طور پر بنائی گئی تھی، جس کی وجہ سے اسے مشکوک قرار دے کر دہشت گرد ثابت کرنے کی پوری کوشش کی جاتی ہے، اسے تفتیش گھر لے جاکر بے تحاشا لاتوں اور گھونسوں سے پولیس مارتی ہے اور دوسرے دن اسے دہشت گرد قرار دے کر اخبارات میں یہ خبر شائع کرادیتی ہے کہ:

''دہشت گرد پکڑا گیا، جس نے پچھلی بار شہر کیسب سے بڑی مسجد میں بم بلاسٹ کیا تھا، اس نے مزید دھماکے کی نیت سے شہر کے مقدس مقامات کی تصویریں لی تھیں، پولیس نے اس دہشت گرد کو تصویر اور کیمرہ کے ساتھ گرفتار کیا ہے''۔

یٰسین احمد نے اس افسانہ میں چند طبقوں کی نفسیات وخیالات اور حالات کو بیان کیا ہے۔

(۱) کاروباری افراد

(۲) نیتا

(۳) پولیس

تجارت پیشہ، کاروباری افراد کی نفسیات کو بیان کیا ہے کہ وہ ہمیشہ اور ہر جگہ فائدہ کو پیش نظر رکھتے ہیں چاہے وہ خود کا گھر ہو یا بھگوان کا۔ رحمٰن کا گھر ہو یا رحیم کا۔ اپنے اس خیال کو بیان کرنے اور اسے ثابت کرنے کے لئے وہ ایک ایسا واقعہ بیان کرتے ہیں جس سے ان کی بات کی تقویت ملتی ہے۔ وہ ایک ایسے جوڑے کی تصویر کشی کرتے ہیں جو کار سے اتر کر مندر میں جاتا ہے، عورت کے ہاتھ میں چاندی کی خوبصورت سی تھالی ہوتی ہے جس میں پوجا کا سامان ہوتا ہے، اس تعلق سے چند لائنیں پیش ہیں دیکھئے کس خوبی سے انہوں نے اپنی بات کہی ہے:

''میں جہاں تھا وہیں رک گیا، عورت اور مرد مندر میں چلے گئے، مندر اس وقت خالی تھا، نہ کوئی بھگت تھا اور نہ پجاری، بہت جلد دونوں پوجا سے فارغ ہوکر باہر آ گئے۔ عورت کا چہرہ شردھا اور بھگتی کی شدت سے تمتما رہا تھا، تھالی میں ناریل دو ٹکڑوں میں رکھا تھا، مرد آگے چل رہا تھا اور عورت پیچھے، میں لپک کر عورت کے قریب پہنچا اور پوچھا: ''ماں جی! آپ ناریل واپس لے جارہی ہیں، پوجا کے آدھا ناریل مندر میں نہیں چھوڑا؟'' ۔عورت دھیرے سے مسکرائی: ''کس لئے چھوڑوں؟ بھگوان تو ناریل کھاتے نہیں، اس لئے گھر لے جارہی ہوں''۔

''آپ اس ناریل کا کیا کریں گی؟ میں نے معصومیت سے پوچھا۔

''اس کو دھوپ میں سکھاؤں گی اور پھر چٹنی یا سالن میں استعمال کروں گی'' عورت نے جواب دیا اور اپنی کار کی طرف بڑھ گئی۔ یقیناً عورت کا تعلق کسی کاروباری خاندان سے ہے۔ کاروباری آدمی ہر جگہ اپنا نفع نقصان دیکھتا ہے۔ چاہے گھر ہو یا دکان یا پھر مندر......''

نیتاؤں کے متعلق ''جواز'' سے چند لائنیں پیش ہیں، یہ لائنیں اس موقع کی ہیں جب آزاد صحافی بے خیالی میں اسمبلی سے متصل عارضی طور بنائی ہوئی ریلنگ کے اندر داخل ہوجاتا ہے۔ وہاں پر پولیس کا جو نوجوان تعینات تھا وہ نرم دل لگتا تھا، اس سے بات چیت کے دوران ہی کئی گاڑیاں اسمبلی کے اندر داخل ہوتی ہیں اور صحافی پولس والے سے پوچھتا ہے اور پھر پولس کا وہ نوجوان نیتاؤں کے متعلق یوں اظہار خیال کرتا ہے:

پولیس کا نوجوان تھا لیکن نرم دل لگتا تھا۔ آہستگی سے بولا ''یہ سب ہمارے مائی باپ ہیں، ان داتا ہیں، نیتا لوگ ہیں ہمارے دیش کو چلانے والے''۔

نیتا لوگ دیش کا کہاں چلاتے ہیں، دیش ان نیتاؤں کو چلاتا ہے، یہ اَن داتا بھی نہیں، یہ تو ہمارے منہ تک نوالا چھین لیتے ہیں، ان داتا تو وہ ہے، جو اوپر آسمان پر بیٹھا ہے، وہی پانی برساتا ہے، زمین نرم پڑتی ہے، کسان ہل چلاتا ہے، بیج بوتا ہے، فصلیں لہلہاتی ہیں اور پھر اَن ہم تک پہنچتا ہے، کہیں بھی ان نیتاؤں کا عمل دخل نہیں ہے۔ یہ سب باتیں میں اس سے کہنا چاہتا تھا کہ ایک گرجدار آواز نے میرے ذہن کو منتشر کردیا۔ ''یہ کون ہے؟ اندر ریلنگ میں کیوں آیا ہے؟''

تیسرا طبقہ ہے پولیس انتظامیہ کا جس کے تعلق سے اوپر اقتباس پیش کیا جاچکا ہے، لہٰذا مکرر پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ نیتاؤں کی تصویر کشی اور پولیس انتظامیہ کی غیر ذمہ دارانہ بلکہ ظالمانہ روش جس کی وجہ سے وہ کسی پر بھی خواہ مخواہ شک کا بہانہ بنا کر ثابت کرتی رہتی ہے۔

یہ ہے ہماری انتظامیہ کی غیر ذمہ دارانہ حرکت جس کے ذریعہ دہشت گردی کا خاتمہ بہر حال ممکن نہیں! ہاں دہشت گردی میں اضافہ کا خطرہ ضرور ہے۔

ہمارا پیارا ملک آج جن مسائل سے دوچار ہے اور جن خطرات میں گھرا ہوا ہے۔ اس کے لئے بالخصوص دیش کے نیتاؤں اور پولیس انتظامیہ کو قصوروار ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ حالانکہ یہ دونوں طبقے حقیقی معنوں میں ملک کو ترقی یافتہ بنانے میں بنیادی کردار ادا کر سکتے ہیں۔ کاش کہ ایسا ہی ہو، تا کہ ہمارا پیارا ملک ہر لحاظ سے مثالی ملک بن سکے۔

ہمارے ملک کے موجودہ حالات کے پیش نظر کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے، شاعر کی مراد یہاں کوئی بحث نہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ ہمارے پیارے ملک کے حالات کے پیش نظر یہ شعر بہت خوب ہے، اور بالکل سچی تصویر پیش کرتا ہے۔

برباد گلستاں کرنے کو ایک ہی الو کافی تھا
ہر شاخ پہ الو بیٹھا ہے انجام گلستاں کیا ہوگا

یٰسین احمد کی افسانہ نگاری پر ویسے تو بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے، کیونکہ انہیں افسانہ نگاری کا فن تو آتا ہے، ساتھ الفاظ و بیان پر بھی قدرت حاصل ہے، ہماری بات کی تصدیق کے طور پر ''جواز'' یا ان دیگر افسانوں کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

طنزیہ ومزاحیہ ادب

کتاب	مصنف	قیمت
ابن بطوطہ کے تعاقب میں	ابن انشا	180/-
ادیبوں کے لطیفے	ساقی نارنگ	80/-
اردو کی آخری کتاب	ابن انشا	100/-
انسانی تماشہ	شفیق الرحمٰن	120/-
آب گم	مشتاق احمد یوسفی	200/-
آشفتہ بیانی میری	رشید احمد صدیقی	40/-
آوارہ گرد کی ڈائری	ابن انشا	170/-
بڑا بے ادب ہوں	منظور عثمانی	200/-
بزم آرائیاں	کرنل محمد خاں	175/-
بہ جنگ آمد	کرنل محمد خاں	250/-
بہ سلامت روی	کرنل محمد خاں	250/-
بہ قلم خود	نصرت ظہیر	200/-
پچھتاوے	شفیق الرحمٰن	110/-
پرواز	شفیق الرحمٰن	110/-
پطرس کے مضامین	پطرس بخاری	20/-
پہلی بیگم	شوکت تھانوی	100/-
تحت اللفظ	نصرت ظہیر	100/-
چراغ تلے	مشتاق احمد یوسفی	90/-
چلتے ہو تو چین کو چلیے	ابن انشا	90/-
چنگ درباب	کنہیالال کپور	80/-
حماقتیں	شفیق الرحمٰن	180/-
خاتم بدہن	مشتاراحمد یوسفی	110/-
خبطی	شوکت تھانوی	50/-
خمار گندم	ابن انشا	150/-
خنداں	رشید احمد صدیقی	80/-
داماد	شوکت تھانوی	110/-
دجلہ	شفیق الرحمٰن	180/-
درگذشت	مشتاق احمد یوسفی	170/-
دریچے	شفیق الرحمٰن	100/-
رشید احمد صدیقی کے خطوط	مرتبہ: آل احمد سرور	180/-
سانچ کو آنچ	شوکت تھانوی	180/-
سپنے	شوکت تھانوی	150/-
سدابہار مزاحیہ تحریریں	فاروق ارگلی	125/
شگفتگی دل کی	خالد محمود	150/-
شگوفے	شفیق الرحمٰن	130/-
شوخیٔ قلم	اسد رضا	125/-
طنزیات ومضحکات	رشید احمد صدیقی	60/-
فی البدیہہ	یوسف ناظم	45/-
فی الحقیقت	یوسف ناظم	45/-
فی الغور	یوسف ناظم	30/-
قصور معاف	انیس سلطانہ	125/-
کالم برداشتہ	مجتبیٰ حسین	300/-
کرنیں	شفیق الرحمٰن	95/-
گرد کارواں	کنہیالال کپور	50/-
گرگٹ	شوکت تھانوی	100/-
گنجہائے گرانمایہ	رشید احمد صدیقی	45/-
گوشے میں قفس کے	دلیپ سنگھ	45/-
لو آج ہم بھی صاحب کتاب ہوگئے	شفیع احمد	175/-
لہریں	شفیق الرحمٰن	120/-
مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں (اول)		250/-
مجتبیٰ حسین کے سفرنامے	مجتبیٰ حسین	250/-
مجتبیٰ حسین کے شخصی خاکے (دوم)		250/-
مجتبیٰ حسین کے منتخب کالم	مجتبیٰ حسین	250/-
مدوجزر	شفیق الرحمٰن	95/-
مریخ کی سیر	شوکت تھانوی	110/-
مزید حماقتیں	شفیق الرحمٰن	180/-
مسٹر چار سو بیس	شوکت تھانوی	130/-
مضامین رشید	رشید احمد صدیقی	40/-
منجملہ	یوسف ناظم	51/-
موج در موج	ڈاکٹر سید حامد حسین	100/-
مولانا	شوکت تھانوی	125/-
ہم زلف	شوکت تھانوی	110/-
ہمارے ذاکر صاحب	رشید احمد صدیقی	25/-

ڈاکٹر طاہر تونسوی
صدر شعبۂ اردو سرگودھا یونیورسٹی، پاکستان

ریویو آرٹیکل

''ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا'' کا انشائی تناظر

پروفیسر خورشید جہاں کا تعلق ہزاری باغ (جھارکھنڈ) سے ہے اور وہ ونوبا بھاوے یونیورسٹی، ہزاری باغ میں شعبۂ اردو کی چیئر پرسن رہی ہیں۔ وہ ۱۷ر جولائی ۱۹۴۷ء کو اس جہانِ فانی میں آئیں اور ۲۹ر نومبر ۲۰۰۵ء کو اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔ ''جدید اردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات'' ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے جو کتابی شکل میں کئی بار شائع ہو چکا ہے۔ اس لیے کہ یہ اپنے موضوع کے اعتبار سے خاصی اہمیت کا حامل ہے، بقول ڈاکٹر جلیل اشرف ''یہ پروفیسر خورشید جہاں کی اہم کتاب ہے اور اردو تنقیدی ادب کی تاریخ میں شاملِ نصاب کتب میں اس کی منفرد حیثیت ہے۔ تنقیدی ادب کے طلبا و طالبات کی تشفی بخش رہبری و نیز مطالعے کے حق میں یہ کتاب ملک کی مختلف یونیورسٹیوں میں بی۔اے اور ایم۔اے کے نصاب میں شامل ہے۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ کتاب مختصر ہونے کے باوجود جامعیت رکھتی ہے اور اس موضوع کا بھرپور احاطہ کرتی ہے۔ علاوہ ازیں اس سے ڈاکٹر خورشید جہاں کی تحقیقی اپج اور عمیق مطالعے کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے ۔اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک تخلیقی فن کار بھی ہیں، خاص طور پر انہوں نے صنفِ انشائیہ کی طرف توجہ کی ہے۔ ان کے انشائیوں کا مجموعہ ''ہوئے کیوں نہ غرق دریا'' کے نام سے منشا پبلی کیشنز ہزاری باغ سے ۲۰۰۸ء میں بعد از مرگ شائع ہوا ہے اور اس میں چودہ انشائیے شامل ہیں۔

انشائیہ میرے نزدیک ایک نہایت ہی لطیف صنف ہے۔ بعض نثر نگاروں نے اسے صنفِ کثیف بنا دیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ خاصی متنازع ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ خود صنفِ انشائیہ کے موجد بن بیٹھے ہیں اور اپنے حوارین اور مزارعین کے غُل غپاڑے سے اس کی لطافت کو مجروح کرتے ہیں جس کی بنا پر ڈاکٹر سلیم اختر نے اسے انشائیہ کا سراپا قرار دیا ہے۔ اس لیے کہ سپاٹ قسم کی تحریر اور اس کے بے مزہ طرزِ بیان کو انشائیہ کہنا زیادتی کے مترادف ہے کہ ان میں نہ مزاح کی چاشنی ہے اور نہ لطافتِ خیال اور نہ ہی زیرِ لب تبسم کی کیفیت ہے اور پھر اس میں اظہارِ ذات ہی اظہارِ ذات ہو تو ایسی تحریر کو پڑھتے ہوئے نیند آنے لگتی ہے۔ اگر شب خوابی کی شکایت کرنے والے مریضوں کے کمروں میں اس قسم کی تحریر لٹکا دی جائے تو سلیپنگ پلز کی حاجت نہیں رہتی۔ تاہم ایسے نثر نگار بھی موجود ہیں جو انشائیے کو اپنے جاندار اور شاندار جملوں سے لطافتِ فکر و خیال کا مرقع بنا دیتے ہیں جو قاری پر خوشگوار تاثر کا حامل ہوتا ہے۔ ایسے باکمال قلمکاروں اور انشائیہ نگاروں میں ڈاکٹر خورشید جہاں کا نام بھی شامل ہے۔ ان کے انشائیوں نے صنفِ انشائیہ کو نہ صرف توانائی عطا کی ہے بلکہ اسے ایک منفرد رُخ بھی دیا ہے

اور انشائی انداز کو حقیقت سے قریب تر کرتے ہوئے حقیقت بنا دیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انفرادی اور اجتماعی دونوں حوالوں سے انہوں نے سچ کا منظر نامہ تشکیل کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کو پڑھنا شروع کریں تو ختم کئے بغیر اٹھنے کو جی نہیں چاہتا اور ہر انشائیے کے بعد دوسرا انشائیہ پڑھنے کے لیے قاری کی دلچسپی اور بڑھ جاتی ہے اور تجسس کا جذبہ بھی بیدار ہو جاتا ہے۔ اسے ڈاکٹر خورشید جہاں کے اسلوب کی معجز بیانی قرار دیں تو مبالغہ نہیں ہوگا۔ ایک بات اور بھی ہے کہ انہوں نے اپنی سوچ کو بے جا پھیلاؤ نہیں دیا بلکہ مختصر طور پر واقعات کا تانا بانا بننے کی کوشش کی ہے اور اسے لذت سے بھرپور بیانیہ رہنے دیا ہے۔ میری محولہ بالا باتوں کی تصدیق یوسف ناظم کے پیش لفظ اور ڈاکٹر سلیم اختر کے تعارف سے بھی ہو جاتی ہے کہ اول الذکر خود انشائی مزاج رکھتے ہیں اور موخر الذکر اپنی تنقیدی فکر کے حوالے سے انشائی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ یوں تخلیق کار اور ناقد الگ الگ رویے رکھنے کے باجود ایک ہی نتیجے پر پہنچتے ہیں اور میں اسے ڈاکٹر خورشید جہاں کی کامیابی تصور کرتا ہوں کہ وہ اپنی تحریروں پر ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے صاحبان قلم سے داد وصول کرنے میں کامرانی سے ہمکنار ہوئی ہیں۔ یوسف ناظم پیش لفظ میں لکھتے ہیں'' میں اپنی حد تک خواتین کے لکھے ہوئے مزاح کو بیگماتی مزاح سمجھتا ہوں، اس لیے کہ ان کے مزاح میں ملائمیت نسبتاً زیادہ وہتی ہے اور اس ملائمیت کو نبھانے کا سلیقہ بھی شاید انہیں کا حصہ ہے۔۔۔۔ مزاح کو حالی نے بادِ صبا کا جھونکا کہا ہے اور ان جھونکوں سے میں خورشید جہاں کے ہزاری نہ سہی تحریری باغ میں لطف اندوز ہوا ہوں لیکن ایسا نہیں ہے کہ موصوفہ طنز نہیں فرماتی ہیں۔ وہ صرف دل بہلاتی نہیں دل دکھاتی بھی ہیں اور اس رویے میں بھی اس بات کی احتیاط ملحوظ رکھتی ہیں کہ دل اتنا دکھے کہ چیخ نہ جائے۔ وہ نشتر زنی نہیں فرماتیں صرف نوک قلم چبھو کر بتاتی ہیں کہ مواد فاسد کہاں ہے۔ ہلکی سی چٹکی بھی لیتی ہیں تو ٹیس نہیں اٹھتی صرف کسک کا لطف انگیز احساس ہوتا ہے۔'' (ص ۱۰،۹۔۸)

اور اب اسی ضمن میں ڈاکٹر اختر کی رائے ملاحظہ کیجئے۔

'' ادبی تحقیق میں ژرف نگاہی سے کام لینے والی خورشید جہاں طنز میں بھی باریک بینی کا ثبوت دیتی ہیں مگر اس میں بھی دوسروں کے بجائے خود کو ہدف قرار دے کر اپنے قلم سے خود پر چاند ماری کی جو آسان نہیں... خورشید جہاں کے طنز میں یہی رنگ غالب نظر آتا ہے'' (ص ۱۴۔۱۳)

ان دونوں آراء کو پیش نظر رکھ کر یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر خورشید جہاں بنیادی طور پر طنز نگار ہیں اور مزاح کے رنگ میں اس سے کام لیتی ہیں اور اپنی ذات کے حوالے سے معاشرتی برائیوں اور سماجی خرابیوں پر ہلکا سا نشتر چلا کر انہیں بے نقاب کرتی ہیں اور چونکہ ان کا تعلق تدریس کے پیشے سے ہے اس لیے تعلیم، تعلم، امتحانات، روزگار تدریس اور اس سے تمام متعلقات ان کے انشائیوں کا موضوع ٹھہرتے ہیں۔ گویا وہ خود احتسابی کے عمل سے گذرتے ہوئے سماج کی جانب رُخ پھیرتی ہیں اور اپنی ذات کے آئینے کو آلات بنا کر دیگر افراد کو ان کا چہرہ دکھاتی ہیں۔ یہ تو ان کی تحریروں کا ایک رُخ ہے مگر وہ طنز کے ساتھ ساتھ مزاح کا دامن نہیں چھوڑتیں بلکہ شگفتگی کو ساتھ ساتھ لیے چلتی ہیں کہ مقصود تو اصلاح ہوتی ہے اگرچہ وہ کہیں پر بھی مصلح کا کردار ادا نہیں کرتیں، البتہ استاد کا رول

ادا کرتی ہیں کہ اپنے طالب علموں کو ہر اونچ نیچ سے آگاہ کرنا اور مصائب زیست کی سنگلاخ شاہراہوں پر چلنے کا گر بتاتی ہیں اور اس کے لیے وہ موضوعات اور کردار اپنے گردوپیش سے لیتی ہیں اور ان کرداروں کو اپنے حصار میں لینے کے بعد ان کی اچھی طرح خبر لیتی ہیں اس تناظر میں ان کے مضامین میں کائنات رنگ و بو کی تمام کیفیات سامنے آجاتی ہیں اور اس میں ان کے اپنے مشاہدے کو بڑا دخل حاصل ہے اور پھر ان کی روشنی میں وہ جن تجربات اور مراحل سے گزرتی ہیں اپنے قاری کو آشنا کرتی ہیں اور انہیں اس بارے میں غوروفکر پر آمادہ کرتی ہیں۔ مضامین کے عنوانات سے نفس مضمون کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ کہاں مزاح کے پھول کھلتے ہیں اور کہاں طنز کے نشتر چلتے ہیں اس حوالے سے ''من کہ...، اعجاز مئے، ہوئے کیوں نہ غرق دریا، ٹائم باؤنڈ پروموشن، میری قدر، شوگرنامہ، سنئے، بچت کے ہاتھوں، مجھے میری ہر دلعزیزی نے مارا'' خاصے کی چیزیں ہیں۔

ڈاکٹر خورشید جہاں کے متنوع مضامین، خوشنما اور دل فریب انشائیوں اور جاذب نظر تحریوں کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کی روشنی میں ان کے بچے قلم سے نکلے ہوئے شہ پاروں کے نمونے دیکھنا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجئے:

''باجی پہلے ہمیں بانگ درا کا مطلب سمجھا دیجئے۔'' سامنے کی بینچ سے آواز آئی۔ میں نے گھور کر دیکھا۔ ساری لڑکیاں بڑے انہماک سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔

''بانگ درا... بانگ درا...'' میں نے زیرلب دو تین مرتبہ دوہرایا۔ اچانک میرے ذہن کے کسی گوشے میں اس کا مطلب کلبلایا، ''بانگ کا مطلب ہے مرغے کی مخصوص آواز جو وہ صبح سویرے جگانے کے لیے حلق سے نکالتا ہے...''

لڑکیوں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔

''...درا دراصل در سے بنا ہے مگر یہاں شاعر کی مراد مرغے کے دربے سے ہے جہاں صبح صبح مرغا بانگ دیتا ہے۔ اس طرح بانگ درا کا مطلب ہے دربے سے ابھرنے والی آواز جو صبح کا پیغام سناتی ہے'' (من کہ... ص ۲۱)

☆

''اور دیکھئے یہ اردو کی کاپیاں ہیں۔ اس لیے نمبر دیتے وقت خیال رکھئے گا کوئی فیل نہ ہونے پائے۔'' انہوں نے تاکید کی۔

''جی... جی... بہت اچھا۔'' ہم نے سنبھلتے ہوئے جواب دیا۔ ہماری سمجھ میں خاک نہ آیا کہ اگر یہ اردو کی کاپیاں ہیں تو اس میں کسی کو فیل کیوں نہیں ہونا چاہئے اور دوسرے مضامین میں کیوں فیل ہونا چاہئے۔ ہم نے سلیم صاحب سے پوچھا ''کیوں بھئی؟ اردو میں کیوں نہیں فیل ہونا چاہئے باوجودیکہ لڑکے نے کچھ بھی نہ لکھا ہو...؟''

'' اگر لڑکے اردو میں فیل ہونے لگے تو پھر پڑھے گا کون اور اگر کوئی اردو نہ پڑھے گا تو ہمیں کون پوچھے گا۔''

(اعجازِ مئے، ص ۳۱۔۳۰)

☆

اتنے دنوں میں اندازہ ہو ہی چکا تھا کہ لڑکوں کو صرف نوٹس چاہئے جسے رٹ کر امتحان پاس کر سکیں ،پھر بھی سوچا آنرز کے طالب علم ہیں شاید پڑھنے سے دلچسپی رکھتے ہوں مگر یہاں بھی وہی معاملہ تھا۔ چنانچہ ہم نے فوراً سپر ڈال دی اور پوچھا، ''کس موضوع پر نوٹس چاہیئے؟''

''گالب کی گجل گوئی پر۔''

''جی!'' ہمارے سر گھوم گیا

''گالب کی گجل گوئی لکھوا دیجئے سر!'' سامنے کی بینچ پر بیٹھا ہوا لڑکا جو زیادہ تیز طرار معلوم ہوتا تھا پٹ سے بولا۔

''آپ کا نام کیا ہے؟'' ہم نے بھنا کر پوچھا

''ذلیل عارپ۔'' جواب ملا۔

''یہ کیا ہوتا ہے۔'' نام کا مطلب ہماری سمجھ سے بالاتر تھا۔

''جلیل عارف سر!'' ایک لڑکی نے ہنس کر بتایا۔

(ہوئے کیوں نہ غرق دریا ص ۴۴۔۴۳)

☆

''تم اپنا علاج کسی اچھے ڈاکٹر سے کیوں نہیں کرواتے ،آج سائنس اتنی ترقی کر چکی ہے کہ پیدائشی نامردوں کا علاج بھی ممکن ہے۔''

''کیا بک رہے ہو تم! کہیں پاگل تو نہیں ہو گئے!'' ہمیں اپنے دوست کی دماغی حالت پر شک ہونے لگا۔

''پاگل میں نہیں ،تم ہو گئے ہو۔ اتنے اچھے اچھے رشتے آئے مگر تم نے انکار کر دیا۔ انکار کی کوئی وجہ ہو گی اور وہ وجہ یہی ہے کہ تم شادی کے قابل نہیں ہو۔'' دوست نے دلیل دی۔

''واہ واہ، شاباش!'' ہم نے تالی بجا کر دوست کو شاباشی دی، ''ارے میاں ہم نے شادی سے نہیں جہیز سے انکار کیا ہے۔''

(میری قدر... ص ۷۳۔۷۲)

☆

ایک دلچسپ بات بتانا تو ہم بھول گئے۔ ایک صبح ٹہلتے ہوئے ہم مرض دوستوں سے ملاقات ہو گئی ہم نے ان سے ان کے کامیاب نسخوں اور کچھ نئے نسخوں کے بارے میں دریافت کیا تو بڑی مسکین صورت بنا کر کہنے لگے۔

''نہیں بھائی ان سب سے کچھ نہیں ہوتا آج کل ہم لوگ بھی انسولین لے رہے ہیں۔''

''آفتاب بھائی آپ؟''

''ہاں میں بھی۔''

''اور مقبول صاحب؟''

''وہ بھی۔''

''سنہا جی؟''

''سب کے سب!''

(شوگر نامہ ص ۸۷)

اسی طرح ''قرض کی پیتے ہیں، دام تمنا، کٹے زندگی مستی سے، سنئے کہ نہ سنئے، وہ...ایک دن، بچت کے ہاتھوں'' پڑھتے ہوئے نہ صرف لطف آتا ہے بلکہ پتے کی باتوں کا پتہ بھی چل جاتا ہے۔''مجھے میری ہر دلعزیزی نے مارا'' گھر گھر کی کہانی لگتی ہے جس میں مزاح سے زیادہ طنز موجود ہے۔

جیسا کہ میں نے کہا کہ ڈاکٹر خورشید جہاں کے ان انشائیوں میں دلچسپی کا عنصر اور سوچنے پر مجبور کردینے والی باتیں اور پھر ان کا اسلوب اسقدر سادہ ہے کہ ان کی ہر بات دل میں اترتی جاتی ہے اور سماجی صورت حال کی رنگارنگ تصویریں دیکھنے اور پڑھنے کو ملتی ہیں کہ کتاب ختم کئے بغیر چارہ نہیں رہتا اور ہم خود بھی ان تحریروں کے کردار معلوم ہونے لگتے ہیں۔

''ہوئے کیوں نہ غرق دریا'' کے سبھی انشائیے بے ساختگی کا مظہر ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک ہی نشست میں لکھے گئے ہیں۔ اس لیے انہیں ایک ہی نشست میں پڑھا جاسکتا ہے اور میرے نزدیک یہی ایک خوبی کیا کم ہے کہ آپ کو پڑھنے والے مل جائیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے صحیح لکھا ہے کہ ''زندگی بڑی اہم اور پر تنوع ہے جبکہ معاشرہ میں صدہا مسائل ہیں، یہ بھی موضوع بنائے جاسکتے ہیں۔ مجھے توقع ہے کہ خورشید جہاں ان پر بھی نظر ڈالیں گی اور بطور طنز نگار معاشرہ کا قرض چکانے کی سعی کریں گی۔'' یہ تحریر ۲۷ رستمبر ۲۰۰۴ء کی ہے جو ڈاکٹر خورشید جہاں کی زندگی میں لکھی گئی تھی مگر کتاب ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی ہے اور اس کا تذکرہ ڈاکٹر جلیل اشرف نے ''دوحرف'' میں کردیا ہے۔ ان کا یہ کہنا درست ہے کہ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے ان کے اپنے تجربات اور مشاہدات پر مبنی ہے۔ حقائق ہیں جو تلخ ہیں لیکن انہیں قابل قبول بنانے کے لیے انشائیہ کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ کوئی بھی ان سچائیوں سے گزر سکتا ہے''۔

ان دونوں باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان انشائیوں کا مطالعہ کریں تو واقعی ڈاکٹر خورشید جہاں نے معاشرے اور زندگی دونوں کے تلخ حقائق اور صدہا مسائل کو نہایت ہی شگفتہ انداز میں بیان کردیا ہے اور ان کا لکھا ہوا ہر لفظ سوچ وفکر کی دعوت دیتے ہوئے اکیسویں صدی کے انسان کو بجا طور پر احساس دلا رہا ہے کہ ہوئے کیوں نہ غرق دریا! کیوں آپ کا کیا خیال ہے؟

اہم کتابیں

فرہنگ کلام میر (چراغ ہدایت کی روشنی میں) عبدالرشید -/250
۲۰ ویں صدی (نصف اول) کے اردو مصنفین سنجیدہ خاتون -/137
۸۰ دن میں دنیا کا سفر صفدر حسین -/20
آؤ سمندر کی سیر کریں محمد شمس الحق -/20
نوائے ظفر (انتخاب کلام ظفر) خلیل الرحمٰن اعظمی -/130
مضامین نو خلیل الرحمٰن اعظمی -/172
زاویہ نگاہ خلیل الرحمٰن اعظمی -/138
فکر و فن خلیل الرحمٰن اعظمی -/151
گلبانگ خیام (عمر خیام کی فارسی رباعیوں کا منظوم ترجمہ) عصمت جاوید -/50
نذیر احمد (مونوگراف) جمیل اختر -/50
شیخ محمد ابراہیم ذوق (مونوگراف) مخمور سعیدی -/30
دہلی کے محاورے سید ضمیر حسن دہلوی -/100
جل ترنگ (ناول) مقدر -/150
امیمہ (دیوان رباعیات) شاہ حسین ہندی -/100
یہ کھنڈر میرے ہیں کشمیری لال ذاکر -/105
یادوں کے نقوش (خاکے) ڈاکٹر جلیل الرحمٰن صدیقی -/150
بھوپال میں اردو تحقیق و تنقید کا ارتقا انیس سلطانہ -/500
باقیات باقر مہدی یعقوب راہی -/200
جذبی مشتاق صدف -/40
سیماب اکبرآبادی حامد اقبال صدیقی -/40
احتشام حسین شہزاد انجم -/40
اسماعیل میرٹھی عادل اسیر -/40
لاوا (افسانے) رحمان شاہی -/200
سنہرے خواب (بچوں کی نظمیں) نسیم اللہ عدیم -/15
۱۸۵۷ کے راہ نما (سوانحی خاکے) NCPUL -/349
میرے ڈرامے لندن میں شمس الدین آغا -/400
آیات سخن (شعری مجموعہ) منان بجنوری -/100
اشک لہجے (شعری مجموعہ) ڈاکٹر ظفر مرادآبادی -/150

کرسی کی کشمکش میں وطن ہاتھ سے گیا منظور عثمانی -/200
جوش ملیح آبادی لفظیاتی و نفسیاتی رجحانات محمد عرفان -/150
ساحر لدھیانوی حیات اور شاعری سید ضیاء الرحمٰن -/150
ادبی روش (تحقیقی و تنقیدی مضامین) ندیم احمد ندیم -/100
انتظار (شعری مجموعہ) شیو کے کمار -/90
انتخاب کلیات عارف ڈاکٹر وسیم بیگم -/200
کوثر چاندپوری ظفر احمد نظامی -/40
عالمی اردو ادب (اکتوبر 08) نند کشور وکرم -/300
آمد (پاکٹ سائز) بشیر بدر -/40
آسمان بشیر بدر -/40
تاریخ بغاوت ہند (1857) پنڈت کنہیا لال -/550
سیکولرزم بغاوت اور مسلمان ڈاکٹر ابوذر کمال الدین -/150
رحمٰن رنگ (دوھے) عابد پیشاوری -/100
عطاء اللہ پالوی فکر و آگہی (حصہ دوم) شیر امام -/270
نئے کتنے موڑ (ناول) -/150
تنقید تذکروں سے عصر حاضر تک ڈاکٹر ریشماں پروین -/300
اقبال متین کے افسانے اقبال متین -/700
اختر الایمان کی نظم نگار ڈاکٹر شمشاد جہاں -/150
تاریخ تصوف علامہ اقبال -/32
جمعہ: اسلام کا ایک نادر تحفہ مفتی محمود احمد صدیقی -/60
سردار جعفری کی نادر تحریریں ڈاکٹر محمد فیروز -/400
قصہ درد سناتے ہیں پروفیسر طاہر محمود -/500
اردو کے مزاحیہ افسانے ڈاکٹر مظہر احمد -/340
عکس بر عکس ڈاکٹر شمیم احمد صدیقی نگینوی -/150
موگھیا لوک کہانیاں وقار صدیقی -/70
نئے تنقیدی مسائل اور امکانات کرامت علی کرامت -/350
درد ابھی محفوظ نہیں انیس انصاری -/250
جزیرہ میری عافیت کا شفیق عباس -/200
تنہا نہیں ہوں میں اعجاز انصاری -/150

محمد فاروق خاں فراز

حمد

تو ماورا زماں سے تو ماورا مکاں سے
اب ہو گیا یقیں یہ دل ہے مقام تیرا
آنکھوں میں اشک بھر کر تجھ کو ہیں یاد کرتے
اوراقِ دل پہ اپنے لکھا ہے نام تیرا
افلاک کی بلندی ہے تیری عظمتوں سے
ہر ذرۂ خاکی بھی لیتا ہے نام تیرا
ہے صفحہ قرآں کیا تصویرِ حسنِ معنی
ہر دل کو کھینچتا ہے حسن کلام تیرا
شادابیٔ جہاں بھی اجڑے ہوئے مکاں بھی
اک ہے تری نوازش اک انتقام تیرا
دونوں جہاں کا حاصل تیری نگاہ الفت
بیدار شب کو رکھتا دل کو پیام تیرا

سید شکیل دسنوی

نعت

یہ قبلۂ عالم آپؐ کا در　　یٰسین لقب یٰسین لقب
ہے آپؐ سے روشن ہر منظر　　یٰسین لقب یٰسین لقب
نبیوں کی امامت آپؐ نے کی　　نورانی زیارت آپؐ نے کی
ہے آپؐ سے کوئی کب برتر　　یٰسین لقب یٰسین لقب
وہ اسم مبارک آپؐ کا تھا　　آدم نے حوالہ جس کا دیا
تب جا کے ہوئی رحمت کی نظر　　یٰسین لقب یٰسین لقب
موسیٰ نے خبر تورات سے کی　　عیسیٰ نے بشارت آپؐ کی دی
آئے تھے حوالے سب لے کر　　یٰسین لقب یٰسین لقب
ایوب نے پائی کس کی کسک　　یوسف میں عیاں تھی کس کی جھلک
اے نازشِ خالق، شانِ بشر　　یٰسین لقب یٰسین لقب
ہو داورِ محشر سامنے جب　　قسمت کا کرے وہ فیصلہ جب
ہو آپؐ کا سایہ ہم سب پر　　یٰسین لقب یٰسین لقب
جس میں نہ کجی کا موڑ ملے　　جو لطف الٰہی تک پہنچے
سید کو دکھا دیجے وہ ڈگر　　یٰسین لقب یٰسین لقب

سید امین اشرف

غزل

قباحتوں سے گزرنا ہے در بدر چلنا
اگر تلاشِ سکوں ہے تو اپنے گھر چلنا

ہمیشہ خوش نہیں آتا دماغ کا سوچا
نہ سوچنا ہو تو پھر دل کی راہ پر چلنا

یہیں سے نکلے گی کوئی سلامتی کی راہ
بھٹکنا ٹھوکریں کھانا، اِدھر اُدھر چلنا

مسافروں کو ہے تسخیرِ مہر و ماہ کی دُھن
جنہیں نہ آیا نہ آئے گا خاک پر چلنا

اندھیری رات میں یوں بھی نظر نہیں آتا
ہنروری ہے اجالوں میں دیکھ کر چلنا

جو ڈوبنے کا ہے امکاں تو بچ بھی سکتے ہیں
کہ دوستی سے تو بہتر ہے ناؤ پر چلنا

اس ایک بات پہ یکساں ہیں عارف و عامی
میاں یہ عشق ہے چلنا تو بے خبر چلنا

چراغ بجھ نہ سکا گو قضا کی زد پر تھا
وہ دلنواز ہواؤں کا رات بھر چلنا

فہیم جاوید
سعودی عرب

غزلیں

ہے کہاں پر یہاں آدمی شہر میں
کیا خدا ہوگیا ہر کوئی شہر میں

پیالیاں چائے کی ہاتھ میں تھام کر
بن گئے ہیں سبھی فلسفی شہر میں

قہقہے بھی یہاں کھوکھلے ہوگئے
رو رہی ہے فقط اب ہنسی شہر میں

ہر کوئی اپنے ہی آپ میں قید ہے
بے بسی بن گئی زندگی شہر میں

ہر سڑک ہر گلی ہر قدم فاصلے
پَل رہی چار سُو برہمی شہر میں

پھیلتی جارہی ایک وبا بن کے اب
بے حسی بے حسی بے حسی شہر میں

اپنے ہی دھیان میں اپنی ہی سوچ میں
بہہ رہی دور تک ایک ندی شہر میں

دنیا، صدفی صد ہے دل میں
کہتا ہے، مشہد ہے دل میں

پیشانی پر صاف لکھا ہے
کتنا رد وکد ہے دل میں

پڑھتا ہے قرآن لحن سے
اور فقط ابجد ہے دل میں

شاید کوئی فوت ہوا ہے
ایک نیا گنبد ہے دل میں

سوتا ہوں پتھر پر لیکن
پھولوں کا مسند ہے دل میں

بارش کی خوشبو میں جاویدؔ
آمد ہی آمد ہے دل میں

رفیق رازؔ

غزلیں

جمال سلطنت خاک ہے یہ خاکِ سیہ
اڑے تو رونقِ افلاک ہے یہ خاکِ سیہ

تیرے دیار کی ان نیلگوں فضاؤں میں
مری اڑائی ہوئی خاک ہے یہ خاکِ سیہ

مری ہی آنکھوں سے دریا رواں ہیں چاروں طرف
مجھی سے دشت میں نمناک ہے یہ خاکِ سیہ

ہوا چلے نہ چلے رقص کرتی رہتی ہے
جنونِ عشق میں بیباک ہے یہ خاکِ سیہ

زمیں ہے تخت مرا آسماں ہے سر کا تاج
فقیر ہوں مری پوشاک ہے یہ خاکِ سیہ

یہ خاک کوچۂ دلبر سے اڑ کر آئی ہے
زہے نصیب بہت پاک ہے یہ خاکِ سیہ

رفیق رازؔ میں اتنا بھی تنگ دست نہیں
جہاں میں مری املاک ہے یہ خاکِ سیہ

ابر کے پارے کو میں نے ماہ تاباں کر دیا
ہجر میں اہل نظر کو یوں پریشاں کر دیا

ان مناظر کو تیرے چہرے سے کچھ نسبت نہ تھی
جن مناظر نے مری آنکھوں کو حیران کر دیا

اب کہاں لب پر ہمارے نالۂ آتش فشاں
عہد حاضر میں فلک کو ہم نے ویراں کر دیا

خانۂ تاریک میں ایک گوشۂ تنہائی تھا
حالت وحشت میں اسکو ہی بیاباں کر دیا

استعاروں میں یہ مجھ سے معجزہ سرزد ہوا
سائے کو دیوار سے میں نے گریزاں کر دیا

خواہش دیدار کے شعلوں نے پل بھر کے لیے
غیب کے رنگوں کو منظر میں نمایاں کر دیا

دینے والے اب عطا کر جتنا تجھ سے ہو سکے
میں نے تو صحرائے امکاں کو ہی داماں کر دیا

کرامت علی کرامت
رحمت علی بلڈنگ، دیوان بازار
کٹک 753001 (اڑیسہ)

غزل

بلبل ہوں جب میں اپنا چمن چھوڑ جاؤں گا
ہر برگِ گل پہ رنگِ سخن چھوڑ جاؤں گا

اے آنے والی نسل، نہیں کچھ بھی میرے پاس
مرنے کے بعد جینے کا فن چھوڑ جاؤں گا

پڑھ کر جنازہ عقل وشعور و خرد کا میں
احساس کا اک اُجلا کفن چھوڑ جاؤں گا

ظلم وستم کا ڈٹ کے کروں گا مقابلہ
بزدل نہیں ہوں میں کہ وطن چھوڑ جاؤں گا

اردو زباں کی شکل میں زندہ رہوں گا میں
یوں میں نشانِ گنگ وجمن چھوڑ جاؤں گا

شیشے کی طرح ٹوٹ کے بکھروں گا جس گھڑی
اک داستانِ سنگ وشکن چھوڑ جاؤں گا

میرا مزاج یوں تو کرامتؔ جدید ہے
پر آبروئے طرزِ کہن چھوڑ جاؤں گا

ظفر گورکھپوری

غزلیں

وہ جگہ ڈھونڈ رہا ہوں جہاں رکھوں اُس کو
اور دیکھے نہ کوئی ایک میں دیکھوں اُس کو

اُس کے چہرے پہ کوئی رنگ تو ٹھہرے اک پل
کیسے کھوجوں اُسے، پرکھوں اُسے، سمجھوں اُس کو

اُس کی اپنی بھی نظر کم نہیں دشمن اُس کی
آئینے! اُس سے چھپا کر کہاں رکھوں اُس کو

کیسا رشتہ ہے یہ اُس سے، مجھے معلوم نہیں
اُس کو پانی پہ پڑھوں، ریت پہ لکھوں اُس کو

روز آجاتا ہوں کچھ اور میں اُس کی حد میں
روز یہ سوچوں کہ اب اور نہ سوچوں اُس کو

دل گرفتار جنوں، جسم اسیر بازار!
اک انا رہ گئی، کس خانے میں رکھوں اُس کو

یوں تو اظہار تمنا کے وسیلے ہیں بہت
لطف تو یہ کہ اُسی سے کبھی مانگوں اُس کو

تاکہ وہ ایک زمانے کی امانت بن جائے
لفظ میں قید کروں، شعر میں باندھوں اُس کو

دل کے نزدیک گھاؤ سا کیا ہے
یہ جگر میں الاؤ سا کیا ہے

آگہی کررہی ہے کام اپنا
یہ لہو میں دباؤ سا کیا ہے

کون ہے منتشر دنوں میں ساتھ؟
مجھ میں اک رکھ رکھاؤ سا کیا ہے

روپ اُس کا ہے، رنگ اس کے ہیں
یہ فضا میں رچاؤ سا کیا ہے

راستے کرلئے الگ اُس نے
پھر یہ اُس سے لگاؤ سا کیا ہے

پاؤں پھیلا رہا ہے کیا دریا
سرساحل کٹاؤ سا کیا ہے

کس کے چہرے کی یہ خراش ظفر
آئینے پہ یہ گھاؤ سا کیا ہے

جعفر ساہنی
85/D توپسیا روڈ۔کولکاتا

غزل

(ظفر اقبال کے نام)

دھوپ گھر میں گھٹا بھی چاہئے ہے
تازگی کو ہوا بھی چاہئے ہے

حسن کی پرکشش اداؤں میں
کچھ حجاب وحیا بھی چاہئے ہے

پاک بازی سے صرف کیا ہوگا
دل رُبا سی خطا بھی چاہئے ہے

چین میں رشتہ تھا کسی سے کہاں
وقت غم میں خدا بھی چاہئے ہے

لطف جینے میں یوں نہیں آتا
کچھ بھلا کچھ بُرا بھی چاہئے ہے

مصلحت کے تحت کبھی ہم کو
عاشقی غم نما بھی چاہئے ہے

کر چکے سب دو اسکوں کے لیے
پُر اثر اب دُعا بھی چاہئے ہے

گالیاں سُن کے دل ہوا نہ بُرا
زندگی میں مزا بھی چاہئے ہے

غیظ طوفاں کے درمیاں جعفر
مُسکراتی صبا بھی چاہئے ہے

غزل

ہر طرف منتشر بدگماں روشنی
کھو گئی نرم خومہرباں روشنی

کردے آنکھوں کو سیراب ہر موڑ پر
پایئے گا اب ایسی کہاں روشنی

آندھیوں میں کرن غم نما بن گئی
کہہ سکی کچھ نہیں بے زباں روشنی

رہ گئی کیوں اندھیرا بدن یہ زمیں
جب کہ چھونے لگی آسماں روشنی

زندگی میں تبسم کی راہیں کھلیں
آگئی جب نئی درمیاں روشنی

شہر ارماں گھرا ہے شب تار میں
کس قدر ہوگئی ہے گراں روشنی

چاندنی درد اپنا سمیٹے ہوئے
بانٹتی ہی رہی شادماں روشنی

ضعف پیری سے ہے واسطہ اب مجھے
کل تلک تھا میں کیسی جواں روشنی

وقت کے جسم وجاں کو ملے گی خوشی
کردو جعفر عیاں تم نہاں روشنی

علی ظہیر

غزل

اب دستِ صبا خوش بوئے وفا پھر دیکھیے کب یاں لاتی ہے
کھلنے کے لئے ہر دروازہ آنکھوں سے دل تک راضی ہے

اُس راہِ طلب میں دیکھ لیا ہے کچھ بھی نہیں حسرت کے سوا
اِس راہِ طلب میں دیکھیں گے گرتابِ نظارہ باقی ہے

زلفوں کی طرح سے یادیں بھی کھلتی ہیں بکھرتی ہیں ہر شب
نغموں کی طرح سے راہوں میں جسموں کا ترنم جاری ہے

چہرے کے تقرب سے ہے عیاں جلتی بجھتی شمعوں کا سماں
ہونٹوں کے رسیلے پن میں نہاں کچھ مستقبل کچھ ماضی ہے

اُگتے ہوئے ہاتھ ہیں دھرتی سے جو مانگ رہے ہیں حق اپنا
چھایا ہوا سر پر سورج ہے اور خوان فلک سب خالی ہے

خلیل تنویر

اودے پور، راجستھان

کشمکش

کسی کو شکایت ہے
کہ اسے مرد کے پیکر میں
ایک عورت کا جسم عطا کیا گیا ہے
اور کسی کو یہ گلہ ہے
کہ وہ ایک عورت کے بدن میں
مرد کا وجود محسوس کرتی ہے
یہ لوگ نخلِ سرسبز کی تمنا میں
ایک نامعلوم دشت میں بھٹک رہے ہیں
اور تکمیل کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا

حیرت کدۂ دہر میں

ہر ایک چیز کو حیرت سے دیکھتے ہیں ہم
اس کائنات میں سارا نظام کس کا ہے
یہ بھید کیا ہے کہ جس کا سرا نہیں ملتا
قریب جائیں جو اس کے تو بھسم ہو جائیں
پھر بے حجاب اسے دیکھنے کی حسرت کیوں

مظہر محی الدین

غزل

روشنی کی رہگذر پر نور کا دھارا ہے ڈر
جو نہ جانے قدر و قیمت کیا وہ جانے کیا ہے ڈر

خالی خولی لن ترانی سب دھری رہ جائے گی
ہوش مندو! جان لو ایمان کا حصہ ہے ڈر

علم کا ملجا وماوا دل کا رکھوالا ہے ڈر
رحمتِ باری کی کنجی دل کا دروازہ ہے ڈر

بدنگاہی، بدکلامی، بددماغی کا چلن
عام ہو جاتا ہے دل سے جب نکل جاتا ہے ڈر

ختم ہے اس پر نصیحت ختم سب اجر و ثواب
غیب میں رہتے ہوئے خالق کا جو رکھتا ہے ڈر

کیا ہے یہ خوفِ خدا؟ بخشش کدہ، مشکل کشا
سب بہاروں سے زیادہ کارگر زینہ ہے ڈر

دل کی آنکھوں سے کبھی تو پڑھ کلامِ لم یزل
کیسی کیسی نعمتیں ہم کو عطا کرتا ہے ڈر

سجدہ ریزی کے نشاں بھی بے اماں ہو جائیں گے
آخری دن کے سفر کا اصل سرمایہ ہے ڈر

سب کی قسمت میں کہاں حاصل متاعِ بے بہا
علم جو رکھتے ہیں ان کو ہی عطا ہوتا ہے ڈر

غیر ممکن ہے کڑے وقتوں میں بھی بھٹکے قدم
دل میں جب چٹان کی صورت جگہ پاتا ہے ڈر

جینا مرنا بے حقیقت رائگاں کارِ جہاں
قادرِ مطلق کا دل سے جب نکل جاتا ہے ڈر

مومنوں سے چھین لیتا ہے بڑائی کا بھرم
نرم خُو اور گرم جُو پیکر بنا دیتا ہے ڈر

عافیت تو بس اسی کی عافیت ہے عافیت
جس کے دل میں تا دمِ آخر بسا رہتا ہے ڈر

آج کی رنگینیاں زنجیرِ پا جب بن گئیں
کل کی سنگینی کا مظہر پھر کہاں رہتا ہے ڈر

منزلِ مقصود تک ہر راستہ جاتا نہیں
ایک ہی رستہ ہے مظہر اور وہ رستہ ہے ڈر

متین اچل پوری

غزل

فکر میری ساری پونجی میرا سرمایہ خیال
دیکھنا تو کس بلندی پر مجھے لایا خیال

جبر سے کب ہو سکی زنجیر آشفتہ سری؟
وقت کی یخ بستہ راتوں میں بھی گرمایا خیال

اپنی مٹی سے رہیں میری جڑیں وابستہ تر
آسماں کی وسعتوں میں جب مجھے لایا خیال

اس اماوس میں پس دستک تجلی زار تھا
کوندی جب بجلی تو اک لمحے کو گھبرایا خیال

قصرِ دل کا کیجئے آثارِ قدیمہ میں شمار
فکروفن بے آبرو ہے آج بے مایہ خیال

دور تک پھیلی ہوئی اِس بے دلی کو کیا کہیں
مُدّتوں کے بعد تیری بزم میں لایا خیال

دل کی خاطر روح افزا اک تجلی زار تھا
عقل کو اُڑتا ہوا جگنو نظر آیا خیال

اک عجب جھنکار تھی میرے خرابے میں متینؔ
خامشی میری شناسا، میرا ہم سایہ خیال

نظر بریلوی
کویت

غزلیں

امیدوں میں جو تھوڑی روشنی ہے
ہوا کا سائباں سے چاؤ کیسا
یہی تو حاصل آوارگی ہے
سفرزادی میں یہ بدلاؤ کیسا

نگاہیں خشک سالی کاٹتی ہیں
ہماری سوچ کا محور جدا ہے
مگر پلکوں کی ہر وادی ہری ہیں
ہمارا آپ کا ٹکراؤ کیسا

مرے سائے کے جزر و مد نہ دیکھیں
کوئی امکان خود بھی مشتہر ہو
مرے اندر عجب خوش قامتی ہے
ارادوں کا فقط پھیلاؤ کیسا

ارادے ٹوٹ جاتے ہیں ہمیشہ
خیالی معجزوں کے بیج بو کر
ندی تو ورنہ پیاسے ڈھونڈتی ہے
ہوائی فصل پر پتھراؤ کیسا

کہاں تک بیکراں جذبے سنبھالوں
کبھی تو سوچ کر چنتے ہیں منزل
مرے اندر بھی آخر آدمی ہے
ندی بن جاؤ تو ٹھہراؤ کیسا

مرے نقاد خود میرے لیے بھی
تھکن زادی طبیعت زہر پی لے
مری ہستی ابھی تک اجنبی ہے
رگوں ریشوں میں یہ بکھراؤ کیسا

میں غیرت مند کس سے قرض مانگوں
بکاؤ شے تو پرکھی جائے گی ہی
تمنا رزق اپنا مانگتی ہے
سرِ بازار اتنا تاؤ کیسا

ڈاکٹر عامر قدوائی

غزل

ہماری آنکھ کا ہر رنگ شام ایسا تھا
زبانِ درد کا قصہ تمام ایسا تھا

بدن میں پھر نہ ہرا ہوسکا کوئی موسم
خموش لفظوں میں اُس کا پیام ایسا تھا

فنا کا حکم تھا اُس کو حدود کے باہر
فرشتہ رک گیا آگے مقام ایسا تھا

تمام گھر کی صداؤں پہ خوف طاری تھا
فصیلِ شہر کے اندر نظام ایسا تھا

سدا بہار تبسم ہے آج تک لب پر
غموں کا دل میں کبھی احترام ایسا تھا

نفس نفس میں محبت کے چاند روشن تھے
کہ ختم ہجر کہیں اہتمام ایسا تھا

اُتر رہی ہے رگ و پے میں ایک لذت سی
تری جھکی ہوئی نظروں کا جام ایسا تھا

لبوں سے لفظ برستے تھے پھول کی مانند
محبتوں میں کبھی اک مقام ایسا تھا

رؤف خیر
حیدرآباد

غزل

شرطوں پہ اپنی کھیلنے والے تو ہیں وہی
مہرے "سفید گھر" میں بھی کالے تو ہیں وہی

شاخوں پہ سانپ ہیں تو شکاری ہیں تاک میں
سہمے پرندے ان کے نوالے تو ہیں وہی

پہچاننے میں ہم کو تکلف ہوا انہیں
حالانکہ اپنے جاننے والے تو ہیں وہی

وارث بدل گئے کہ وصیت بدل گئی
لیکن گواہ اور قبالے تو ہیں وہی

اب ان پہ انگلیوں کے نشانات اور ہیں
ہر چند اپنے قتل کے آلے تو ہیں وہی

کھلواڑ کر رہے تھے جو ہم سے وہ کھل گئے
یہ اور بات حیلے حوالے تو ہیں وہی

ساری حیات جن کی اندھیرے میں کٹ گئی
اندھیر ہے کہ خیر جیالے تو ہیں وہی

محمد حنیف کاتب
کویت

غزلیں

سلسلے فکروفن کے تھے ہی نہیں
ہم تو اس انجمن کے تھے ہی نہیں

کیوں پلٹ کر کبھی نہیں دیکھا
کیا بلاوے وطن کے تھے ہی نہیں

ہم تھے شہر پناہ میں محفوظ
ہم سپاہی تو رن کے تھے ہی نہیں

پھول ہی تھے جو ہم کو بھیجے گئے
دشت کے تھے چمن کے تھے ہی نہیں

سب نوشتے تو ہم نے دیکھ لیے
وہ حوالے متن کے تھے ہی نہیں

ہائے وہ ربط باہمی کی فضا
فاصلے ماومن کے تھے ہی نہیں

اب کھلا ہم پہ وہ سبھی رشتے
تن کے تھے سارے من کے تھے ہی نہیں

اب کے صحرا ہواؤں میں موجود ہے
جسم کیا روح تک گرد آلود ہے

عشق کی مملکت غیر محدود ہے
یاں کوئی ہست ہے نہ کوئی بود ہے

اک ذرا اس طرف بھی ہو نظر کرم
تیرے در پر کوئی کب سے مسجود ہے

آہنی چادریں وہ بھی سیسہ چڑھی
اس سے آگے کی رہ اب بھی مسدود ہے

گوشوارے میں تبدیلی کردی گئی
تب زیاں تھا ابھی سود ہی سود ہے

راشد انور راشد

غزل

سفر میں اب کے ہوا اطمنان، ریگستان
سنائی دیتی ہے مجھ کو اذان، ریگستان
ہوا کی ضد ہے کہ تجھ کو تباہ کردے گی
دکھادے اپنی انا، آن بان، ریگستان
سلگتی ریت میں ہی تربیت جنوں کی ہوئی
یہی تو ہے مری وحشت کی شان، ریگستان
کسی طرح سے اگر آگیا سمندر بھی
مٹا نہ پائے گا میرا نشان، ریگستان
کوئی بھی رُت ہو، نتیجہ نہیں نکلتا ہے
میں دے رہا ہوں عجب امتحان، ریگستان
ہرے بھرے جو علاقے تھے، ہیں سرفہرست
ادا ہے کرنا تجھے بھی لگان، ریگستان
تو ہر نگاہ میں، ہر دل میں ہے مگر کب سے
تیری تلاش میں ہے اک جہان، ریگستان
وہ ٹولی روندنے نکلی ہے تیری وسعت کو
کہ اب سنبھال لے تیروکمان، ریگستان
میں ڈھونڈھتا ہوں کہ پھر کھو گیا ہے برسوں سے
تمہیں کہیں پہ مرا خاندان، ریگستان
اگر وجود کی وادی بھی ہوگئی، معدوم
تو سوچ لینا ہے وہم وگمان، ریگستان
جو میرا دل تھا وہ ہے سنگ دل کے قبضے میں
نثار کرتا ہوں تجھ پر یہ جان، ریگستان

شجاع الدین شاہد ممبئی

کوئی تو آئے ہدف خود کو بنانے والا
تاک میں بیٹھا ہے ایک تیر چلانے والا

منصفِ وقت نے اس کو بھی لگادی پھانسی
ایک وہی فرد تو تھا گھر میں کمانے والا

نیم وحشی ہے غزل پھر بھی سمو لیتی ہے
اپنے سینے میں ہر ایک درد زمانے والا

شہر بونوں کا ہے سر کو جھکا کر چلیے
قتل ہوجاتا ہے سر اپنا اٹھانے والا

وقت پتھر ہی سہی عزم اگر زندہ ہو
پھول صحرا میں کھلا دے گا کھلانے والا

شہر بے حس ہے یہ احساس کسی کو بھی نہیں
شب کی تنہائی میں روتا ہے ہنسانے والا

غزلیں

کاغذی کشتیاں ہیں سمندر کی آس ہے
اس سادگی کو دیکھ کے دریا اداس ہے

لفظوں سے کھیلنے کا ہنر جانتا نہیں
دعویٰ تو کر رہا ہے کہ غالب شناس ہے

اشجار سارے کھا گئی انسان کی ہوس
جنگل میں جو بچی ہے وہ تھوڑی سی گھاس ہے

کیا ہوگیا سکوں کو نظر کس کی لگ گئی
جس کو بھی دیکھو آج یہاں بدحواس ہے

پھوٹے کہیں سے تو کبھی انصاف کی کرن
اربابِ عدلیہ سے یہی التماس ہے

دستک بلائیں دے کے اچانک پلٹ گئیں
شاید یقیں ہے ماں کی دعا آس پاس ہے

شکیل اعظمی
ممبئی

غزل

ایک سوراخ سا کشتی میں ہوا چاہتا ہے
سب اثاثہ مرا پانی میں بہا چاہتا ہے

مجھ کو بکھرایا گیا اور سمیٹا بھی گیا
جانے اب کیا میری مٹی سے خدا چاہتا ہے

صرف میں ہی نہیں سب ڈرتے ہیں تنہائی سے
تیرگی روشنی، ویرانہ صدا چاہتا ہے

ٹوٹ جاتا ہوں میں ہر سال مرمت کر کے
اور گھر ہے کہ مرے سر پہ گرا چاہتا ہے

دن سفر کر چکا اب رات کی باری ہے شکیلؔ
نیند آنے کو ہے دروازہ لگا چاہتا ہے

سلیمان خمار
ایل آئی جی۔۸۳، جل نگر، بیجاپور۔۵۸۶۱۰۱

اس کی نیندوں میں جب اتر جانا
ہر تمنا کی مانگ بھر جانا
جرم کرنا سکوں چرانے کا
اور الزام اس پہ دھر جانا
عاشقی کا یہی تقاضہ ہے
سرحد عقل سے گزر جانا
بے سبب راہ دیکھنا اس کی
بے سبب روز اسکے گھر جانا
جان کر چھیڑنا اسے ہر دم
جان کر بات سے مکر جانا
جھیل سی نیلی نیلی آنکھوں میں
دل کا بے ساختہ اتر جانا
یوں بھی ہوتا ہے عشق میں اکثر
چیز رکھنا کہیں بسر جانا
ہم نے دیکھا ہے اس کے آتے ہی
دکھ بھری رات کا سحر جانا
اتنا آسان بھی نہیں ہے خمار
دل کا اک شخص کو بسر جانا

گزرتے لمحوں کے دل میں ہمیں پتہ ہے
ہوا کے آنچل پہ کیا لکھا ہے ہمیں پتہ ہے
سلگ رہی ہے کہاں پہ چنگاری نفرتوں کی
دھواں کہاں سے یہ اٹھ رہا ہے ہمیں پتہ ہے
سفینہ کس طرح پار اتاریں یہ ہم سے پوچھو
سمندروں کا مزاج کیا ہے ہمیں پتہ ہے
کہاں کہاں حادثے چھپے ہیں خبر ہے ہم کو
کہاں سے منزل کا راستہ ہے ہمیں پتہ ہے
جو عمر بھر ظلم سے لڑا سندباد بن کر
اسے زمانے نے کیا دیا ہے ہمیں پتہ ہے
وہی جو کرتا ہے امنِ عالم کی بات ہر دم
وہی تو سازش کا سرغنہ ہے ہمیں پتہ ہے
حرف حرف میں بسی ہے معنی کی ایک دنیا
اک ایک نقطے میں کیا چھپا ہے ہمیں پتہ ہے
خزاں نے گلشن سے جاتے جاتے خمار صاحب
صبا کے کانوں میں کیا کہا ہے ہمیں پتہ ہے

فاروق جائسی
کانپور

غزل

خدا کا شکر کیا تم نے سرخرو مجھ کو
جو کر کے چھوڑ دیا ہے لہو لہو مجھ کو

ہے جس کی آرزو، ہے جس کی جستجو مجھ کو
وہی لیے لیے پھرتی ہے کو بہ کو مجھ کو

مرے خدا مجھے ایسی نظر عطا کر دے
اسی کی شکل نظر آئے چار سو مجھ کو

کبھی وصال کی خواہش، کبھی فراق عزیز
کہیں قرار دے اے شہرِ آرزو مجھ کو

اٹھا کے خاک سے پھر خاک میں ملا دے گا
اسی زمین سے دے وہ پھر نمو مجھ کو

میں تار تار و شکستہ بدن کا پیکر تھا
کہاں کہاں کوئی کرتا بھلا رفو مجھ کو

مری بلندی گفتار اسے گراں گزری
ذرا سنبھال کے کرنی تھی گفتگو مجھ کو

میں اپنے گاؤں کی جانب پھر آ گیا فاروق
نہ راس آئی جو شہروں کی ہاؤ ہو مجھ کو

ملک زادہ جاوید

غزلیں

جو جہاں میں ہے، آنجہانی ہے
معتبر کس کی زندگانی ہے

اپنے بچوں پہ کیوں کروں غصہ
ہر کمی ان میں خاندانی ہے

حادثے، تبصرے، تماشائی
یہ بڑے شہر کی نشانی ہے

برف پگھلی ہے کیا پہاڑوں سے
ٹھہرے پانی میں بھی روانی ہے

اس دکاں پر ہے زندگی سستی
یہ دوا واقعی پرانی ہے

اتنی اچھی غزل ہوئی کیسے
سچ بتا کس کی مہربانی ہے

وہ پرندہ ابھی اڑان پہ ہے
اک سجاوٹ سی آسمان پہ ہے

کام سے لوگ جانتے ہیں مجھے
منحصر کون خاندان پہ ہے

آگ اگلتی ہیں گھر کی دیواریں
خیمہ زن دھوپ سائبان پہ ہے

ڈولتی ہے ادھر ادھر کشتی
سارا الزام بادبان پہ ہے

تیری قسمت کا فیصلہ جاوید
اس کی آنکھوں کے امتحان پہ ہے

ڈاکٹر معین الدین شاہین

غزل

تمہیں وہ آدمی جو سر پھرا معلوم ہوتا ہے
مجھے لیکن وہ سچا اور کھرا معلوم ہوتا ہے

مجھے ہمدردیوں سے اب بڑی تکلیف ہوتی ہے
کوئی گر خیریت پوچھے برا معلوم ہوتا ہے

تجھے ٹھکرا نہیں سکتا، اسے اپنا نہیں سکتا
یہ قصہ تو بہت الجھا ہوا معلوم ہوتا ہے

وہ دل ہی دل میں مجھ سے بے تحاشہ پیار کرتا ہے
بظاہر جو بہت مجھ سے خفا معلوم ہوتا ہے

نکل کر بادلوں کی اوٹ سے مہتاب کا پیکر
بہت شفاف اور نکھرا ہوا معلوم ہوتا ہے

میں ایسے شخص پر ہرگز بھروسہ کر نہیں سکتا
کہ جس کا ہر قدم مکر و دغا معلوم ہوتا ہے

نظارہ صبح صادق کا میں جب بھی دیکھتا ہوں تو
خدا چاروں طرف پھیلا ہوا معلوم ہوتا ہے

خدا کا نام لے کر جب بھی میں گھر سے نکلتا ہوں
تو مجھ کو فائدہ ہی فائدہ معلوم ہوتا ہے

عادل رشید
aadilrasheed67@gmail.com

سب نے تسلیم کیا جادۂ منزل جانا
جن پہ آساں تھا اُنہی نے اِسے مشکل جانا

کیا تعجب کہ جو ہم خاک بہ سر پھرتے ہیں
ہم نے ہی تپتے ہوئے صحرا کو ساحل جانا

آگہی شہر کی گلیوں کی خبر رکھتی ہے
اور خرد نے اسے ہر دور میں غافل جانا

اپنی تقدیر بدلنے کا ہنر آساں تھا
ہائے اجداد کہ تم نے اسے مشکل جانا

پوری دنیا تو دکھاوے کے فسوں میں گم ہے
یہ جو اندر ہے اسی نے مجھے باطل جانا

تم نے دنیا کو ہر اک شئے کا بدل مان لیا
اور میں نے تو ہتھیلی کا اسے تل جانا

اپنا شعور اپنی انا کھو چکے ہیں ہم
اب جاگنا پڑے گا بہت سو چکے ہیں ہم
اب کون بڑھ کے ہم کو گلے سے لگائے گا
کانٹے تو اپنے چاروں طرف بو چکے ہیں ہم
احساسِ کمتری کا ہوئے ہیں شکار یوں
اب احتجاج تک کا ہنر کھو چکے ہیں ہم
اب راہ تک رہے ہیں ابابیلیں آئیں گی
حاصل جو تھا دعا میں اثر کھو چکے ہیں ہم
کب تک نصیب ساتھ ہمارا نبھائے گا
اب اتنی بار پا کے تجھے کھو چکے ہیں ہم
مرنے کے بعد دیں، تو ترا ہی حساب دیں
تا عمر زندگی تو تجھے ڈھو چکے ہیں ہم
شکوا اگر کریں تو کریں کس زُبان سے
اک حق تھا اپنے پاس جسے کھو چکے ہیں ہم
اب تو ہمارے ہونٹوں کو مسکان بخش دے
اب تو نصیب سے بھی سوا رو چکے ہیں ہم

محبوب راہی
اکولہ، مہاراشٹر

غزل

در مستجاب الدعا بند ہے
کرم کا ہر اک سلسلہ بند ہے
کہیں راستے آنے جانے کے بند
کہیں اک کھلا دوسرا بند ہے
عجب شخص ہے کچھ بھی کھلتا نہیں
کھلا سربسر ہے وہ یا بند ہے
اکھڑنے لگی حوصلوں کی ہوا
عزائم کی جب سے ہوا بند ہے
جدھر کامرانی کی ہیں منزلیں
ادھر کا ہر اک راستہ بند ہے
دلوں سے فراموش یاد خدا
زبانوں پہ ذکر خدا بند ہے
جدھر نسل نو کا سفر ہے رواں
ادھر باب شرم وحیا بند ہے
کرشمہ ہے بھارت میں ہفتوں ہوئے
فسادات کا سلسلہ بند ہے
مسلط ہے دہشت ہر اک ذہن پر
ہر اک شخص کا ناطقہ بند ہے
دعاؤں پہ تکیہ ہے بیمار کا
دوا تو ہے جاری شفا بند ہے

محمد عابد علی عابد

غزلیں

ٹھکانے پر نہ پڑا نشۂ شراب میں پاؤں
زمیں کے بدلے رکھا میں نے جوئے آب میں پاؤں
کہ گرم ریت پہ چلنا مرا مقدر ہے
ہزار آبلے ، ہیں مبتلا عذاب میں پانو
ہر ایک بات میں قدرت کی دخل دے انساں
مجال ہے کوئی رکھے جو آفتاب میں پاؤں
کمر پہ ختم نزاکت کا ہو گیا معیار
وگرنہ آ نہ گئے ہوتے انتخاب میں پاؤں
وہ اپنی ذات میں پھولا نہیں سماتا ہے
ہو آب آب، جو مارے ہوا حباب میں پانو
نظر کے حادثے گو فی زمانہ عام سہی
رہے خیال نہ گمراہ ہوں شباب میں پاؤں
نکل کے گل سے کیا اس نے کوئی یار کا رخ
شمیم یوں بھی جمائی نہیں گلاب میں پاؤں
وہ دور ہی سے نظر آیا جب کہیں دیکھا
قریب جاکے میں رکھتا کبھی سراب میں پاؤں
اجل کے گھوڑے پہ عابد سوار رہتا ہوں
ہمیشہ رہتے ہیں گویا مرے رکاب میں پاؤں

جہاد موجۂ دریا سے کرنا چاہتا ہوں
فرازِ کشتیٔ جاں سے اترنا چاہتا ہوں
طلوعِ مہر بھی ہوتا ہے تازہ دم ہو کر
ندی میں ڈوب کے میں پھر ابھرنا چاہتا ہوں
ہوا چلے تو بگولے کی طرح رقص کروں
زمیں پہ خاک کی صورت بکھرنا چاہتا ہوں
یہ کیا ہے کوشش پرواز ہر گھڑی ہر پل
پرندِ شوق کے میں پر کترنا چاہتا ہوں
ہیں کیسے راہنما منہ چھپائے پھرتے ہیں
خضر سے مل کے میں دریافت کرنا چاہتا ہوں
اب اور تابِ نظارہ مجھے نہیں عابد
رواداری میں جہاں سے گزرنا چاہتا ہوں

عابد امام زیدی

غزل

دل کی کشتی ڈوب نہ جائے، ارمانوں کا طوفاں ہے
رہ رہ کر دَم گھٹتا ہے، آزاد فضا بھی زنداں ہے
نکھری نکھری ہریالی ہے، گلشن خُلد بداماں ہے
'پھول کھلے ہیں پات ہرے ہیں، کم کم بادوباراں ہے'
باغ میں کیسا گلچیں آیا، جس کی ناہمواری سے
پتہ پتہ فریادی ہے، بُوٹا بُوٹا نالاں ہے
میری دنیا کیا پوچھو ہو، کیسی ہے دنیا میری
خِطّہ خِطّہ اُجڑا اُجڑا، چپہ چپہ ویراں ہے
آس نراس کے دو رستے ہیں جانا ہے کس اَور مجھے
آگے پیچھے کوئی نہیں ہے، بُدھی اپنی حیراں ہے
جتنی سُندر ریوتیاں تھیں، اپنے پی کے دیس گئیں
بستی سُونی سُونی سی ہے، پنگھٹ ویراں ویراں ہے
اِنسانوں کی بستی میں بھی، انساں کی پہچان نہیں
کون نیہارے، کون بتائے، کون سے بھیس میں انساں ہے
جس کی جیسی قسمت عابدؔ پھول ملے ہوں یا کانٹے
ناکامی کا شکوہ کیا ہے؟ اپنا اپنا داماں ہے

پی پی سریواستو رند

غزل

یادوں کی روشن قندیلیں سوچوں کی سوغات لیے
خوابوں کی دہلیز پہ آیا دیوانہ بارات لیے

بار سفر سے چور ہے لیکن دھندھلے سے اجیارے میں
غم کا مسافر آ پہنچا ہے، پہلے سفر کی رات لیے

دیواریں، کھڑکی دروازے، سب گونگے بہرے سے ہیں
کوئی کیسے گھر میں بیٹھے، دل میں دل کی بات لیے

مردہ خواہش رکھ آیا ہے دھوپ بھرے تابوت میں وہ
پھر بھی بیساکھی پر آیا، چل کر زخمی رات لیے

ایک خالی کشکول میں ڈالا اس نے انا کا سکہ بھی
غم کے حجرے میں، بیٹھا ہے جو اپنی ہی ذات لیے

موسم کا بکھراؤ تو دیکھو، دھندھلے دھندھلے منظر میں
سوکھے ریگستان سے گزرا کوئی برستی رات لیے

غم کی صلیبوں کے سائے میں بیٹھا ہے گم سم سا کوئی
ماضی کا شمشان جلا کر، رشتوں کی خیرات لیے

کس کے در پر دستک دے اب، رند کہاں دامن پھیلائے
شہروں شہروں بھٹک چکا ہے، افسردہ حالات لیے

شیخ رحمٰن اکولوی

نئی نسل

تیس برس پہلے
ایک عمر رسیدہ شخص بس میں سوار ہوا
کوئی نشست نہیں تھی خالی
وہ پریشان ہوا تھا
میں نے ازراہِ اخلاق اسے اپنی جگہ بٹھا دیا
اور خود کھڑا ہو گیا
کسی نشست کے خالی ہونے کے انتظار میں

تیس برس بعد
بس میں کوئی نشست نہیں تھی خالی
کئی نوجوان ادھر ادھر بیٹھے ہوئے
ادھر اُدھر کی باتوں میں مصروف تھے
وقتاً فوقتاً وہ میری طرف دیکھتے بھی تھے
لیکن ان کی کوری آنکھوں میں میرے لئے کوئی ہمدردی نہیں تھی
اس دن بُرا میرا حال ہوا
سفر میرا یوں ہی تمام ہوا

محمد شاہد پٹھان
جے پور

غزلیں

رہِ وفا کے سبھی امتحان دے آئے
زمین والوں کو ہم آسمان دے آئے

وقار اپنا، محبت کی آن دے آئے
عدو کے ہاتھ میں تیر و کمان دے آئے

فروغِ حسن کو پیکر کو شان دے آئے
تخیلات کی اونچی اڑان دے آئے

پڑا جو وقتِ مصیبت، وطن کی عظمت پر
کبھی لہو تو کبھی اپنی جان دے آئے

یہ ان کی سوچ ہے اپنوں کو 'غیر' کہتے ہیں
ہمارا ظرف کہ غیروں پہ جان، دے آئے

کیے ہیں ہم نے ہی اسرارِ کائنات عیاں
بشر کو راہِ خدا کا نشان دے آئے

دلوں میں اترے گی عرفان و آگہی کی ضیا
دیارِ کفر میں شاہدؔ اذان دے آئے

اشک روودادِ دل کی زبان ہوگیا
غم بڑی خامشی سے بیاں ہوگیا

وقت کی کج ادائی کا فیضان ہے
ہر عمل جو میرا رائیگاں ہوگیا

سب مکاں کی تمنا میں الجھے رہے
اور حاصل مجھے 'لامکاں' ہوگیا

پہلے دلدوز تھا، جاں گسل تھا بہت
دل کا ہر زخم اب جزوِ جاں ہوگیا

ان کی آمد سے روشن ہوئے بام و در
گھر کا گھر ہی میرا کہکشاں ہوگیا

راز قتلِ بشر تو نہیں تھا کوئی
راز الفت تھا، آخر عیاں ہوگیا

پہلے کچھ گھر جلے، پھر جلیں بستیاں
اور فضا میں دھواں ہی دھواں ہوگیا

اس کی یادوں میں شاہدؔ غزل ہوگیا
ہر سخن درد کا ترجماں ہوگیا

ڈاکٹر رضوان الرضا رضواؔن (علیگ)
دھنکبر پور، بیارا قاضی، سدھارتھ نگر، یوپی 105 272

غزل

ہم سمجھتے تھے کہ کچھ بیباک ہوتی جارہی ہے
وہ نظر لیکن بڑی سفاک ہوتی جا رہی ہے

کر رہی ہے مرثیہ خوانی قصیدہ گوئی کے ساتھ
اصل میں دنیا بڑی چالاک ہوتی جا رہی ہے

بٹ رہا ہوں میں کئی اک زاویوں اور دائروں میں
دور مجھ سے ہی مری املاک ہوتی جا رہی ہے

اپنی اپنی سب اسے معراج کہلانے لگے ہیں
فرش سے اونچی ذرا جو خاک ہوتی جا رہی ہے

صرف پانی ہی نہیں میلا نظر آنے لگا ہے
سطحِ دریا تک بھی اب ناپاک ہوتی جا رہی ہے

میں بھنور میں پھنس کے دریا پار کرتا جارہا ہوں
میری ہمت خود بخود تیراک ہوتی جا رہی ہے

کیا حواسِ ظاہرہ اور باطنہ روشن ہوئے ہیں!
کچھ زیادہ قوتِ ادراک ہوتی جارہی ہے

معرکے میں حق و باطل کے سبھی تو کلمہ گو تھے
داستاں یہ کتنی حیرتناک ہوتی جارہی ہے

ہیں تکلف میں ابھی کچھ لوگ، کچھ لوگوں میں رضواؔں
ساری استعداد یوں ہی خاک ہوتی جارہی ہے

تلک راج پارس
جبلپور

غزلیں

رشتوں کا سب نور بجھا کہہ سکتے ہیں
اور چشمک کے مارے کیا کہہ سکتے ہیں

اتنا سوچوں پیشانی سے لہو بہے
پھر لکھوں تو لوگ نیا کہہ سکتے ہیں

تن میں جتنا خون ہے وہ قندیل کا ہے
باقی سب کچھ مٹی کا کہہ سکتے ہیں

میرا جینا مرنا تیری چوکھٹ پر
کیا اس کو معراجِ وفا کہہ سکتے ہیں

ذہن ہمارا دشمن کا گھر ہے پارس
ہم نے اپنا سب کھویا کہہ سکتے ہیں

یہ کس کے باز ہواؤں میں پھڑ پھڑاتے ہیں
ہر ایک شاخ پہ زخمی پرند آتے ہیں

حیات یافتہ ولیوں کے آستانے پر
مجاوروں کے ارادے ہمیں ڈراتے ہیں

ہمارے عہد کی پہچان ہم سے ہوتی ہے
ہم آفتاب کے آگے دیے جلاتے ہیں

شبِ سیاہ بھی روشن اسی سے ہوتی ہے
جو شعر کہتے ہوئے ہم لہو جلاتے ہیں

میں اس کو بھولنا چاہوں تو شام کے منظر
اداس ہو کے مرے دل میں ٹوٹ جاتے ہیں

طارق احمد صدیقی، نئی دہلی

جانبِ منزل

جس دن بھر آئیں گی آنکھیں اس دن چل دوں گا چپ چاپ
اٹھا کر جھولا
جس میں تہہ بر تہہ ہونگے میلے کپڑے دو چار
بڑھی شیو اور مڑا تڑا سا کرتا پہنے
ہاتھ میں ایک ٹفن
جس میں رکھ لوں گا خرید کر تھوڑے بُھنے چنے
کہیں رکوں گا کسی موڑ پر کھا لوں گا سر پر ہاتھ دھرے
سرکاری نل کے نیچے کپڑے دھولوں گا
اور سکھا کر پھر چل دوں گا انجانی منزل کی اُور

ملتِ مرحوم

ہم تاریخ میں دفن ہیں
اور تہذیب ہمارا کفن ہے
اور زبان ہمارے ماتم کا گیت
اور مذہب ہمارے قبرستان کی کانٹے دار گھیرا بندی
جو باہر ہے وہ اندر آ سکتا ہے
لیکن اندر کے لوگ باہر نہیں جا سکتے
کھلی فضا میں

عورت کیا ہے

عورت ایک طرح سے بیل ہے جو پاس کے پیڑ پر چڑھتی ہے
عورت ایک طرح سے تیل ہے جو شمع میں جلتی رہتی ہے چپ چاپ
عورت ایک طرح سے کھیل ہے جسے کھیلتے ہیں ہم بار بار جیتنے کے لیے
عورت ایک طرح سے ریل ہے جس کا ڈرائیور اور گارڈ دونوں ہی ہیں مرد
عورت ایک طرح سے جیل ہے جس میں قید رہتی ہے مرد کی جان
... بڑے آرام سے

فیروز عالم

لمحہ گم گشتہ

میری رات کو ڈیوٹی تھی۔ مجھے سات بجے سے پہلے پہلے ہسپتال پہنچنا تھا۔

میں اپنی اسپیشلٹی کی اعلیٰ تعلیم کے چوتھے سال میں تھا۔قواعد کے مطابق مجھے کچھ ماہ نفسیات کے شعبے میں گذانے تھے۔

اوّل شام سے گہری دھند چھا گئی تھی اور جب تک میں نے کار ہائی وے سے نکال کر گھنے درختوں کے درمیان بل کھاتی دیہی سڑک پر ڈالی اس وقت تک دھنکی روئی کے سفید گالوں کی طرح برف بھی گرنی شروع ہوگئی۔ سڑک کے دونوں طرف اونچے اونچے اور گھنے درخت تھے مگر موسم سرما کی وجہ سے ان کی شاخیں پتوں سے محروم تھیں۔سڑک کے اطراف کہیں کہیں ٹھہرا ہوا پانی اب جم کر برف فن چکا تھا جو شیشے کی طرح چمک رہا تھا۔ مجھے یہ منظر بہت بھاتا تھا کیونکہ میں پاکستان کے جس علاقے سے آیا تھا وہاں تپتی ریت، چلچلاتی دھوپ اور بے برگ وگیاہ صحرا تھا۔ پھر نفسیات کے شعبے میں رات کی ڈیوٹی نسبتاً آسان ہوتی تھی۔اس لیے میں بڑے اچھے موڈ میں تھا۔نفسیات کے مریضوں کے لیے یہ رہائشی ہسپتال ڈیٹرائٹ سے کئی میل دور مشیگن کے اندرونی علاقے میں واقع تھا۔یہاں نہ صرف وہ مریض، جو اپنے مرض کی شدت کے لحاظ سے انتہائی درجہ پر تھے، رہتے تھے بلکہ ایسے مریض بھی، جنہوں نے وقتی پاگل پن یا جذبات کے زیر اثر خطرناک جرم کئے تھے، مقفل وارڈز میں قید تھے۔ یہاں علاج کے ساتھ ساتھ ان کی کڑی نگرانی بھی کی جاتی تھی۔

میں نے اپنی کار ڈاکٹرز کے لیے مخصوص پارکنگ لاٹ میں پارک کی اور ہسپتال کا صدر دروازہ اپنی خاص چابی سے کھول کر لابی میں داخل ہوا۔ ڈیوٹی نرس میری منتظر تھی۔ میں نے اس کے ساتھ ایک مختصر راؤنڈ کیا۔ کچھ مریضوں کی داوؤں میں تبدیلی کے احکام سنائے۔ اس کے بعد مجھے اس روز جو نئے مریض داخل ہوئے تھے انکا معائنہ کرنا تھا اور ان کے علاج کے لیے سفارشات اور ایک جامع منصوبہ بندی کی رپورٹ تیار کرنی تھی۔ یہ مکمل طور پر سفید فام آبادی کا علاقہ تھا اور زیادہ تر مریض بھی اسی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اس لیے جب ایک پاکستانی لڑکا جمیل احمد جسے ''جمی'' کہا جاتا تھا اور جو بمشکل سترہ سال کا تھا میرے سامنے لایا گیا تو مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ وہ بالکل گم سم تھا اور مجھ سے کسی قسم کی بات کرنے یا میرے کسی سوال کا جواب دینے کے قابل نہ تھا۔اس کی آنکھوں میں عجب ویرانی تھی اور وہ اپنی قدرتی چمک سے محروم تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کی بینائی ختم ہو چکی ہے۔ حالانکہ اس کی بینائی قائم تھی مگر وہ اپنی نگاہ کسی چیز پر مرکوز کرنے کی صلاحیت کھو چکا تھا۔

میں سمجھ گیا تھا کہ اس کا ذہنی رابطہ اپنے ماحول اور اطراف سے ٹوٹ چکا ہے۔ نارمل آدمی کی یہ خاصیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے ماحول سے منسلک رہتا ہے اور اپنے اطراف سے تعلق رکھتے ہوئے غیر ارادی طور پر عمل ظاہر کرتا

ہے۔ یہ لڑکا اس صلاحیت سے محروم ہو گیا تھا۔ علم نفسیات میں یہ ایک سنجیدہ بلکہ بڑی حد تک خطرناک علامت ہے۔ یہ بات واضح تھی کہ اس وقت میری کوئی بھی کوشش اسے بولنے پر مجبور نہیں کر سکتی تھی اس لیے میں نے اس کے چارٹ پر مختصر نوٹ لکھا اور ہمیشہ کی طرح ڈیوٹی نرس کو یہ ہدائت کر کے کہ اگر ضرورت پڑے تو مجھے بلا لینا میں اپنے آرام کے کمرے میں چلا گیا۔

عام حالات میں، میں آئندہ ہونے والے امتحان کی کتابیں ساتھ لے آتا تھا اور فارغ وقت میں وہی پڑھتا تھا مگر آج مجھے اس لڑکے کے متعلق سخت جستجو تھی۔ میں نے اس کا مکمل ریکارڈ طلب کیا اور اس کا مطالعہ شروع کیا۔ اگر چہ اس کا ریکارڈ کسی ضخیم ناول کی طرح تھا اور اس میں پولس اور تحقیقاتی اداروں کی رپورٹ، سوشل ورکرز کے نوٹ اور عدالت کا فیصلہ شامل تھا مگر اس کے علاوہ، کہ اس پر اپنے باپ شکیل احمد کو قتل کرنے کا الزام ہے مجھے اور کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ قتل بھی وحشیانہ طریقے سے کیا گیا تھا۔ رپورٹ کے مطابق اس نے اپنے بیس بال بیٹ سے باپ کے سر پر اس قدر ضربیں لگائی تھیں کہ اس کو پہچاننا ممکن نہیں رہا تھا۔ بلکہ یہ بات واضح تھی کہ مرنے کے بعد وہ عالم دیوانگی میں مرنے والے پر ضربیں لگاتا رہا تھا۔

جرم کی نفسیات میں اس قسم کے قتل کی وجہ قاتل کے دل میں شدید غصہ اور نفرت ہوتی ہے اور وہ اپنے غصے کی آگ بجھانے کے لیے یہ قتل کرتا ہے۔ گرفتاری کے بعد بھی وہ کسی کو کچھ نہیں بتا سکا تھا۔ وہ عدالت کی بھی کوئی مدد نہ کر سکا تھا اس لیے عدالت نے اسے وقتی پاگل پن کا مریض قرار دیتے ہوئے نفسیاتی ہسپتال بھیج دیا تھا۔

شاید رات کے ڈھائی بجے ہوں گے جب میری آنکھ شدید چیخوں کی آواز سے کھلی اس کے ساتھ ہی میرا فون بجنے لگا۔ ہیڈ نرس مجھے مقفل وارڈ میں فوراً طلب کر رہی تھی۔ میں بھاگتا ہوا وارڈ پہنچا۔ جمی پر دیوانگی کا دورہ پڑا تھا وہ دیوار سے سر پھوڑ کر خودکشی کرنا چاہتا تھا۔ دو تنو مند وارڈ بوائے اسے جکڑے تھے اور وہ کسی بھینسے کی طرح ڈکرا رہا تھا۔ پورا وارڈ اس کی چیخوں سے گونج رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اور ویران ہو گئیں تھیں اور اس کے منہ سے تھوک کے غبارے نکل کر اس کی ٹھوڑی پر بہہ رہے تھے۔ میں نے نرس کو آرڈر دیا کہ اس کو فوراً تھورازین کے پچاس ملی گرام انجکشن لگاؤ۔ انجکشن لگتے ہی وہ کچھ پر سکون ہوا اور تھوڑی دیر میں نیند میں ڈوب کر گہرے گہرے خراٹے لینے لگا۔ میں اس دلدوز منظر سے بہت متاثر ہوا اور میں نے فیصلہ کیا کہ میں صبح اپنے نفسیات کے پروفیسر سے جن کی رہنمائی میں میں یہ کورس کر رہا تھا درخواست کرونگا کہ مجھے اس کیس پر تعینات کر دیا جائے تا کہ آئندہ تین ماہ کی مدت میں میں اس موضوع پر تحقیق کر سکوں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اُسے ایسے کمرے میں منتقل کر دیا جہاں کی دیواروں پر گدے لگے ہوتے ہیں تا کہ مریض خود کو زخمی نہ کر سکیں۔

دوسرے دن میں نے زیادہ وقت اس کے چارٹس اور مختلف ریکارڈ پڑھنے میں گذارا تا کہ میں اس کے پس منظر سے جس قدر ممکن ہو سکے آگاہ ہو سکوں۔ اسکا کنبہ ڈیٹرائٹ کی نواحی بستی ''وارن'' میں رہتا تھا اور وہ یہیں پیدا ہوا تھا۔ ماں پہلے ہی مر چکی تھی اور باپ کو اس نے کچھ ماہ پہلے ہلاک کر دیا تھا اس لیے اب اس کا بھری دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ سوشل سروس کے محکمے نے اس سے زیادہ چھان بین کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اور طبی طور پر اسے ذہنی طور

پر مفلوج قرار دئے جانے کے بعد پولس نے بھی اس کا کیس بند کر دیا تھا۔میرے دیئے ہوئے انجکشن کے زیر اثر وہ تقریباً سہ پہر تک سوتا رہا۔ میں اسے کچھ مزید وقت دے کر جب اس کے کمرے میں پہنچا تو شام ہو رہی تھی۔ ڈھلتے سورج کا بڑا سا گول طباق سفیدے کے درختوں کی ننگی شاخوں میں الجھا ہوا تھا۔ وہ کھڑکی کے نزدیک بیٹھا خالی خالی آنکھوں سے باہر ٹنڈ منڈ درختوں کو تک رہا تھا۔ کمرے میں زردی روشنی پھیلی تھی اور ایک ایسا سناٹا تھا کہ مجھے اپنے دل کی دھڑکن سنائی دے رہی تھی۔ میں نے اسے انگریزی میں ''ہیلو'' کہا اور اس کے نزدیک ہی بیٹھ گیا۔ وہ آج تھوڑا سا پُرسکون تھا مگر اس نے میرے ''ہیلو'' کا جواب نہیں دیا۔ وہ بالکل خاموش تھا اور اس کی بے رونق آنکھیں مستقل باہر تک رہی تھیں۔ میری پوری کوشش کے باوجود وہ میری موجودگی سے لاتعلق رہا۔ مجھے اس پر کوئی تعجب نہیں ہوا۔ میں جانتا تھا کہ اسے انتہائی شدید تھیراپی کی ضرورت ہے جس میں شاید بجلی کے جھٹکے لگانے کی ضرورت پڑ جائے۔ میں مایوس نہیں تھا مجھے اس سلسلےمس ے صبر سے کام لینا تھا۔ میں نے اس پر مزید زور نہ ڈالا اور کچھ دیر خاموش بیٹھ کر واپس چلا آیا۔

جمی امریکی عملہ اور خاص طور سے سوشل ورکرز کے لئے اجنبی تھا مگر میرا اس سے ایک مضبوط رشتہ تھا، ہم وطنی کا رشتہ۔ میں اسی کمیونٹی کا حصہ تھا اس لئے میں فیصلہ کیا کہ میں اپنے طور پر کوشش کرونگا کہ اس کا کوئی رشتہ دار یا اس کے کنبے کا کوئی جاننے والا مل جائے تو میں اس سے اس کے متعلق معلومات حاصل کروں۔ اس سے اس کے علاج میں زبردست مدد مل سکتی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب امریکہ میں پاکستانی کمیونٹی بہت مختصر تھی۔ پھر اس کا جرم بھی ڈرامائی کیفیت کا تھا۔ اس لئے مجھے یقین تھا کہ مجھے اس سلسلے میں کوئی نہ کوئی ایسا شخص ضرور مل جائے گا جو مجھے اس معاملے میں معلومات فراہم کر سکے۔ مجھے جلد ہی اس سلسلے میں کامیابی ہوئی۔ ریکارڈز ہی سے مجھے معلوم ہوا کہ یہ محمود صدیقی، جو کمیونٹی کے ایک باعزت فرد تھے، سے بہت قریب تھا اور خاص طور سے وہ اس کی والدہ کو بیٹیوں کی طرح عزیز رکھتے تھے۔ وہ کئی سال پہلے امریکہ آئے تھے اور مستحکم مالی حالت میں تھے اور نادار پاکستانیوں کی مدد کرنے کی وجہ سے اچھی شہرت کے حامل تھے۔ میں نے صدیقی صاحب کو فون کر کے ملاقات کا وقت مقرر کیا۔

سنیچر کی سہ پہر، جب خلاف معمول ڈیٹرائٹ میں موسم بہتر تھا اور سورج بھی اپنی آب وتاب سے چمک رہا تھا میں نے ''سینٹ کلئر'' جھیل کے کنارے اپنی کار پارک کی اور ایک ساحلی ریسٹورانٹ میں داخل ہوا۔ محمود صدیقی صاحب حسب وعدہ میرے منتظر تھے۔ ہم ایک بہت بڑی شیشے کی کھڑکی کے نزدیک بیٹھ گئے۔ سامنے جھیل کی سطح نیم منجمد تھی اور کہیں کہیں اس کے نیلے پانیوں پر برف کے چھوٹے چھوٹے تودے تیر رہے تھے۔ ہم نے کافی کا آرڈر دیا اور میں نے صدیقی صاحب سے اجازت لے کر اپنی چھوٹی سی ڈائری نکالی تاکہ میں اس میں نوٹ لکھ سکوں۔

صدیقی صاحب نے سگریٹ کا ایک لمبا کش کھینچ کر کہنا شروع کیا۔ ''ڈاکٹر صاحب میں اس ملک میں ایک طویل عرصے سے مقیم ہوں۔ اس کنبے کی کہانی کوئی انوکھی نہیں۔ یہ ڈرامہ تو بار بار کھیلا جا رہا ہے۔ شکر ہے کہ پاکستان میں بہت سے گھرانے اس صورتحال سے واقف ہو گئے ہیں مگر پھر بھی لوگ اس قسم کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ اب تو یہاں پھر بھی کچھ کمیونٹی بن گئی ہے مگر جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں اس وقت ایک لامتناہی

تنہائی اور اکیلا پن تھا۔ میں اپنی بیوی کے ساتھ صرف وقت گذاری کے لئے شام کے وقت ائرپورٹ چلا جایا کرتا تھا۔ اگر کوئی پاکستانی فیملی پہلی دفعہ امریکہ ہجرت کرکے آتی تھی تو اس کی مدد اور اخلاقی سہارا دینے کی کوشش کرتا تھا ورنہ ہم صرف ائرپورٹ کے ریستوران میں کافی پیتے ہوئے جہازوں کو چڑھتے اترتے دیکھا کرتے تھے۔ اسی طرح ایک شام میں نے دیکھا کہ ایک پیاری سی لڑکی جو اپنے طور طریقے سے پڑھی لکھی لگ رہی تھی نہایت پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر بھٹک رہی ہے۔ کبھی وہ فون کرتی تھی اور پھر وہاں سے کوئی جواب نہ پاکر بار بار اس طرف دیکھتی تھی جہاں لوگ اپنے عزیزوں کو لینے آتے ہیں مگر مایوس ہو جاتی تھی۔ یہ تو صاف ظاہر تھا کہ وہ پہلی دفعہ امریکہ آئی ہے اور جسے اسے لینے آنا تھا وہ نہیں آیا ہے۔ اجنبی ملک، سردیوں کی رات کے دس بجے کا وقت اور ڈیٹرائٹ جیسا جرائم سے پر شہر۔ میں نے بیوی کی طرف دیکھا اور اس کی رائے لی اس نے مجھ سے اتفاق کیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس سے پوچھا ''بیٹی تمہیں کس کا انتظار ہے'' اس نے کہا ''میرا نام رضیہ ہے اور میری تین ماہ پہلے شادی ہوئی ہے۔ میرے شوہر کو مجھے لینے آنا تھا انہیں میرے سفر کی سب تفصیل معلوم تھی، نہ جانے کیوں نہیں آئے''۔ اس کے پاس اس کے شوہر کا پتہ تھا۔ وہ شہر کے ایک نچلے درجہ کی بستی کا پتہ تھا جہاں زیادہ تر مزدور پیشہ لوگ رہتے تھے۔ ہم اس کو لیکر وہاں پہنچے۔ یہ ایک تین منزلہ بوسیدہ بلڈنگ تھی جس کے زیر زمین فلیٹ میں اس کے شوہر کی رہائش تھی۔ گھر بند تھا۔ خوش قسمتی سے پڑوس میں بھی ایک پاکستانی کنبہ تھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ رات کی نوکری کرتا ہے اور کوئی تین بجے صبح گھر واپس آتا ہے۔ ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ ہم اسے اپنے گھر لے آئیں۔ میں نے پڑوسیوں کو اپنا کارڈ، مکمل پتہ اور ٹیلیفون نمبر دیا اور رضیہ کو گھر لے آیا۔ وہ بہت تھکی تھی اور شوہر کی غیر موجودگی سے کچھ پریشان۔ پھر ہم اجنبی تھے اس لئے کچھ سراسیمہ سی بھی۔ میری بیوی نے اسے تسلی دی اور اسے کھانا کھلا کر ہمارے ایکسٹرا بیڈ روم میں سلا دیا۔''

محمود صاحب نے سگریٹ کا ایک اور کش لے کر اپنی بات جاری رکھی ''صبح ان کے شوہر تشریف لائے، اپنی حرکات وسکنات سے مغرور اور سر پھرے لگ رہے تھے۔ لگتا تھا کسی فیکٹری میں کام کرتے ہیں۔ بہت روکھے انداز میں میرا شکریہ ادا کیا، بیوی سے کوئی معذرت نہیں کی اور جلد ہی اس کا سوٹ کیس اٹھا کر گھر روانہ ہو گئے۔ بس اس کے بعد رضیہ کی ایک ایسی زندگی شروع ہوگئی جو اذیت سے پر تھی۔ رضیہ ایک بہت خوشحال اور پڑھے لکھے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی، خوبصورت اور بیحد مہذب بھی۔ تھے تو یہ بھی اچھے گھرانے کے مگر امریکہ نے ان کو برباد کر دیا تھا۔ اسٹوڈنٹ ویزا پر انجینئر بننے امریکہ آئے تھے، پڑھائی کر نہ سکے، چھوٹی موٹی نوکریاں کرتے تھے۔ شرم کے مارے گھر والوں کو بھی نہیں بتاتے تھے کہ ناکام ہو گئے ہیں۔ وہاں یہی بھرم رکھا تھا کہ کسی بڑی کمپنی میں منیجر ہیں۔ دریا کے کنارے ڈیٹرائٹ کی بڑی بلڈنگوں کے سامنے ادھار کی خریدی گاڑی کی کھڑکی پر ہاتھ رکھ کر کئی تصویریں پاکستان بھیج دی تھیں۔ ماں باپ نے جھٹ پٹ رضیہ سے شادی طے کر دی یہ دو ہفتے کے لئے کراچی جا کر شادی کر کے واپس آ گئے اب تین ماہ بعد رضیہ آئی تھیں۔ شکیل ایک نفسیاتی کیس ہو گئے تھے۔ سخت احساس کمتری، غصہ، جھنجھلاہٹ اور ظاہری غرور اور انا کے جال میں گرفتار تھے۔ ہر برائی میں پڑ گئے تھے۔ ایک دن ہم رضیہ سے ملنے

گئے تو اس کی داہنی آنکھ کے نیچے نیل پڑا تھا۔ بہت مشکل سے قبولی کہ مار پیٹ بھی ہوتی ہے۔ پیسے کی کمی ہے پھر شوہر لاپرواہ اور اسے "پینے" کا بھی شوق ہے۔ نوکریاں بھی کبھی ملتی ہیں کبھی چھوٹ جاتی ہیں۔ اسی پر جھگڑا رہتا ہے۔ میں تو غصہ سے آگ بگولہ ہوگیا۔ میں نے امریکہ میں یہ سب ممکن نہیں پولس بلائی جاسکتی ہے، شوہر کو چھوڑ کر واپس پاکستان بھی جایا جاسکتا ہے۔ مگر وہ راضی نہ ہوئی۔ وہی معاشرے کا خوف، بدنامی کا ڈر۔ ایک بھرم بنا ہوا ہے پھر اس نے یہ کہہ کر تو بالکل ہی لاجواب کر دیا کہ اب وہ کچھ ہی ماہ بعد ماں بننے والی ہے۔ بچے کو لے کر کہاں جائیگی۔ غرض اسی طرح بیچاری کی زندگی کٹ رہی تھی۔ کچھ ماہ بعد "جمی" پیدا ہوگیا۔ رضیہ نے حالات سے سمجھوتا کرلیا تھا۔ ایک معمولی سی نوکری بھی کر لی تھی۔ شوہر اب اور بھی غیر ذمہ دار ہوگئے تھے کہ وہ خود ہی اپنے اور بچے کا خرچہ پورا کر لیتی ہے۔ مار پیٹ اب بھی جاری تھی۔ بچہ بڑا ہورہا تھا۔ وہ زینے کے جنگلے سے اس مار پیٹ کو دیکھتا اور سہم کر رہ جاتا"

محمود صاحب نے رک کر مجھے دیکھا پھر کہنے لگے "ڈاکٹر صاحب، ایک دن رضیہ نے مجھ سے کہا کہ وہ مجھ سے ایک خاص بات کہنا چاہتی ہے وہ مجھے ایک راز میں شریک کرنا چاہتی ہے تاکہ میں گواہ رہوں۔ وہ اپنی زندگی اور خاص طور سے اپنے بچے کے مستقبل سے بہت مایوس تھی۔ وہ اپنے بچے کو زندگی میں کامیاب دیکھنا چاہتی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ اپنی تنخواہ سے پیٹ کاٹ کاٹ کر کچھ رقم پس انداز کرتی ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کے والد بھی جب اس سے ملنے امریکہ آئے تھے تو انہوں نے بھی جمی کی تعلیم کے لئے کچھ رقم دی ہے تاکہ مستقبل میں اس کے بچے کی تعلیم کا بندوبست ہوجائے اس نے اس رقم سے ایک فنڈ قائم کیا ہے۔ اسے اپنے شوہر سے اس معاملے میں کوئی امید نہیں تھی۔ پھر اس نے ایک ایسی مسکراہٹ سے جو غم آلود تھی کہا کہ اگر وہ مر بھی گئی تو جمی کے لئے ایک بڑا مالی سہارا چھوڑ جائیگی۔ میں نے کہا "خدا نہ کرے۔ اللہ تمہیں اپنے بچے کی خوشیاں دکھائے" وہ مسکرا کر چپ ہوگئی۔ وہ پابندی سے اس فنڈ میں رقم جمع کرتی تھی۔ رقم کی وصولی کے لئے جمیل کا نام تھا۔ وہ انتہائی اچھی صحت میں تھی مگر کچھ سال بعد اچانک اس کے پیٹ میں درد اٹھا اور ہسپتال میں ایک آپریشن کے بعد وہ جانبر نہ ہوسکی۔ اس کے مرنے پر اچھی خاصی رقم جمع ہوچکی تھی مگر جمیل ابھی صرف دس سال کا تھا اسلئے رقم کا امین قانونی طور پر اس کے باپ کو بنایا گیا۔ رضیہ کے مرنے کے بعد ان لوگوں سے ہمارے تعلقات برائے نام رہ گئے تھے۔ بس یہ سننے میں آتا تھا کہ جمیل بڑی محنت سے پڑھائی کررہا ہے۔ وہ اپنی ماں کے خواب پورے کرنے چاہتا ہے۔ کسی برائی میں نہیں اور اس کی تمام توجہ اپنی تعلیم پر ہے وہ کالج اور پھر یونیورسٹی میں پڑھنا چاہتا ہے۔ پھر ہمیں اس گھرانے کی کوئی اطلاع نہیں ملی۔ بس ہمیں بھی اخباروں اور ٹی وی ہی سے معلوم ہوا کہ اس نے اپنے باپ کو قتل کر دیا" پھر کہنے لگے "ڈاکٹر صاحب اس سے زیادہ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکتا"۔ اب رات ہوچکی تھی میں نے محمود صاحب کا شکریہ ادا کیا اور گھر کی راہ لی۔ مجھے اس سوال کا اب بھی کوئی جواب نہ ملا تھا کہ جمی نے اپنے باپ کو کیوں قتل کیا اور اسکی ذہنیت کو نارمل کرنے کے لئے مجھے کیا کرنا ہے۔

میں اپنی ڈیوٹی کے دوسرے فرائض ادا کرکے زیادہ وقت جمیل کے ساتھ گذارتا تھا۔ مجھے اس کی اجازت بھی تھی اس لئے کہ وہ میرا "سٹڈی" کیس تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح گم سم رہتا۔ بہت کم بولتا۔ وہ صرف اپنی ضروریات

کا اظہار کرنے کو ایک آدھ جملہ کہہ دیتا۔ وہ گونگا نہیں تھا نہ ہی ذہنی طور پر مفلوج۔ بس اس کے ذہن سے موجودہ وقت کے علاوہ ہر چیز مٹ گئی تھی۔ اسے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ وہ کہاں پیدا ہوا تھا یا پلا بڑھا تھا۔ ہم درختوں کے درمیان لمبی لمبی روشوں پر دیر تک چہل قدمی کرتے۔ جب موسم بہتر ہوتا تو فوارے کے پاس بیٹھ کر لنچ کرتے اور رات کو دیر تک کامن روم میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھتے۔ وہ مجھ سے مانوس ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے اسے اس کی ماں کے ساتھ کھینچی تصویریں دکھاتا جو مجھے صدیقی صاحب نے دی تھیں۔ اس میں اس کے بچپن کی بھی تصویریں تھیں۔ لگتا تھا اس کی یادداشت بہتر ہو رہی ہے۔

اس کے ساتھ ہی اس کی انتہائی بھرپور تھیراپی بھی جاری تھی جس میں دوائیں، سائیکوتھیراپی اور بجلی کے علاج کا ایک مختصر کورس بھی شامل تھا۔ وہ تیزی سے بہتر ہو رہا تھا۔ رفتہ رفتہ مجھ سے اچھی طرح اور مسلسل باتیں بھی کر لیتا تھا۔ ایک دن صدیقی صاحب نے مجھے ایسا البم دیا جس میں اس کے سکول کی تصویریں تھیں۔ اس نے کئی انعام اور اعزازات جیتے تھے۔ کچھ میں اس کی ماں بھی ساتھ تھی۔ تصویروں کے ساتھ البم میں کئی جگہ اس کی ماں کی نیک تمنائیں تھیں جو اس کے تابناک مستقبل کے لئے تھیں۔ میں یہ البم رات کو اس کے پاس چھوڑ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ صبح جب میں اس کے کمرے میں گیا تو مجھے لگا وہ ساری رات روتا رہا ہے۔ میں نے اسے گلے لگایا اور تسلی دی۔ اس کی ہچکیاں مزید تیز ہو گئیں۔ آج وہ زیادہ ہوش میں لگ رہا تھا۔ کہنے لگا ''ڈاکٹر۔۔۔ مجھے یاد آ گیا آپ سننا چاہتے تھے نا تو سنئے'' پھر کہنے لگا ''اپنے گھر میں ہونے والے حالات نے مجھ پر بہت اثر کیا تھا مگر بگڑنے یا باغی ہونے کے بجائے میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ میں پڑھ لکھ کر اپنے حالات بدل دونگا۔ میں دل و جان لگا کر ایک اچھے کالج میں داخلے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے کچھ مہینے بعد ہائی سکول سے گریجویشن کرنا تھا اور کالج میں داخلے کی میری درخواست قبول ہو چکی تھی۔ میں اپنے باپ سے اس سلسلے میں بات کرنا چاہتا تھا مگر وہ گھر پر نہیں تھے، جانے کہاں سے دیر کر کے گھر آتے تھے۔ میں ان کے انتظار میں دیر تک جاگا۔ وہ آئے تو حسب معمول نشے میں تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میرا داخلہ بہت اچھی یونیورسٹی میں ہو گیا ہے۔ اور اب مجھے وہ رقم، جو میری ماں نے فنڈ میں جمع کروائی تھی، چاہئے۔ انہوں نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔ میں نے اصرار کیا تو وہ مجھے گالیاں دینے لگے کہ تو پڑھ کر کیا امریکہ کا صدر بن جائیگا۔ میں نے پھر بھی ان سے کہا کہ مجھے وہ رقم درکار ہوگی، میں اپنی ماں کا خواب پورا کرنا چاہتا ہوں۔ اس پر انہوں نے میری ماں کو بھی گالیاں دینی شروع کر دیں۔ مجھے غصہ تو آ رہا تھا مگر میں نے اپنے اوپر قابو رکھا اور پھر کہا کہ وہ رقم میری ہے جسے میری ماں نے اپنا پیٹ کاٹ کر جمع کیا تھا آپ وہ رقم مجھے دیں۔ وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھوڑا سا لڑکھڑائے اور یہ کہتے ہوئے میرے منہ پر زوردار تھپڑ مارا کہ رقم تو وہ اس عرصے میں خرچ کر چکے ہیں۔ اب تو ان کے پاس کچھ بھی نہیں۔ بس مجھے وہ سب کچھ یاد آ گیا جو انہوں نے کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔ میرا دماغ جیسے پھٹنے لگا اس پر وہ مجھے مستقل گالیاں دے رہے تھے۔ میری آنکھوں کے سامنے جیسے دھند پھیل رہی تھی کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اتنے میں انہوں نے میرے منہ پر ایک اور تھپڑ مارا۔ بس میں نے ہاتھ بڑھا کر قریب پڑا ایبٹ اٹھایا پھر مجھے لگا جیسے ایک دھماکہ ہوا اور اس کے بعد مجھے کچھ یاد

نہیں۔ اب بھی یاد نہیں۔ کیا کیا ہے میں نے ڈاکٹر۔۔؟؟'' میں سمجھ گیا کہ اسے TARUMATIC AMNESIA ہو گیا ہے۔ شاید یہ قدرت کی مصلحت ہے کہ انسان تکلیف وہ لمحات کو اپنے ذہن کی سلیٹ سے صاف کر دیتا ہے۔۔بس جیسے یہ تاریک اور خونی لمحہ اس کی زندگی میں آیا ہی نہیں تھا۔ یہ ایک لمحۂ گم گشتہ تھا جو قدرت نے اس کی کتاب زندگی سے چرا لیا تھا۔ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ اسے سب کچھ یاد آ گیا ہے۔ اس کے بعد وہ تیزی سے صحت کی جانب گامزن ہوا۔ اس کا ریکارڈ اچھا تھا۔ وہ کسی جرم یا بری عادت میں گرفتار نہیں ہوا تھا۔ عدالت نے وقتی اور جذباتی لمحے کا فائدہ دیکر اسے صرف طبی رہنمائی اور نگرانی میں رہا کر دیا۔ ادھر میں اپنی تعلیم مکمل کر کے ڈیٹرائٹ چھوڑ کر کیلی فورنیا آ بسا۔ کئی سال بعد جب میں واپس ڈیٹرائٹ گیا تو اس سے ملاقات ہوئی۔ اس نے سوشل ورک اور سائیکولوجی میں ماسٹرس کیا تھا اور DOMESTIC VIOLENCE کے شعبے میں کام کر رہا تھا۔ اس کی ایک پیار کرنے والی بیوی اور دو پیارے پیارے بچے تھے۔ اپنی ماں کو خراج تحسین پیش کرنے کا اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہ تھا۔

اقبال مہدی

افسانہ

پیاسا کنارہ

وقت دھیرے دھیرے آگے کی طرف بڑھتے ہوئے میرے کانوں میں سرگوشیاں کر رہا ہے۔ ''میں آ گیا ہوں، میں آ گیا ہوں۔!'' تخیل پر جذبات مسلط ہوں تو زندگی سراب کی مانند ہے اور ناقابل بیان حد تک گمراہ کن! یہ میرا المیہ ہے کہ میں حساس لمحوں میں بے قراری کی انتہا کو پہنچ جاتا ہوں۔ لمحے خوشی کے ہوں یا غم کے، دونوں اپنے اپنے انداز سے مجھے مضطرب کرتے ہیں اور میری تنہائی شدید سے شدید تر ہوتی جاتی ہے۔

بیٹی زہرا! تیری یادوں کی پُروائیاں چلتی ہیں تو میرے زخم پھول بن جاتے ہیں۔ ہوا کا ہر جھونکا تیری خوشبو لئے آتا ہے اور میری روح کی گہرائیوں میں جذب ہو جاتا ہے۔ کب آؤ گی بیٹی؟ میں تنہائی کے لمحوں میں ماضی کی صراحی سے تیری یادیں مستقبل کے پیانے میں انڈیلتا رہتا ہوں۔ قطرہ قطرہ! میں بھی ان قطروں کی مانند ایک تڑپتا ہوا قطرہ ہوں جو مصروف سفر ہے، پتہ نہیں کب وقت کی ریت کے بدن میں جذب ہو جائے۔ درد کی پت جھڑ رُت میں تیرا نام۔ صرف ایک تیرا نام ہے۔ بیٹی، جو میرے دل اور روح کے زخموں پر مرہم رکھتا ہے، میری کسک کم ہو جاتی ہے، میری خوابیدہ تمنائیں جاگ اٹھتی ہیں۔ میری بچی خوشی تو تیرا وجود ہے بیٹی زہرا! ورنہ بہار تو ایک گزرا ہوا لمحہ ہے جو فریب دے کر چلا جاتا ہے۔ بھلا دو جوان بیٹوں اور بہوؤں کا باپ کیسے تنہا ہو سکتا ہے؟

ماں باپ بچوں کو پال پوس کر بڑا کرتے ہیں، تعلیم دلاتے ہیں، انھیں اپنے پاؤں پر کھڑا کرتے ہیں، اپنے گھروں کو پیاری پیاری بہوؤں سے سجاتے ہیں اور پھر۔ پھر نہ جانے کیا ہوتا ہے کہ ماں باپ اکیلے رہ جاتے ہیں۔ مگر یہ تنہا انسان چاہتے ہیں کہ رشتوں کی گھنیری چھاؤں کا ایک درخت ہو جس کے تناور تنے سے پیٹھ لگا کر زندگی کی بھاگ دوڑ کے بعد چند گھڑیاں ستا لیں۔ جس کی چھاؤں تلے تھوڑی دیر کے لیے یہ تھکے ماندے، وجود پیر پھیلا سکیں۔ آخر دنیا میں کچھ سہارا تھوڑی سی چھاؤں ان کا بھی تو حصہ ہے۔

نسلوں کا تصادم! کوئی نئی بات نہیں۔ جب نسلیں بوڑھی ہونے لگیں اور نسلیں جوانی کی سرحد میں قدم رکھیں جہاں ماضی کوئی اہمیت نہ رکھتا ہو اور مستقبل سامنے ہو تو سمجھوتے کی گنجائش کہاں! میں ماضی ہوں اور حال میں ایک سہارا مجھے زندہ رکھے ہوئے ہے، وہ ہے میری بیٹی! ورنہ اب زندہ وجود سہارا نہیں بنتے وہ سایہ بن جاتے ہیں اور پکڑ میں نہیں آتے۔ میں زندگی بھر کا تھکا ماندہ انسان ایک کمرے میں بند پڑا رہتا ہوں۔ گھر والوں کی آوازوں کے بھنور دھیرے دھیرے سرگوشیوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ پاس پڑوس سے ہنسنے بولنے کی سرگم کانوں میں گونجا کرتی ہے۔ مگر یہ پرائے قہقہے، پرائی ہنسی۔ میرے دل کے زخموں پر نشتر لگاتی ہے۔ اس نشتر سے میرے دل میں ٹیس اٹھتی

ہے اور میں سوچتا ہوں کے یارب یہ ہنسی میرے آنگن میں چاندنی بن کر کیوں نہیں اترتی ؟ یہ قہقہے میری دہلیز پر آکر کیوں ٹھٹھک جاتے ہیں؟

میرے ساتھ کون رہتا ہے؟ میرا کیا ان سے صرف تعلق اتنا ہے۔ ''آداب میاں جان! آپ کیسے ہیں؟ ناشتہ کرلیا، کھانا کھالیا؟ یہ ہے آج کا اخبار'' اور پھر کوئی آواز نہیں آتی، وہ آوازیں گم ہو جاتی ہیں جن میں محبت کی چاشنی نہیں، کوئی سوال نہیں، کوئی شکوہ نہیں اور کوئی تقاضہ بھی نہیں۔

اے وقت! اے میرے رفیق! تجھے میرے سفید بالوں، میری زندگی کے گزرے ساٹھ سالوں، میری آنکھوں میں اترتے جالوں کی قسم! مجھے بتا کہ ہم ان لوگوں کو جنھیں ہم پیار کرتے ہیں کھو دینے کے بعد کیوں روتے ہیں؟ ہم کسی کی ذات سے کیوں امیدیں باندھ لیتے ہیں۔ وقتی حالات سے متاثر ہو کر ریت کے گھروندے کیوں بناتے ہیں؟ پھر ہم ان گھروندوں کے ڈھ جانے پر کیوں تڑپتے ہیں؟ لیکن وقت کوئی جواب نہیں دیتا وہ تو دلوں پر ان چاہے نقش چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ وقت تو وہ ستم گر ہے جو قدم قدم پر اپنا رنگ بدلتا ہے۔ اِس وقت بحر بیکراں کے اترتے چڑھتے جوار بھاٹے کی حقیقت محض ایک تنکے کی مانند ہے، حالات کی لہریں جدھر جاتی ہیں اُن کا رُخ بدل دیتی ہیں۔ خوشیاں جزِ ذات بن جاتی ہیں۔ شدت جذبات سے مغلوب ہو کر دل کی گہرائیوں سے جو آہ نکلتی ہے اُس سے کتاب زندگی کے اوراق پھڑ پھڑانے لگتے ہیں اور زندگی ورق ورق بکھر جاتی ہے۔

میری بیٹی زہرا! تو میرے بڑھاپے کا سہارا ہے۔ تیرے بغیر ادھورا ہوں۔ ٹوٹ گیا ہوں۔ میرے شکستہ جسم کے کھنڈر کو تو نے اپنے وجود اور محبت سے سہارا دے کر گرنے سے بچا رکھا ہے۔ میرے مجروح وجود کو بانہوں کی گرفت میں لے کر اپنے بوسوں سے میرے خون دل کی ایک ایک بوند کو چوس لیا ہے۔ میرے بچی! تو پیار، محبت، قربانی کی وہ قہقہوں بھری کہکشاں ہے جہاں منزل کی بھیانک تاریکیاں مقدر نہیں بنتیں بلکہ مہ وخورشید بن جاتی ہیں۔ بیٹی! یہ خاموش، کھڑا انسان تیرے بھائیوں کا منہ تکتا رہتا ہے جس کی صبحیں اور شامیں سوچوں میں گزر جاتی ہیں جو بولنا چاہتا ہے تو اس کی زبان گنگ ہو جاتی ہے۔ بیٹی! تو ہی سمجھا دے کہ یہ بدنصیب انسان تمہارا باپ ہے۔ اسے تھوڑی سی محبت دیدو۔ خدارا! اسے وقت سے پہلے بے سروسامان سے مت کرو۔ میری بچی! کب آؤ گی؟ جس مقصد کے لیے تم اپنے باپ سے دور گئی ہو، جلد ہی کامیاب ڈاکٹر بن کر لوٹو۔ میری جان! تم تو مجھے بھائیوں کے سپرد کر کے گئی تھیں۔ بڑا ناز تھا تمھیں اپنے بھائیوں پر۔ کہتے ہیں محبت کی الگ خوشبو ہوتی ہے۔ تمہارے جانے کے بعد خدا جانے کب یہ خوشبو مشک نافہ بن کر مہکی اور میرا مشام جان معطر کئے بغیر ہوا میں تحلیل ہو گئی۔ تمہارا وجود ہی میری زندگی کی سب سے بڑی خوشبو ہے۔ تمہارے وجود کے وہ لمحے جنھیں میں اپنے دکھی وجود میں سمیٹ لینا چاہتا ہوں، جذب کر لینا چاہتا ہوں۔ وہ میری پلکوں کے نمکین پانی میں دھندلا جاتے ہیں اور ایسے میں میں اپنے آپ کو بے حد بے بس محسوس کرنے لگتا ہوں۔ رات بھر کروٹیں بدلتا رہتا ہوں۔ رات اپنے دامن میں میرے اشکوں کو سمیٹ کر خاموشی سے سرک جاتی ہے اپنے پیچھے ایک بھیگی، بھیگی دھند چھوڑ کر!

بیٹی! میں تیرے بھائیوں اور بھاوجوں کا احسان مند ہوں کہ وہ تیرا ہر خط ہر فون مجھ تک پہنچا دیتے ہیں،

لیکن اگر وہ ایسا نہ کریں تو میں اُنہیں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تیری آواز کے جلترنگ میرے کانوں میں گونجا کرتے ہیں۔ تیری تحریروں کے ایک ایک حرف کو تسبیح کے دانوں کی مانند چومتا رہتا ہوں لیکن اُس وقت میں تیرے سہارے کے لیے تڑپ اٹھتا ہوں جب دل میں ایک جلن، روح میں ایک چبھن محسوس کرتا ہوں جبکہ کوئی تیر نہیں چلاتا، نشتر نہیں گھونپتا۔ لیکن اُف! یہ رشتوں کی دوریاں، قربتوں کے فاصلے دلوں کے بند دروازے، گھٹن آمیز خاموشیاں!

میرا پورا وجود تاسف کی مانند ہے جو رنج کی کمزور شاخوں پر پھول بننے سے پہلے بکھر جاتا ہے۔ کس سے اعتبار استوار کروں؟ مجھے تو سب ہوا کی مانند لگتے ہیں اور ہوا کب ہاتھ آئی ہے۔ سوچتا ہوں کہ اپنی ذات کی بیکراں ویرانی میں کہاں گم ہو گیا ہوں۔ کیوں جئے جا رہا ہوں۔ جینا تو زندگی کے چھوٹے بڑے سہاروں اور واسطوں سے ہوتا ہے نا۔ زہرا! خدا کے بعد بس تیری یادوں اور خیالوں کے سہارے ہی زندگی گزر رہی ہے۔ ہر سوال جواب کا متلاشی اور میرے بس میں صرف یادیں!

آج تیرا خط ملا ہے۔ تو میری خاطر آ رہی ہے۔ کیا میں صحیح سمجھا ہوں؟ میری بجھی آنکھوں کے دیئے روشن ہو گئے ہیں۔ جیسے کسی نے میرے دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔ یقین جانو میری روح میں چاندنی بکھر گئی ہے۔ میری سوچ بدل گئی ہے۔ ہر ہوا کا جھونکا تیری خوشبو لیے ہولے سے میرے کمرے کا دروازہ کھولتا ہے۔ سوچتا ہوں باغ میں حقیقی شئے خوشبو ہے۔ ہری ڈالیاں، کانٹے، پھول، یہ سب علامتیں ہیں، میری ذات سے جُڑی ہوئی خوشبو میری بیٹی ہے۔

بیٹی! جو خون تیری رگوں میں دوڑتا ہے وہی تیرے بھائیوں کی رگوں میں بھی تو دوڑتا ہے نا! تو پھر کیا رشتے اسی طرح منجدھار میں چھوڑ دیئے جاتے ہیں؟ کب آؤ گی بیٹی!

پندرہ دن! ایک پل۔ ایک صدی!

میرے گرد میرے رفیقوں کا ہجوم۔ درد۔ کسک۔ جلن۔ خلش!

جوں جوں تیرے آنے کے دن قریب آ رہے ہیں، میری بے قراری بڑھتی جا رہی ہے آنسو نہ جانے کس جہان سے میری آنکھوں میں سما گئے ہیں۔ ایک انجانا سا خوف دل کی گہرائیوں میں کانٹوں کی چبھن پیدا کرتا ہے۔ نہ معلوم میں تجھ سے مل پاؤں گا کہ نہیں؟ ایسے میں مجھے لگتا ہے کہ کسی نے پیچھے سے آ کر دو ملائم بانہیں میرے گلے میں ڈال دی ہوں۔

''میرے میاں جان! میں آ گئی۔ اب تو مت روئیے۔ آپ کو میری جان کی قسم!'' اور جیسے چمپا، موتیا اور چنبیلی نے دوڑ کر خوشبو کے کٹورے بڑھا کر میری پلکوں سے اشکوں کو سمیٹ لیا ہو اور دو ہاتھوں نے چلّو کا کشکول آگے بڑھا دیا ہو۔ ''میاں جان! میں بہت پیاسی ہوں!''

دنوں بعد باپ نے بیٹوں اور بہوؤں کو آواز دی ''میاں جان'' کہہ کر سب ایک ساتھ پکارے اور ان کے کمرے کی طرف بھاگے۔ بچو! خدا جانے کیوں میرا جی چاہا کہ آج میں اپنے چراغوں کو جلا کر اپنے دل کے ساتھ ساتھ کمرے میں بھی چراغاں کرلوں۔ روشنی، بلب اور ٹیوب لائٹ سے نہیں ہوتی۔ روشنی تو گھر کے چراغوں سے

ہوتی ہے۔ یہ دنیا سرائے ہے اور انسان کتنے دن اس سرائے میں رہ سکتا ہے۔ میرے پاس تمہیں دینے کو کچھ نہیں ہے۔ میری بس ایک دولت ہے، جو تم لوگوں کو سونپ رہا ہوں اور وہ ہے میری بیٹی زہرہ! وہ تمہاری بھی تو کچھ لگتی ہے۔ وہ آرہی ہے مجھے اپنے ساتھ لے جانے۔ اس معصوم کو نہیں معلوم کہ اس کا بدنصیب باپ تو پہلے ہی سفر کی تیاری کر چکا ہے اُسے جان سے زیادہ عزیز رکھنا......''

''تم لوگ گھبراؤ نہیں، میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ خاموشی اور فاصلے تو میرا مقدر ہیں۔ مگر میری بات سُن لو۔ یاد رکھو حیات انسان کے تین اہم پہلو ہیں۔ حُسنِ تجزیہ۔ جو انسان کو سنوارتا ہے، حسن ہنر۔ اُسے پھیلاتا ہے۔ حسنِ اخلاق جو اس کا تحفظ کرتا ہے۔ جہاں یہ تینوں برابر ہوں تو وہاں خوبصورتی ہوتی ہے۔ اسی طرزِ زندگی میں انسان کا ثبات ہے اور یہی پختہ سیرت، شریف انسان کی زندگی کا سرمایہ ہے۔''

''احساس کی کیفیت دریا کی مانند ہے۔ یہ کمالِ جوش میں ہو تو دور دور تک زمین کو سیراب کرتا ہے ورنہ اپنے ہی کناروں کو پیاسا رکھتا ہے۔ میں بھی ایک ایسا ہی کنارہ ہوں۔ مجھے زندگی نے سکھایا ہے کہ اگر راستے میں کانٹوں پر گزر ہو تو لہولہان مت ہو بلکہ ان کو چُننے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ انھیں جھیلو! اپنی اولادوں کی اس طرح تربیت کرنا کہ ان کے دل میں محبت، فرمانبرداری، خدمت گزاری، دلداری اور درد کی حرارت ہو۔ میرا دل تو پتھر کا بنا ہے، لیکن سارے جہاں کا درد ایک ہی سینے میں اُبلنے لگے تو اتنے بڑے پہاڑ کو بھی اپنے پر قابو نہیں رہتا۔'' اُن کا سانس پھولنے لگا آنکھیں بیٹی کو تلاش کر رہی تھیں۔

اُنھوں نے چاروں طرف نگاہیں گھمائیں۔ ''باہر بہت اندھیرا ہے!'' دل سے آواز آئی۔ ''اندر بھی کم اندھیرا نہیں۔'' بعض لوگ کسی خاموشی سے چلے جاتے ہیں جیسے کلی نے یہ سن کر تبسم کیا۔

دونوں بھائی قبرستان سے لوٹے ہی تھے۔ لوگوں کا ہجوم تھا۔ گھر کے سامنے ٹیکسی آکر رکی۔ زہرا اتری اور ایک دم ٹھٹھک گئی۔ ''تو وہ چلے گئے!'' دل نے کہا۔

دونوں بھائی بے قرار ہو کر بہن کی طرف لپکے۔

''زہرا'' اندر سے بھاوجوں کے رونے کی صدائیں بلند ہوئیں۔ دونوں بھائیوں نے پورے بدن سے کانپتی بہن کو تھاما۔ ''بی بی! اندر چلو۔''

''اندر'' سوکھے گلے سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔ کچھ دیر سکتے کے عالم میں کھڑی رہی۔ دوسرے ہی لمحے مڑی اور ٹیکسی کی طرف لپکی۔ ''زہرا'' کہاں جا رہی ہو؟'' بھائی نے کہا۔

''قبرستان'' تیزی سے دونوں بھائی اور بھاوجیں بھی آکر ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ راستے بھر قبرستان کی سی خاموشی طاری رہی۔ زہرا خاموشی سے باپ کی تازہ قبر کو دیکھتی رہی۔ خدا جانے سوندھی سوندھی خوشبو مٹی کی تھی یا مٹی کے نیچے میاں جان کے کفن میں لپٹے بدن کی۔ ٹانگوں نے جواب دیدیا، بیٹھ گئی۔ ہاتھوں میں لرزش تھی اور آواز کانپ رہی تھی۔

''میاں جان! آپ چلے گئے۔ اتنا بھی انتظار نہیں کیا کہ آخری بار مجھے گلے سے لگا لیتے اندھیرے آپ کو

اتنے عزیز ہو گئے تھے۔ میں تو آپ کے لیے مٹھی میں جگنو لے کر آئی تھی۔ آپ کے لئے اُجالے لے کر آئی تھی۔ میاں جان! میں ہوں آپ کی قرۃ العین آپ کی لاڈلی بیٹی۔ میاں جان! اپنی مٹھی کھولئے آپ کے جگنو آپ کو دیدوں۔ میں کدھر دیکھوں؟ مجھے کوئی کاندھا نظر نہیں آتا کہ جس پر سر رکھ کر رو سکوں۔ آپ تو بہادر تھے نا! آپ تو موت کے دشت کی مسافت بھی اکیلے ہی طے کر لیں گے۔ میں کہاں جاؤں، کس سے اپنی بے قراری بانٹوں میاں جان؟ آج میں آپ کے بغیر کتنی اکیلی ہو گئی ہوں میاں جان۔ آپ کی قبر کی مٹی اپنے دامن میں باندھ کر لے جاؤں گی۔ آپ کی یہ نشانی ہر وقت مجھے یہ احساس دلاتی رہے گی کہ بھلے ہی آپ کو سب نے محبت سے محروم رکھا، تنہا کر دیا۔ مگر چاہت کا ہنر تو آپ ہی کے پاس تھا۔ یہ مٹی میرے دل کے زخموں کا مرہم بنے گی اور جب بارگاہِ الٰہی میں سجدہ ریز ہوں گی تو یہی مٹی خاکِ شفا بن جائے گی۔"

"زہرا بی بی! اپنے کو سنبھالو۔ اٹھو فاتحہ پڑھ لو۔" بڑی بھاوج نے روتے ہوئے نند کو گلے سے لگایا۔

"ہاں بھابھی جان! آج میاں جان کے لیے دعائے مغفرت کروں گی۔ آپ لوگ تو ان کی زندگی ہی کر چکے تھے۔" اس نے فاتحے کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔ پھر قبر کی مٹی اٹھا کر رومال میں باندھ لی۔

"زہرا! گھر چلیں تم تھک گئی ہوگی۔" بڑے بھائی نے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"تھکن!" وہ بولی "بھائی جان آپ کیا جانیں تھکن کیا ہوتی ہے ٹیکسی کھڑی ہے میں ایئر پورٹ جاؤں گی۔" اُس نے بڑے عزم سے کہا۔ "نہیں۔ نہیں۔ یہ کیا کہہ رہی ہو گھر چلو۔" سب ایک آواز ہو کر بولے "گھر؟ کون سا گھر؟ گھر تو وہ ہوتا ہے جہاں کوئی اپنا ہوتا ہے۔ گھر جہاں کوئی انتظار کرتا ہے۔ میں کہاں جاؤں کون میرا انتظار کر رہا ہے۔ جو میرے منتظر تھے۔ وہ تو چلے گئے۔

وہ تیز تیز قدم رکھتی ٹیکسی میں جا بیٹھی اور ٹیکسی ایئر پورٹ کی جانب دوڑنے لگی۔ بھائی بھاوج سکتے کے عالم میں کھڑے رہ گئے۔ کبھی کبھی ضمیر جب دلوں پر چھیاں چلاتا ہے تو انسان لہولہان نہیں ہوتے بلکہ گونگے ہو جاتے ہیں۔!!

عطیہ خان
لندن

لوہے کی دیواریں

''تم پھر اکیلی آگئیں۔بچوں کو کیوں نہیں ساتھ لاتیں؟'' عذرا بھابی نے آتے ہی سوال کیا۔
''بچے بڑے ہو گئے ہیں، اب وہ ہمارے ساتھ آنا پسند نہیں کرتے۔''
''کیسی تربیت دی ہے تم نے اپنے بچوں کو؟ میرے بچے کیا مجال کہ میرا کہنا نہ مانیں!''
''بھابی، انگلینڈ کے ماحول میں اور ہندوستان کے ماحول میں بہت فرق ہے۔''
''ایسی کوئی بات نہیں۔یہاں بھی میں نے دیکھا ہے کہ ماں باپ کے لاڈ پیار میں بچے بڑے خودسر ہو جاتے ہیں۔یہ تو والدین کے ہاتھ میں ہے کہ بچوں کو کیسی تربیت دی جائے۔'' پھر تھوڑی دیر رک کر بولیں۔''بچے ماں باپ کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔'' یہ اشارہ تھا ہماری اپنی پسند کی شادی کی طرف۔عذرا بھابی باتیں کرتے کرتے ایک تیر ایسا چھوڑتی تھیں جو سیدھا دل پر جا کر لگتا تھا۔
''ہو سکتا ہے میری ہی غلطی ہو۔'' میں نے بحث ختم کرنے کے لیے کہا لیکن عذرا بھابی دیر تک اپنے بچوں کو فرمانبرداری کے قصے سناتی رہیں۔

عذرا بھابی کا گھر ہمارے ہی محلے میں تھا۔ان کے خاندان سے ہمارے خاندان والوں کے پرانے تعلقات تھے۔انور بھائی سے خاص طور سے رضی کی کی بہت دوستی تھی۔دونوں خاندانوں کے تعلقات تو پرانے تھے لیکن کبھی شادی بیاہ کا رشتہ نہیں ہوا۔کیوں کہ وہ لوگ نجیب الطرفین سید تھے اور کسی قیمت پر اپنے خون میں ملاوٹ کے لیے تیار نہیں تھے۔ہمارے کسی بزرگ نے ایک ڈومنی سے شادی کر لی تھی اس لیے شریفوں کی برادری سے خارج کر دیے گئے تھے۔نتیجہ یہ ہوا کہ جس کو جہاں رشتہ ملا وہیں شادی ہوگئی۔اس لیے ہمارا خاندان بہت کھچڑی قسم کا تھا۔عذرا بھابی کی نظروں میں یوں تو ہم لوگ حقیر ہی تھے لیکن دوستی نبھانا وہ لوگ مذہبی فرائض کی طرح لازمی سمجھتے تھے۔ہم لوگ جیسے ہی لندن سے آتے، انور بھائی اور عذرا بھابی فوراً ملنے کے لیے آتے۔

شریفوں کی برادری سے نکالے جانے کا فائدہ ہمارے خاندان کو یہ ہوا تھا کہ سماجی حیثیت بنانے کے لیے تعلیم کا چرچا محلے کے دوسرے گھرانوں کے مقابلے میں کافی پہلے شروع ہو گیا تھا۔انور بھائی کی تعلیم واجبی سی تھی اور ان کا ذریعہ آمدنی کوئی چھوٹا موٹا کاروبار تھا۔لیکن انہوں نے اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی، بڑا لڑکا انجینیر ہو گیا تھا اور لڑکی ایک ڈگری کالج میں لیکچرر تھی۔چھوٹا بیٹا دوبئی میں ملازم تھا۔

رضی اس بار اپنے کام کے سلسلے میں آئے تھے اس لیے بہت مصروف رہتے تھے۔میں نے سوچا کہ چند روز کے لیے اپنے آبائی شہر الہ آباد ہو آؤں کیونکہ اب میرے بھائی ریٹائر ہو کر الہ آباد آ گئے تھے۔عذرا بھابی کو جب معلوم ہوا کہ میں الہ آباد جا رہی ہوں تو انہوں نے اپنے بیٹے جاوید کے لیے کچھ سامان میرے ساتھ کر دیا اور بڑا اصرار کیا کہ

میں اس کے گھر ضرور جاؤں ۔'' اس کا فون ہر ہفتے سب کی خیریت معلوم کرنے کے لیے آتا ہے۔ بڑی محبت ہے میرے بچوں کو اپنے گھر سے اور میرے تو اشاروں پر چلتے ہیں۔ جاوید کو ملازمت کی وجہ سے گھر سے اتنی دور رہنا پڑتا ہے لیکن اس کا دل گھر ہی میں لگا رہتا ہے۔ میں اس سے کہہ دوں گی کہ تمہیں لینے اسٹیشن آ جائے۔''

''آپ جاوید کو زحمت نہ دیں۔ بھائی کے گھر سے ضرور کوئی مجھے لینے اسٹیشن آئے گا۔''

''تمہارا بھتیجا الہ آباد میں ہوتے ہوئے تمہیں لینے اسٹیشن کیوں نہ آئے۔ اسے تو سرکاری جیپ اور ڈرائیور ملا ہوا ہے۔ تم دیکھنا ماشاءاللہ اس کی کتنی اچھی حیثیت ہے۔ میں ایک بار اس کے پاس گئی تھی۔ وہ تو بہت چاہتا ہے کہ میں اس کے ساتھ رہوں لیکن گھر کی پابندیوں کی وجہ سے جانا نہیں ہو پاتا۔''

''اب تو جاوید کو ملازم ہوئے کئی سال ہو چکے ہیں، اس کی شادی کب کریں گی؟''

''لڑکی ڈھونڈ رہی ہوں، اس کے لائق کوئی لڑکی نظر بھی تو نہیں آتی۔''

''کیسی لڑکی چاہیے جاوید کے لیے۔''

''پڑھی لکھی ہو، خوبصورت ہو، سید ہو کھاتے پیتے باعزت گھرانے کی ہو اور کیا کوئی خاص بات تھوڑی دیکھنا ہے۔''

میں نے دو تین لڑکیوں کے نام لیے۔ ہر ایک میں انہوں نے کوئی نہ کوئی عیب نکال دیا۔ کسی کا قد چھوٹا ہے، کسی کا رنگ کم ہے۔ کسی کے خاندان میں کوئی خرابی ہے۔ میں نے سوچا کہ اگر یہی نخرے رہے تو ہو چکی شادی۔

الہ آباد ٹرین پہنچی تو میرا بھتیجا اسٹیشن پر موجود تھا۔ جاوید اپنی جیپ لے کے ضرور آئے گا۔ عذرا بھابی نے یقین دلایا تھا۔ لیکن جاوید کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ میں نے تھوڑی دیر انتظار بھی کیا۔ دوسرے دن میں نے بھائی صاحب سے کہا۔

''ہمارے محلے کا ایک لڑکا یہاں ایکزیکٹو انجینیر ہے۔ میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔ اس کے لیے کچھ سامان میرے پاس ہے۔''

ہاں میں تمہیں ملوادوں گا۔ اس کے سسر سے تو میرے بہت پرانے تعلقات ہیں۔ ہم دونوں یونیورسٹی میں ساتھ تھے۔''

''سسر؟ آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟ جاوید کی تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی ہے۔ اس کی والدہ تو اس لیے لڑکی تلاش کر رہی ہیں۔''

''اس کی شادی کیسے نہیں ہوئی۔ اس کے تو دو بچے بھی ہیں۔''

''نہیں بھائی صاحب، آپ کسی اور کی بات کر رہے ہیں۔''

''تم جاوید انور کی بات کر رہی ہو۔ وہ دہلی کے ہیں، یہاں چار سال سے ایکزیکٹو انجینیر ہیں۔ ان کا بیٹا دو سال کا ہے۔ بیٹی پچھلے مہینے پیدا ہوئی ہے۔ انہیں سرکاری مکان ملا ہوا ہے مگر بیوی اپنے میکے ہی میں رہتی ہے۔ اکلوتی بیٹی ہے۔ اس لیے ماں باپ اسے اپنے پاس ہی رکھتے ہیں۔ تم اپنی بھابی کے ساتھ ان کے گھر چلی جانا۔''

میری ہمت نہیں ہوئی کہ میں جاوید کی بیوی سے ملنے جاتی۔ جاوید کے آفس فون کیا تو پتہ چلا کہ ابھی آفس نہیں

آئے ہیں۔ میں نے پیغام چھوڑ دیا کہ جب آفس آئیں تو مجھے فون کرلیں۔ لیکن جاوید کا فون نہیں آیا۔ چلنے سے پہلے جو سامان عذرا بھابی نے دیا تھا وہ جاوید کے دفتر پہنچا دیا۔ دہلی واپس آکر میں نے کسی سے جاوید کی شادی اور بچوں کا ذکر نہیں کیا۔ عذرا بھابی سے کہہ دیا کہ جاوید الہ آباد میں نہیں تھے اس لیے ان سے ملاقات نہیں ہوسکی۔ سامان ان کے دفتر بھیج دیا تھا۔

الہ آباد سے واپس آئے ایک ہفتہ گزرا تھا کہ ایک دن بوا ہانپتی کانپتی بڑی تیزی سے اوپر آئیں۔ زینہ چڑھنے سے ان کی سانس بری طرح پھول رہی تھی۔ بڑے کمرے میں جہاں ہم سب لوگ بیٹھے تھے آکر بھد سے بیٹھ گئیں۔

''انور میاں کی بٹیا نے...'' بمشکل اتنا کہہ پائی تھیں کہ ان پر کھانسی کا ایسا دورہ پڑا کہ بے حال ہوگئیں۔ بوا ہماری ساس کے زمانے سے گھر میں نوکر تھیں۔ اب بڑھاپے اور بیماری کی وجہ سے ان سے کام نہیں ہو پاتا تھا۔ وہ نیچے کے مکان میں اپنی بیٹی کے ساتھ رہتی تھیں جو اب ان کی جگہ ہمارے گھر میں کام کرتی ہے۔

پرانی دہلی کا یہ محلہ کسی طرح دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کی راجدھانی کا حصہ نہیں لگتا ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ 1857 کی دہلی کا ایک ٹکڑا نمونے کے طور پر محفوظ کرلیا گیا تھا لیکن اس کی دیکھ بھال نہیں ہوسکی۔ پتلی پتلی گندی گلیاں۔ انتہائی گنجان آبادی۔ ٹوٹے ہوئے پرنالوں سے پانی گرتا رہتا ہے۔ کھلی ہوئی نالیوں میں فضلہ بہتا نظر آتا ہے۔ پرانے خستہ حال مکان۔ خود ہمارا مکان بھی کئی سو سال پرانا ہے۔ لکھوری اینٹ کا بنا ہوا۔ اتنے بڑے مکان کی مرمت بھی آسان نہیں۔ میں جب شادی کے بعد یہاں آئی تو مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی تھی کہ اتنی پتلی سی گلی کے اندر اتنا بڑا سا مکان موجود ہے۔ نیچے کے حصے میں اتنی سیلن ہے کہ جاڑوں میں تو دیواروں پر سیلن کی وجہ سے پانی کے قطرے ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے کہ مکان اپنی بدحالی پر آنسو بہا رہا ہو۔ اس لیے رہائش اوپر ہی کے حصے میں ہے۔ رضی کے دونوں بڑے بھائی ساتھ رہتے ہیں انہوں نے اوپر کے حصے میں مرمت اور اضافے کر کے اسے کافی آرام دہ بنالیا ہے لیکن نیچے کے صرف چند کمرے استعمال کے لائق ہیں جو مہمانوں کے لیے اور بچوں کے پڑھنے کے لیے ہیں۔ باقی اتنے بڑے گھر میں کوڑا کباڑا بھرا رہتا ہے اور ایک حصے میں بوا اپنی بیٹی داماد اور نواسے نواسیوں کے ساتھ رہتی ہیں۔ ان لوگوں کے رہنے کے لیے مفت جگہ ملی ہے اور ہمارے گھر والوں کو کام کرنے کے لیے مفت کے اتنے نوکر ملے ہوئے ہیں۔ بوا کو دمے کی سخت شکایت ہے اس لیے اوپر بہت کم آتی ہیں۔ اگر آتیں بھی تو بہت سنبھل سنبھل کر آہستہ آہستہ سیڑھیاں طے کرتیں۔ لیکن اس وقت بوا نے محلے کے نیوز نیٹ ورک پر کوئی بہت دھماکے دار خبر سنی تھی جسے نشر کردینے میں وہ اولیت حاصل کرنا چاہ رہی تھیں۔ لیکن کھانسی کی وجہ سے جملہ پورا نہیں کر پائیں۔ بوا کیا خبر لائی ہیں، یہ سننے کے لیے سب بے چین تھے۔ بوا کو کرسی پر بٹھا کر پیٹھ سہلائی گئی۔ پانی پلایا تو ان کی کھانسی ذرا کم ہوئی اور انہوں نے جملہ پورا کردیا،''...کوئین میری کرلی۔''

خبر پوری کر کے انہیں سکون ہوگیا تھا۔ لیکن ہم لوگوں کی سمجھ کچھ نہیں آیا۔

''کیا بنو کوئین میری اسپتال میں داخل ہے؟'' چھوٹی بھابی نے پوچھا۔ بوا نے نفی میں سر ہلایا۔ اب ان کی سانس سینے میں ذرا سمانے لگی تھی۔ ہمت کر کے انہوں نے پھر اپنا جملہ دہرایا،''انور میاں کی بٹیا نے کوئین میری کرلی۔''، لیکن ہم لوگوں کی معلومات میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔

ہمارا ایک بھتیجا جو کالج سے ابھی آیا تھا وہ بھی وہاں آکر کھڑا ہوگیا تھا۔اس نے مسکراتے ہوئے بوا کے بیان کی وضاحت کی"بوا کہہ رہی ہیں کہ بنو باجی نے کورٹ میرج کرلی ہے۔"

"تمہیں کیسے معلوم؟" کمرے میں اکٹھا سب لوگوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"بنو باجی کا دیور میرے ساتھ پڑھتا ہے۔ بنو باجی کی دوست صبیحہ کے بھائی بہت دنوں سے بنو باجی سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ان کی بڑی بہن شادی کا پیغام لائیں تو عذرا چچی نے انہیں بے عزت کرکے گھر سے نکال دیا کہ نیچ قوموں کی ہمت کیسے ہوئی کہ ہمارے گھر میں شادی کا پیغام دیں۔ وہ لوگ کسی پچھڑی ذات کے ہیں اس لیے فرخ بھائی کا انڈین پولیس سروس میں رزرویشن کی وجہ سے انتخاب ہوگیا۔ وہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ہیں۔گھر میں اور سب لوگ بھی پڑھے لکھے ہیں۔ بنو باجی کے ساتھ صبیحہ بھی ڈگری کالج میں پڑھاتی ہیں لیکن وہ لوگ سید نہیں ہیں۔اس لیے عذرا چچی کبھی یہ شادی نہ ہونے دیتیں۔اس وجہ سے فرخ بھائی اور بنو باجی نے کورٹ میں جاکر شادی کرلی۔"

"بنو کی عمر ہماری فرزانہ کے برابر ہے۔اس کے تو دونوں بچے بھی اسکول جاتے ہیں۔لڑکی کو گھر بٹھائے رکھنے کا یہی انجام ہوتا ہے۔دیکھ لینا جاوید بھی اس طرح کہیں شادی کرلے گا۔وہ تو بنو سے بھی چار پانچ سال بڑا ہے۔" بڑی بھابی بولیں۔ میں نے ان کی بات سن کر اس طرح نظریں جھکالیں کہ کہیں میری نظروں سے جاوید کا راز ظاہر نہ ہوجائے۔

اس واقعے کے چندروز بعد ہم لوگوں کے لندن واپس آنا تھا۔عذرا بھابی ہمیشہ مجھ سے ملنے آتی تھیں۔انہوں نے کبھی یہ شکایت نہیں کی کہ میں ان کے گھر کیوں نہیں جاتی۔ وہ ہمیشہ کہتیں،"تم اتنی دور سے آجاتی ہو تو کیا ہم پانچ قدم چل کر بھی تم سے ملنے نہیں آسکتے؟"

ہماری واپسی کا دن آگیا لیکن عذرا بھابی نہیں آئیں۔ پتہ چلا کہ انور بھائی بیمار ہیں۔ ظاہر ہے اس حالت میں وہ کیسے آتیں۔رضی تو جاکر انور بھائی سے مل آئے لیکن میری عذرا بھابی کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہورہی تھی۔ وہ اس بیمار تہذیب کی نمائندہ تھی جس میں اپنے اور اپنوں کے عیب چھپا کر قطعی بے عیب ثابت کیا جاتا ہے اور دوسروں کی چھوٹی چھوٹی خامیوں کو بھی بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا ہے۔مگر بنو کی شادی کو وہ اب چھپا نہیں سکتیں۔کہیں یہ نہ سمجھیں کہ میں انہیں شرمندہ کرنے آئی ہوں۔لیکن عذرا بھابی سے اخلاقاً ملنا بھی ضروری تھا۔کسی طرح ہمت کرکے ان کے گھر گئی۔انور بھائی تو خاموش لیٹے رہے مگر عذرا بھابی کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ کہنے لگیں،"بنو آج کل کالج میں بہت مصروف رہتی ہے اس لیے تم سے ملنے نہیں آسکی۔تم تو شام کو جاؤ گی۔اس وقت تک وہ آگئی تو تم سے ملنے ضرور آئیگی۔" میں نے ان کا چہرہ دیکھا۔ان کے اندرونی غم وغصے کا کوئی اثر ان کے چہرے پر نمایاں نہیں تھا۔عذرا بھابی نے اپنے خاندانی وقار، اپنی پرانی تہذیب، اپنی اخلاقی برتری ظاہر کرنے کے لیے اپنے خاندان کے گرد لوہے کی دیواریں کھڑی کررکھی تھیں تاکہ ان کے خاندان کی کوئی ایسی ویسی بات باہر نہ جاسکے۔اور دوسروں کی کھلی ہوئی دنیا جس میں تبدیلی صاف نظر آتی تھی ان پر وہ احساس برتری کے ساتھ اعتراض کرکے خوش ہوتی تھیں۔انہیں شاید اب بھی یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ ان کی لوہے کی دیواروں میں وقت کا زنگ لگ کر سوراخ ہوچکے ہیں۔

ڈاکٹر وسیم صدیقی، کویت

رشتہ

نگار سوچتی تھی خوبصورتی کتنی بڑی نعمت ہے اور کبھی کبھی زحمت بھی۔ ابھی انٹر میں پڑھ رہی تھی اور اس کے رشتے آنا شروع ہو گئے تھے۔ چچازاد، ماموں زاد، پھوپھی زاد سب ہی کے۔ اس کے سب ہی کزنس میں اسے پانے کے لیے ایک مقابلہ تھا۔ اسے اب ان رشتوں سے ایک الجھن سی ہونے لگی تھی۔ اُس نے انٹر کرلیا اور یونیورسٹی میں داخلہ ہوگیا۔ پہلے ہی دن انگلش کا لکچرار امجد اس پر کسی جن کی طرح عاشق ہوگیا۔ خاندان کے لڑکوں کے وار سے تو وہ بچ گئی تھی لیکن اس کے وار سے نہیں بچ پائی۔

اس دوران اس کا ایک اور رشتہ آ گیا لڑکے نے انجینئرنگ اور MBA کیا تھا اور جدہ میں کسی بڑی فرم میں Technical Advisor تھا۔ انڈیا شادی کرنے کے لیے آیا ہوا تھا۔ نگار کو رکشہ پر بیٹھ کر یونیورسٹی سے گھر واپس جاتے دیکھا تو کسی مقناطیس کی طرح کھنچا ہوا اس کا گھر دیکھ آیا۔ خاندان وغیرہ کے بارے میں پتہ کیا گیا اور دوسرے دن اس کی والدہ اور بہن نگار کے گھر رشتہ لے کر پہنچ گئیں۔ اچھا اسمارٹ لڑکا، اچھا خاندان اچھی نوکری اور کیا چاہیے۔ لیکن نگار پر تو امجد کے پیار کا سرور تھا اس نے سعودی عرب والے رشتہ سے صاف انکار کردیا اور وہ بیچارہ افسردہ سعودی عرب واپس چلا گیا۔ اور نگار کی امجد سے شادی ہوگئی۔

امجد کو جدہ یونیورسٹی میں انگریزی کی لکچرر شپ آفر ہوئی تو نگار بہت خوش ہوئی۔ امجد نے جدہ یونیورسٹی جوائن کرلی تھی اور کچھ مہینوں میں نگار کی ویزا وغیرہ کی کاروائی مکمل ہوئی تو وہ بھی امجد کے پاس جدہ چلی گئی۔ امجد کا دو کمروں کا اپارٹمنٹ اُسے بہت چھوٹا لگا۔ 'اس گھر میں آنگن برامدہ تو ہے ہی نہیں۔' اس نے معصوم سا سوال کردیا تھا۔ امجد اس کے سوال کو Sportingly نہیں لے پایا اور اس نے بہت رکھائی سے نگار سے کہا تھا اب تم ایسے چھوٹے سے گھر میں رہنے کی عادت ڈال لو۔ یہاں ہندوستان کی طرح بڑا سا مکان نہیں ملے گا۔

آج امجد اور نگار کی اشرف واحد کے گھر دعوت تھی۔ اشرف واحد بہت سالوں سے سعودی عرب میں رہتے تھے اور لکھنو میں امجد کے پڑوسی بھی۔ جب امجد اور نگار ان کے گھر پہنچے تو اشرف واحد نے نگار کو دیکھا تو ایک گہری سانس لے کر دھم سے صوفے پر بیٹھ گئے۔ یہ تو وہی لڑکی ہے جسے رکشہ پر بیٹھا دیکھ کر وہ اس پر عاشق ہو گئے تھے۔ وہاں لکھنو میں تو انہوں نے اس لڑکی کو دور ہی سے رکشہ پر بیٹھا دیکھا تھا۔ یہاں وہ اُن کے بالکل سامنے صوفے پر بیٹھی تھی۔ بلا کی حسین۔ وہ امجد کی قسمت پر رشک کرنے لگے۔ اور نگار اشرف واحد کے گھر کی چکا چوند میں گم تھی۔

بڑا سا شاندار گھر بہت خوبصورتی سے سجایا گیا تھا، بڑے بڑے کمرے خوبصورت Painting سے آویزاں۔

باہر خوبصورت لان جس میں دھیمی دھیمی سی گارڈن لائٹس۔ پورے گھر کی فضا بہت رومانٹک تھی۔ اشرف واحد کی پرسنالٹی بھی بہت شاندار تھی۔ انہوں نے کئی Families کو بلایا ہوا تھا اور ان کے ہلکے پھلکے لطیفوں سے

پوری محفل لالہ زار بن ہوئی تھی۔ نگار بھی ان کے کسی لطیفے پر اپنی ہنسی نہیں روک سکی تھی اور بے تحاشہ ہنسی تھی۔ جس پر امجد کو اس کے کان میں دھیرے سے کہنا پڑ گیا تھا 'کنٹرول یار'

نگار اور امجد اپنے گھر واپس آ گئے تھے۔ اشرف واحد کے گھر سے واپس آنے کے بعد نگار کو اپنا گھر کچھ زیادہ ہی خراب لگنے لگا۔ چھوٹے چھوٹے کمرے معمولی سا فرنیچر۔

''یہ آدمی اتنا مالدار، اتنا ہینڈسم ہے، اس کی اب تک شادی کیوں نہیں ہوئی؟'' نگار نے امجد سے ڈائرکٹ سوال کیا تھا۔

''دیکھو مجھے تم کو اسے ہینڈسم کہنے پر اعتراض ہے!'' امجد نے برا ماننے کے انداز میں کہا اور نگار ہنسنے لگی۔ یہ کمبخت واحد ہے ہی لیڈی کلر۔ امجد بڑبڑایا تھا۔

امجد کو جدہ میں رہتے ہوئے تین سال پورے ہونے والے تھے وہ لکھنؤ یونیورسٹی سے تین سال کی چھٹی لے کر آیا تھا اور اب سوچ رہا تھا کہ لکھنؤ یونیورسٹی میں اپنا Resignation بھیج دے۔ جدہ اسے بہت اچھا لگا تھا۔ اس بیچ اشرف واحد کے گھر ان کا بہت آنا جانا رہا۔ آج بھی ان لوگوں کی اشرف واحد کے گھر دعوت تھی اور صرف انہی لوگوں کی۔ کوئی دوسری فیملی مدعو نہیں تھی۔ کھانا کھانے کے بعد وہ سب لاونج میں بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے۔ ہندوستان اور آسٹریلیا کی کرکٹ سیریز چل رہی تھی اس لیے کرکٹ کی ہی باتیں ہو رہی تھیں۔ امجد کو کرکٹ سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی اس لیے اس کی اور اشرف واحد کی اچھی گفتگو ہو رہی تھی۔ کرکٹ کے سارے رکارڈس نگار کی Tips پر تھے۔

''اچھا اب کرکٹ کے علاوہ بھی کچھ اور باتیں ہو جائیں۔'' امجد نے کہا وہ اپنے کو تھوڑا سا الگ تھلگ محسوس کرنے لگا تھا۔

''اور کیا باتیں ہوں...... آپ نے کبھی اشرف صاحب سے نہیں پوچھا کہ انہوں نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟''، نگار نے امجد سے کہا۔

''آپ مجھے بیچ میں کیوں لا رہی ہیں آپ خود اشرف سے پوچھ لیجئے۔''، نگار اب اشرف واحد کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ اشرف کچھ بے چین سے نظر آ رہے ہیں اور اس کو عجیب نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ پھر وہ ایک دم ہنسنے لگے اور بولے،''پوری زندگی میں صرف ایک لڑکی پسند آئی تھی۔ اس کے گھر رشتہ دیا۔ لڑکی نے انکار کر دیا۔ بس یہی بہت مختصر سی کہانی ہے۔

وہ دونوں اپنے گھر واپس آ گئے تھے۔ نگار کہہ رہی تھی،''وہ کوئی پاگل ہی لڑکی رہی ہوگی جس نے اتنے اچھے رشتہ سے انکار کر دیا۔ بھلا بتایئے کیا کمی ہے اس انسان میں''۔

''ہاں نگار تم ٹھیک کہہ رہی ہو وہ لڑکی پاگل ہی تھی اور مجھے پاگل لڑکیاں پسند ہیں اس لیے میں نے اس سے شادی کر لی''۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''مطلب یہ کہ تم جو مجھ سے اکثر اپنے سعودی عرب والے رشتہ کی بات کرتی ہو جو تم نے انکار کر دیا تھا وہ بھی اشرف واحد تھے۔''

''ارے!''، نگار اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ پائی۔

رات زیادہ ہو گئی تھی۔ امجد محسوس کر رہا تھا کہ نگار بار بار کروٹیں بدل رہی ہے۔ اس نے پوچھا، ''کیا نیند نہیں آرہی ہے؟'' ''ہاں!'' اس نے مختصر سا جواب دیا تھا۔ امجد سوچنے لگا یہ بات اسے نگار سے نہیں بتانا چاہیے تھی۔ ہوسکتا ہے اسے پچھتاوا ہو رہا ہو۔ اس کا اور اشرف واحد کا کوئی مقابلہ نہیں۔ کہیں وہ اسے چھوڑ...... دھوکا...... بے وفائی، نہیں! وہ اس سے زیادہ نہیں سوچنا چاہتا تھا۔ نگار اب اٹھ کر بیٹھ گئی اور امجد سے بولی، ''امجد تم سے ایک گزارش ہے۔ مجھ سے اب اس چھوٹے سے مکان میں نہیں رہا جاتا، پلیز! میری بات مان جاؤ!''

امجد سوچنے لگا اب بم پھٹنے والا ہے۔ اسے پورا اندازہ تھا اشرف واحد اب بھی دوڑا دوڑا نگار سے شادی کرے گا۔

''کیا چاہتی ہو تم؟'' اس نے بہت رکھائی سے نگار سے پوچھا تھا۔

''میں نے تم سے کہا تھا نہ کہ مجھ سے اب اس چھوٹے سے مکان میں نہیں رہا جاتا۔ پلیز لکھنو واپس چلے چلو۔ وہاں ہم لوگوں کا مکان اس سے کہیں زیادہ بڑا ہے''۔

امجد نے اطمینان کی سانس لی تھی۔

''ٹھیک ہے ڈارلنگ ہم لوگ ہندوستان واپس چلیں گے۔''

طاہر نقوی، کراچی

ایمرجنسی

میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ بیوی کی درد میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر ٹیبل لیمپ آن کیا۔ وہ اپنی مسہری پر تکلیف سے کروٹیں بدل رہی تھی۔ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر میں گھبرا گیا۔ وہ جواب دینے کے قابل بھی نہیں تھی۔ ویسے پوچھنے پر محض کراہتی رہی۔ میں سہارا دے کر جیسے تیسے گیراج تک لے گیا اور اسے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔

ابھی رات زیادہ نہیں ہوئی تھی۔ مگر موجودہ حالات کی وجہ سے سڑک پر ہو کا عالم تھا۔ ہسپتال پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ میں نے بیوی کو سہارا دے کر گاڑی سے اتارا اور ہسپتال کے اندر لے جا کر قریب رکھی ہوئی بنچ پر لٹا دیا۔ پھر کاؤنٹر کی طرف لپکا۔ وہاں ایک نرس کرسی پر بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ میں نے اسے آواز دی تو اس نے ناگواری سے دیکھا۔ میں نے گھبراہٹ کے عالم میں بیوی کی طرف اشارہ کیا اور بتایا کہ میری بیوی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔ اس نے کوئی تاثر نہیں دیا۔

''کسی ڈاکٹر کو بلائیے۔''

وہ چپ رہی۔

''آخر آر ایم او کہاں ہیں؟''

''تھوڑی دیر میں آجائیں گے۔''

میں بیوی کے پاس جا بیٹھا۔ اس کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ لیکن نرس اسی طرح مطمئن بیٹھی رہی۔ اس کے قریب جا کر میں نے سختی سے کہا۔

''ڈاکٹر کو بلائیے۔''

''میں کاؤنٹر چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔''

''تو وارڈ بوائے......''

''وہ چھٹی لے کر چلا گیا۔''

میں اپنے پاؤں پٹخنے لگا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ اس نرس کی گردن دبا دوں۔ اسے میری پریشانی اور بیوی کی شدید تکلیف کا کوئی احساس نہ تھا۔

''آخر ڈاکٹر صاحب کب آئیں گے؟'' میں نے تقریباً خوشامدانہ لہجے میں پوچھا۔

''ایمرجنسی ہو گئی ہے۔ وہاں گئے ہیں۔''

''ہسپتال سے باہر؟''

''نہیں۔ ہسپتال میں ہی۔''

''تو آپ انہیں انٹر کام سے اطلاع دیجئے۔ آپ دیکھ رہی ہیں کہ...''

''ہسپتال میں ہر مریض ایسا ہی آتا ہے۔''

میں اس کی بات پر تلملایا۔ وہ اسی طرح مطمئن بیٹھی رہی۔ میں اپنے آپ کو اس کے سامنے بے بس پارہا تھا۔ کبھی بیوی کے پاس جاتا اور کبھی متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا۔ میں نے آن ڈیوٹی آر ایم او کا نام پوچھا تو اس نے لاپرواہی سے نام بتایا۔ یہ سن کر مجھے ذرا اطمینان ہوا۔ کیونکہ میں اس ڈاکٹر کو پہلے سے جانتا تھا۔ اب اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''پلیز آپ بیٹھ جایئے''

''آخر ڈاکٹر کب تک...''

''بتایا نا...... ایمرجنسی۔''

بیوی گھڑی گھڑی مجھے مدد کے لئے دیکھتی رہی۔ میں اس کے لئے کچھ نہیں کر پارہا تھا۔ میں نے نرس سے بے اختیار کہا۔

''تو آپ ہی کوئی دوا......''

''نہیں۔ دوا ڈاکٹر ہی دیں گے۔''

''مگر ڈاکٹر...''

نرس کی طرف سے مایوسی اور بیوی کی بگڑتی ہوئی حالت دیکھتے ہوئے میرا ذہن کام نہیں کر رہا تھا۔ بیوی کی طرف سے میں اب مایوس ہونے لگا۔ چنانچہ گھبراہٹ کے عالم میں مختلف وارڈز میں جا کر خود ہی ڈاکٹر کو تلاش کرنے لگا۔ ہر وارڈ میں خاموشی تھی۔ کچھ مریض سو رہے تھے۔ اور کچھ لیٹے لیٹے چھت کی طرف تک رہے تھے۔ میں دیوانوں کی طرح ڈاکٹر کو تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ اب نرس نے سختی سے مجھے منع کیا کہ مریضوں کو تنگ نہ کرو۔ میں نے اس کی یہ بات نہیں مانی۔ اور گراؤنڈ فلور کے کمروں میں جا جا کر دیکھنے لگا۔ اسی جستجو میں ایک کمرے سے مجھے کوئی آواز سنائی دی۔ میں سمجھ گیا کہ ڈاکٹر کسی مریض کو یہیں دیکھ رہا ہوگا۔ میں نے کھولنے کے لئے دروازے پر دباؤ ڈالا۔ وہ نہیں کھلا۔ برابر والی کھڑکی کے پٹ بھی نہیں کھلے تھے۔ ایک شیشہ ٹوٹا ہوا نظر آیا تو میں نے اندر دیکھنے کی کوشش کی۔ تا کہ ڈاکٹر کو اپنی بیوی کی حالت بتا سکوں۔ وہاں ڈاکٹر اور نرس دونوں موجود تھے۔ مگر...؟

☆

گوشۂ یوسف ناظم

مجتبیٰ حسین

یوسف ناظم کا خلا کون پُر کرے گا

جیسا کہ آپ جانتے ہیں پچھلے چار دہوں کے عرصہ میں روس کے پہلے خلاباز یوری گگارن کے خلا میں جانے اور پھر امریکہ کے نیل آرم اسٹرانگ کے چاند پر بہ نفس نفیس چہل قدمی فرمانے کے بعد سائنس اور ٹکنالوجی کی حیرت انگیز ترقی کی بدولت دنیا بالآخر خلائی دور میں داخل ہوگئی اور اب تو انسان نہ صرف مریخ پر کمندیں پھینک رہا ہے بلکہ چند ترقی یافتہ ممالک بھی (بشمول ہندوستان) خلائی دور میں داخل ہو گئے ہیں جن کے کئی مصنوعی سیارے اس وقت خلا میں محوِ گردش ہیں۔ ممالک تو خیر ممالک ہیں جن کے پاس بے شمار وسائل کے علاوہ خلا میں جانے کی ٹکنالوجی بھی ہے، ایسے میں آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ ہماری پیاری زبان اردو، جس کے پاس اس کرۂ ارض پر اب کوئی قابلِ لحاظ علاقہ تک نہیں رہ گیا ہے اور جس کے پاس کوئی قابلِ لحاظ خلائی ٹکنالوجی بھی نہیں ہے (سوائے علم عروض اور صرف ونحو کی ٹکنالوجی کے) بڑی آن بان کے ساتھ خلائی دور میں داخل ہوگئی ہے۔ یوں اردو زبان کو خلائی دور میں داخل ہونے والی دنیا کی پہلی زبان بننے کا شرف بھی حاصل ہوگیا ہے این سعادت بزور بازو نیست۔ مرحبا، آفریں! آپ نے دیکھا ہوگا کہ پچھلے چالیس برسوں میں جب سے خلائی تحقیقات کا آغاز ہوا ہے اردو زبان کا جو کوئی بھی شاعر یا ادیب مرتا ہے وہ اپنے پیچھے ایک بڑا اور بسیط خلا پیدا کر کے چلا جاتا ہے۔ جسے اس دھرتی پر سر چھپانے کا حقدار نہیں سمجھا جاتا وہ مرنے کے بعد خلا کی لامتناہی وسعتوں کا دعویدار بن جاتا ہے۔ ہم نے ایک بار لکھا بھی تھا کہ اردو کا ادیب جہاں مر مر کے جی رہا ہے، وہیں وہ مر مر کے خلا بھی پیدا کرتا چلا جا رہا ہے۔ بلکہ اردو کے ''خلا رسیدہ'' ادیبوں اور شاعروں کی اتنی بھیڑ ہوگئی ہے کہ بعض ادیب اور شاعر تو جیتے جی بھی خلا پیدا کرنے کے اہل بن گئے ہیں۔ یادش بخیر جب فیض احمد فیض کا انتقال ہوا تو ایک اخباری نمائندے نے مشہور شاعر منیر نیازی سے (جواب خود بھی خلایاب بن گئے ہیں) سوال پوچھا تھا کہ کیا اب آپ اُس خلا کو پُر کریں گے جو فیض کے انتقال سے پیدا ہوا ہے۔ اس پر منیر نیازی نے نہایت اعتماد کے ساتھ جواب دیا تھا ''میں تو ان کی زندگی میں بھی اُن کے خلا کو پُر کرتا رہا ہوں''۔ منیر نیازی تو خیر صاحب کمال شاعر تھے اور ایسا جواب دینے کی جسارت بھی کر سکتے تھے۔ لیکن اب جو باقی ماندہ ادیب اور شاعر زندہ رہ کر ادب میں خلا پیدا کر رہے ہیں اور اپنی تخلیقات میں خلائی باتیں کرتے چلے جا رہے ہیں اُن کی زندگی کا واحد مقصد ہمیں تو یہ نظر آتا ہے کہ ادب پیدا ہو یا نہ ہو خلا کو ضرور پیدا ہونا چاہئے۔

ہم نے یہ تمہید اس لیے باندھی ہے کہ جب بھی اردو ادب اور تہذیب سے متعلق کوئی بڑا آدمی (جن کی تعداد

اب کم سے کم ہوتی جارہی ہے) اس دنیا سے گذر جاتا ہے تو ہم اپنی بساط کے مطابق اپنے کالم کے خلا کو اُس کی یاد سے ضرور پُر کرتے ہیں لیکن اب ہمیں یہ احساس ہونے لگا ہے کہ ایسے سانحات اتنے تواتر کے ساتھ پیش آنے لگے ہیں کہ جی چاہتا ہے ہم اپنے قلم کو سیاہی میں ڈبو کر نہیں بلکہ اپنی اُنگلیوں کو خونِ دل میں ڈبو کر کالم لکھیں۔ افسوس کہ پچھلے کچھ عرصہ میں ہم نے کئی تعزیتی کالم لکھے۔ آپ یقین کریں کہ جس دن ہم یہ کالم لکھتے ہیں اُس دن اپنے ٹیلی فون کے ریسیور کو اُٹھا کر دور رکھ دیتے ہیں کہ مبادا کہیں کوئی بُری خبر نہ آجائے۔ تعزیتی کالموں کی اس بہتات پر ہمارے ایک شقی القلب دوست نے نہایت ظالمانہ بلکہ سفاکانہ تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا ''میاں ایک زمانہ تھا جب تم قلم اور دوات کی مدد سے کالم لکھا کرتے تھے لیکن اِن دنوں تم پھاوڑے اور کدال کی مدد سے کالم لکھنے لگے ہو۔ تمہارے پیشرو کالم نگار شاہد صدیقی ''کوہکن' کے قلمی نام سے کالم لکھتے تھے۔ بہتر ہے کہ تم اب اپنا قلمی نام 'گورکن' اختیار کرلو۔ یہی عالم رہا تو بخدا تمہاری باری کے وقت کوئی رونے والا نہ بچے گا''۔ ہم بھلا اس ظالمانہ تبصرے کا کیا جواب دیتے لہذا لاجواب ہوکر اپنی نظریں نیچی کرلیں۔ اور یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ پچھلے ہفتہ ڈاکٹر منان کے بارے میں لکھے گئے ہمارے کالم کی سیاہی ابھی خشک نہیں ہو پائی تھی بلکہ یہ کالم اخبار میں چھپا بھی نہیں تھا کہ 23 جولائی کو صبح میں نو بجے ممبئی سے ہمارے مزاح نگار دوست اور سابق صدر شعبہ عربی، ممبئی یونیورسٹی پروفیسر شفیع شیخ کا فون آگیا۔ کہنے لگے ''ہم سب کے میر کارواں حضرت یوسف ناظم ابھی کچھ منٹ پہلے رحلت فرما گئے''۔ ایسی روح فرسا خبر کو سننے کا دھڑکا پچھلے ایک ہفتہ سے لگا ہوا تھا جب اُنھیں اسپتال میں شریک کرایا گیا تھا۔ نمونیا کے شدید حملہ کے باعث اُن کی حالت تشویشناک ہوگئی تھی۔ دو تین دفعہ بیگم یوسف ناظم اور اُنکے فرزند خالد سے بات ہوئی تو بتایا کہ حالت تشویشناک تو ہے لیکن صحت پھر بھی قدرے بہتر ہے۔ انتقال سے ایک دن پہلے وہ اسپتال سے گھر بھی آگئے تھے لیکن ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ یوں بھی پچھلے چند مہینوں سے اُن کی صحت ٹھیک نہیں رہنے لگی تھی اور ہم وقفہ وقفہ سے فون کر کے اُن کی خیریت معلوم کرلیا کرتے تھے۔ پندرہ دن پہلے جب پتہ چلا کہ اچانک وہ چلنے پھرنے سے معذور ہوگئے ہیں۔ اور پاؤں نے کام کرنا بند کردیا ہے تو ہم نے اُنھیں فون ملایا۔ خود یوسف ناظم نے فون اُٹھایا۔ بات چیت میں وہی شوخی اور لہجہ کی وہی تیز رفتاری۔ کہنے لگے ''آپ کو کس نے بتایا کہ میری صحت خراب ہے۔ یہ افواہ ضرور کسی دشمن نے اُڑائی ہوگی۔ یہ الگ بات ہے کہ میرے پاؤں بھاری ہوگئے ہیں۔ بس چلنے پھرنے میں ذرا تکلیف ہے''۔ فون پر وہ ہمیشہ خوش دلی اور خوش مذاقی سے معمور ایسی ہی دلچسپ باتیں کیا کرتے تھے چاہے اُس وقت اُن کی طبیعت کتنی ہی خراب کیوں نہ ہو۔ یہی اُن کا نہ صرف معمول بلکہ عقیدہ اور مسلک تھا۔ ہماری اُن سے پہلی ملاقات 1956 میں سلیمان اریب کے رسالہ ''صبا'' کے دفتر میں ہوئی تھی۔ یوں اُن سے پورے 53 برس کے مراسم تھے۔ پھر 1966ء میں جب ہم نے زندہ دلانِ حیدرآباد کے زیر اہتمام اردو طنز و مزاح نگاروں کی پہلی کل ہند کانفرنس حیدرآباد میں منعقد کی تو طنز و مزاح کی ڈور میں کچھ اس طرح بندھ گئے کہ اس ڈور کی لمبائی کو حیدرآباد سے ممبئی، دہلی، پٹنہ، چندی گڑھ، بھوپال، اورنگ آباد جیسے شہروں کے علاوہ پاکستان اور مسقط تک لے گئے اور ان میں سے بعض جگہوں پر تو ایک دو بار نہیں بیسیوں بار گئے۔ ممبئی جاتے تو ہم اُن ہی کے

ہاں ٹھہرتے تھے۔ ممبئی کی کئی جلیل القدر ادبی ہستیوں سے ہماری ملاقات یوسف ناظم کی معرفت ہی ہوئی۔ کن کن کے نام گنائیں سب کے سب ممبئی کی ادبی، تہذیبی اور فلمی زندگی کے روشن مینار تھے۔ ہائے کیا لوگ تھے اور کیسے لوگ تھے وہ جنھیں ہم نے نہ صرف اپنی آنکھوں سے دیکھا بلکہ اُن کی صحبتوں سے فیض یاب بھی ہوئے۔ افسوس کہ چالیس پچاس برس کے عرصہ میں دیکھتے ہی دیکھتے یہ ہستیاں داغ مفارقت دے گئیں۔ یوسف ناظم ہی اس ممبئی کی آخری نشانی رہ گئے تھے اور یوں ممبئی اب ہمارے لیے بالکل ہی اُجڑ گئی۔

دنیا کی بڑی سے بڑی زبان میں بھی معیاری طنز و مزاح لکھنے والوں کی تعداد اتنی ہی ہوتی ہے جتنی کہ ایک ہاتھ میں اُنگلیوں کی ہوتی ہے۔ طنز و مزاح لکھنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ یوسف ناظم جامعہ عثمانیہ کے سپوت تھے اور جامعہ عثمانیہ نے جس اردو معاشرہ کو سابق ریاست حیدر آباد میں پروان چڑھایا تھا اُس کا نقطۂ عروج بھی تھے۔ یوسف ناظم نے اُس اورنگ آباد میں انٹر میڈیٹ کی تعلیم حاصل کی تھی جہاں کبھی مولوی عبدالحق بعد میں ''بابائے اردو'' بنے اور یوسف ناظم ''بابائے ظرافت'' بن گئے۔ یوسف ناظم نے لگ بھگ ستر برس پہلے جس رفتار سے لکھنا شروع کیا تھا اُسی رفتار، گفتار اور وقار کے ساتھ آخر وقت تک لکھتے رہے۔ اُن میں لکھنے کا بڑا زبردست Stamina اور ملکہ تھا۔ پھر اُن کی تحریریں بھی ہمہ جہت اور مختلف النوع ہوتی تھیں۔ انشائیے لکھ رہے ہیں، خاکے لکھ رہے ہیں، سفر نامے لکھ رہے ہیں، تنقید لکھ رہے ہیں، تبصرے لکھ رہے ہیں، ضرورت شعری کے تحت نظمیں لکھ رہے ہیں، اخباری کالم لکھ رہے ہیں، دوستوں کو خط لکھ رہے ہیں اور نہ جانے کیا کیا لکھ رہے ہیں۔ اُنھوں نے اردو کے طنزیہ مزاحیہ ادب کے دامن کو اپنی بے مثال باغ و بہار تحریروں کے ذریعہ مالا مال کیا۔ اردو ادب کی تاریخ میں کسی دوسرے مزاح نگار نے اتنے لمبے عرصہ تک ایسی آن بان اور اپنی ایک الگ پہچان کے ساتھ مزاح نگاری نہیں کی ہوگی۔ بیشتر مزاح نگار عموماً لمبی ریس کے گھوڑے نہیں ہوتے۔ عمر میں اضافہ کے ساتھ ساتھ اُن کی فطری شوخی، جولانی، خوش دلی، بذلہ سنجی اور شگفتگی کم ہوتی جاتی ہے لیکن یوسف ناظم کا معاملہ بالکل برعکس تھا۔ جوں جوں اُن کی عمر بڑھتی گئی اُن کا قلم اتنا ہی شوخ و شنگ، چلبلا، تیز طرار، برجستہ، بے ساختہ، کھلنڈرا اور بے تکلف ہوتا چلا گیا۔ ہمارا ذاتی خیال ہے کہ ہندوستان میں یوسف ناظم کے بعد یا اُن کے ساتھ ساتھ جو مزاح نگار اردو ادب میں پیدا ہوئے ہیں، اُن سب نے مل کر (بشمول ہمارے) اتنی طنزیہ و مزاحیہ تحریریں نہیں لکھی ہوں گی جتنی کہ اکیلے یوسف ناظم نے لکھی ہیں۔ غالباً اتنا کچھ لکھنے کا ہی نتیجہ تھا کہ اُن کے طنز میں ایک طرح کی قلندرانہ شان اور مزاح میں ایک صوفیانہ آن بان کی جھلک صاف دکھائی دیتی تھی۔ وہ ایک سچے، بے نیاز اور بے لوث انسان اور ادیب بھی تھے۔ اگر چہ وہ حکومت مہاراشٹرا کے محکمہ لیبر کے ڈپٹی کمشنر رہے جہاں مزدوروں کے مفادات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے اور کوشش یہ کی جاتی ہے کہ مزدوروں کو اِن کی محنت کا معقول معاوضہ بھی ملے۔ یوسف ناظم نے شخصی طور پر کبھی یہ نہیں سوچا کہ پچھلی سات دہائیوں سے وہ خود اردو ادب کی یہ جو بے مثال خدمت انجام دے رہے ہیں اُس کا اُنھیں کیا صلا ملا۔ پچھلے مہینہ دہلی کے چند ادب دوستوں کی ایک محفل میں جب ہم نے یہ نکتہ اُٹھایا اور کہا کہ بیشک یوسف ناظم کو بہت سے ایسے ایوارڈ ضرور ملے جو خلوص، محبت اور ایمانداری کے ساتھ دیے جاتے ہیں لیکن بعض ایسے قومی

ایوارڈ انھیں نہیں ملے جن کے وہ حقدار ہو سکتے تھے جیسے ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ اور مخدوم محی الدین ایوارڈ وغیرہ۔اس پر ہمارے دوست کے ایل نارنگ ساقی نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا ''مجنوں کو لیلیٰ سے جو والہانہ محبت تھی اُس کے بارے میں بخوبی جانتے ہو۔اردو سے یوسف ناظم کی محبت بھی ویسی ہی ہے جیسی کہ مجنوں کو لیلیٰ سے تھی۔اب اگر مجنوں نے لیلیٰ سے پوچھے بغیر یا کسی کو بتائے بغیر صحرا کی خاک چھاننا اور اپنے کپڑوں کو تار تار کرنا شروع کر دیا تو کون کیا کر سکتا ہے۔پھر مجھے یہ بتاؤ کہ کیا کبھی مجنوں نے اپنی اس صحرا نوردی اور چاک دامانی کے عوض اپنے لئے کبھی ساہتیہ اکاڈیمی ایوارڈ، مخدوم ایوارڈ یا کسی اور انعام کا مطالبہ کیا یا صلہ کی تمنا کی؟''۔ساقی کے اس معقول استدلال کے جواب میں ہم نے صرف اتنا کہا ''میاں ساقی ہوسکتا ہے یوسف ناظم تمہاری منطق سے متفق ہو جائیں مگر میں متفق نہیں ہوسکتا بلکہ سچ پوچھو تو آج کے حالات میں اگر مجنوں بھی زندہ ہوتا تو وہ بھی تمہارے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا۔یہ کیا بات ہوئی کہ اتنی صحرا نوردی اور اتنی ساری چاک دامانی کا کسی مجنوں یا کسی یوسف ناظم کو کوئی صلہ یا معاوضہ نہ ملے۔اردو ادب سے یوسف ناظم کا جو سروکار تھا وہ نہ صرف حیرتناک تھا بلکہ ناقابل تقلید بھی تھا۔وہ چوبیسوں گھنٹوں کے ادیب تھے۔اپنی تحریر میں، اپنی تقریر میں، اپنی تدبیر میں اور اپنی تقدیر میں۔ہمارا دعویٰ ہے کہ یوسف ناظم کے اُٹھ جانے سے اردو طنز و مزاح کے ادب میں جو خلا پیدا ہوا ہے وہ کبھی پر نہیں ہوگا۔ذرا پر کر کے تو دیکھئے۔ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔خدائے سخن میر تقی میر نے یوسف ناظم جیسے ہی فنکار کے بارے میں کہا تھا

باتیں ہماری یاد رہیں، پھر باتیں ایسی نہ سنیئے گا
پڑھتے کسی کو سنیئے گا تو دیر تلک سر دھنیئے گا

☆

پروفیسر صغرا مہدی

یوسف ناظم کی یاد میں

کہانی ہے تو اتنی ہے فریب خواب ہستی کی
کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہوجائے

صغرا مہدی

یوسف ناظم نے اس دنیا سے کوچ کیا۔وہ ایک عرصے سے اس سفر کے لئے تیار بیٹھے تھے اور طرح طرح کی تکلیفیں جھیل رہے تھے مگر خوش دلی سے، مستقل مزاجی سے۔اسی انتظار میں انہوں نے اردو ادب کو تین کتابیں دے دیں۔''ایک کتاب اور''، ''جاتے جاتے'' اور تازہ کتاب ''ایک چکمہ اور''۔یوسف ناظم نہ اپنے دائمی سفر کا

ذکر کرتے۔ نہ اپنی بیماریوں کا۔ دوسروں کی بیماریوں کا ذکر سننا بھی انھیں اچھا نہیں لگتا تھا۔

دوسرے تیسرے ہفتہ فون آجاتا، ''ارے بھئی کہاں ہیں آپ؟'' ہم شروع ہوجاتے اپنی بیماریوں سے انھیں مطلع کرنے کے ارادے سے مگر وہ فوراً بات کاٹ دیتے، ''ارے کہاں آپ تو بالکل ٹھیک ہیں، خوب لکھ رہی ہیں، صدارتیں کررہی ہیں، ہمارے شاہد علی خاں کیسے ہیں؟'' اور پھر ادبی حالات پر تبصرہ شروع ہوجاتا اور پھر وہ فون اپنی شریک حیات عائشہ کو پکڑا دیتے۔ پہلے وہ بہت اچھے پیڈ پر لمبے لمبے خط لکھا کرتے تھے۔ پھر پوسٹ کارڈ اور ادھر دو ایک سال سے ہم ایک دوسرے سے فون کے ذریعے گفتگو کیا کرتے تھے۔ یوسف ناظم کے اٹھ جانے سے ایک سیدھا سچا انسان دنیا سے اٹھ گیا۔ ایسے لوگوں کی دنیا میں ہمیشہ کمی رہی ہے مگر فی زمانہ تو قحط ہے۔ اس دور کو ''قحطِ نیک نفساں'' سے موسوم کیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ہمارے معاشرے میں خاص طور سے اردو والوں میں تہذیب سے گری باتوں، سازشوں اور ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے اس سے وہ بہت مضطرب رہتے۔ ہمیں ان کے اس صورت حال پر اس قدر مغموم ہونے پر بہت حیرت ہوتی۔ ان کی جب طبیعت بہت مکدر ہوتی تو ہمیں فون کر کے کہتے، ''دیکھئے یہ کیا ہورہا ہے؟ آپ نے فلاں مضمون پڑھا، فلاں رسالہ آپ کے پاس آیا؟ کیا طوفان پر بدتمیزی ہے!'' جب ہم نہایت تلخ انداز میں صورت حال پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے تو انھیں وہ بھی اچھا نہیں لگتا۔ جلدی سے کہتے، ''اچھا اچھا چھوڑیے، یہ بتایئے آج کل کیا لکھ رہی ہیں۔ بھائی کیسے ہیں مہدی صاحب، واہ کیا کہانیاں لکھتے ہیں!... اور چھوٹے بھائی جنھوں نے ہماری نہاری کی دعوت کی تھی... عائشہ لو صغرا مہدی...'' اور فون عائشہ کے ہاتھ میں چلا جاتا جو نہایت نرم آواز میں پر محبت گفتگو شروع کردیتیں اور ہم بھی شانت ہوجاتے۔

ایک دن فون آیا، ''بھئی کیا کررہی ہیں آپ اردو کے ان 'دو بزوں' کے درمیان جو معرکہ ہو رہا ہے اس کا کوئی تدارک ہونا چاہیے۔ بہت تکلیف ہوتی ہے!''

''آپ بھی کمال کرتے ہیں...''

''دیکھئے...''، وہ جلدی سے بولے، ''لوگ کہہ رہے ہیں اس کو ختم کرنے کوشش ہونی چاہیے... اور اس کی پہل میں کروں آپ کا کیا مشورہ ہے؟''

''بالکل نہیں! ہرگز نہیں! یہ معاملات پیروں سے زیادہ مریدوں کے ہیں!'' وہ فوراً مان گئے۔

حیرت ہوتی ہے ان جیسا قابل، ذہین اور مجھ سے کہیں زیادہ سینئر، میرے مشوروں کو اس قدر اہمیت دیتا تھا، شاید اس لیے کہ میں خود اس زمانے کی پیداوار ہوں اور ان معاملات کو سمجھتی ہوں بلکہ اس کا حصہ ہوں اور ان جیسا نیک سرشت انسان (ان معاملات کو) کیا سمجھ پاتا... وہ تو معاصرانہ چشمک بھی کسی سے نہیں رکھتے تھے! وہ اپنے معاصروں کی ریشہ دوانیوں، سازشوں اور چالاکیوں کو اول تو سمجھتے ہی نہیں تھے، اور اگر سمجھتے بھی تو جان کر انجان بنے رہتے۔ اگر اس طرف ان کی توجہ دلائی جاتی تو کہتے، ''ارے نہیں چھوڑیے!'' یہی وجہ ہے کہ چاہے اعزازات اور انعامات میں ان کا پلّہ بھاری نہ ہو مگر اردو والوں نے یوسف ناظم کے فن کو بھی سراہا اور ان کی شخصیت

کا بھی احترام کیا۔ وہ بڑے وقار اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ نہایت خوش وخرم زندگی گزار گئے اور انھوں نے اپنی انفرادیت باقی رکھی۔ انہوں نے کبھی زمانے کی ناقدری کا شکوہ بھی نہیں کیا۔ ان پر جتنے نمبر نکلتے اور ان کے لیے جو جلسے ہوتے ان کا ذکر بھی وہ شرما شرما کر کرتے۔

ویسے تو وہ شاعر بھی تھے اور سنجیدہ ادب پر بھی ان کی گہری نظر تھی مگر طنز ومزاح کے میدان میں انھوں نے اپنا ایک الگ مقام بنالیا تھا۔ اور اس پر اپنی چھاپ چھوڑ گئے۔ ان کے طنز ومزاح کی خوبی یہ ہے وہ خود اپنی ذات کو بھی طنز ومزاح کا نشانہ بناتے ہیں بجائے اپنے قصیدے پڑھنے اور اپنے منہ میاں مٹھو بن کر دوسروں کو اپنے طنز ومزاح کا نشانہ بنانے کے۔ یوسف ناظم کے مزاح کی یہ بھی انفرادیت ہے کہ وہ عام مزاح نگاروں کی طرح خواتین خاص طور سے اپنی شریک حیات کو اس طرح طنز ومزاح کا نشانہ نہیں بناتے ہیں جس میں استہزاء کا پہلو نمایاں ہو۔ بقول شخصے ان کا مزاح ''مہذب قہقہے'' کا محرک ہوتا ہے۔ ان کے طنز ومزاح میں ابتذال نہیں ہوتا ہے۔

یوسف ناظم کی جن خصوصیات سے خاکسار بہت متاثر تھی ان خوبیوں کا معترف ایک زمانہ ہے۔ دہلی سے نکلنے والے روزنامہ کے ایڈیٹوریل کا عنوان ہے ''مہذب قہقہہ خاموش ہوگیا، اس میں یوسف ناظم کو ان الفاظ میں یاد کیا گیا ہے'' اپنی ادبی صلاحیتوں کا لوہا منوانے کے سلسلے میں بھی انھیں تگ ودو کرتے نہیں پایا گیا۔ انھوں نے کبھی یہ کوشش نہیں کی کہ کوئی رسالہ ان پر خاص نمبر نکالے، کوئی رسالہ ان پر خصوصی گوشہ شائع کرے۔ حالانکہ وہ اس کے پوری طرح مستحق تھے۔ جس نے ان کا تذکرہ کیا اس نے بھی بھلا کیا اور جس نے نہیں کیا اس نے بھی بھلا کیا۔ نہ کسی سے شکوہ نہ کسی سے شکایت۔ ان کو شاید غیب کا علم ہوگیا تھا کہ ان کا کام صرف قلم رانی ہے اور یہ قلم رانی ہی ان کے بعد ان کی عظمت کا فیصلہ کرے گی۔ وہ آخری سانس تک یہی کرتے رہے۔ اسی خاموش خدمت کا نتیجہ ہے، اور شاید ہی کوئی اس امر سے اختلاف کر سکے، کہ ان کا نام اردو طنز ومزاح کی تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو چکا ہے۔''

یوسف ناظم نے طویل عمر پائی۔ ان کی ادبی خدمات وتصنیف وتالیف پینسٹھ سال پر محیط ہیں۔ جہاں تک اردو زبان کی خدمت وحمایت کا سوال ہے اس میں یوسف ناظم ہمیشہ آگے آگے رہے۔ وہ بمبئی کی ادبی محفلوں کی رونق تھے۔ جب مہاراشٹر اردو اکیڈمی کے سکریٹری ہوئے تو انھوں نے اس کے تحت بہت اہم کام کیے۔ یادگار سمینار کیے۔ ان کو مکتبہ جامعہ سے خاص لگاؤ تھا۔ جب اب سے دو سال پہلے اس پر خدائی دقت پڑا تو یوسف ناظم بہت مضطرب تھے اور انھوں نے اس کی بمبئی کی شاخ بند نہ کی جائے اس مہم میں نمایاں رول ادا کیا۔ اردو کے متعلق جس ادارے سے وہ متعلق ہوئے انھوں نے سیاست سے پرے رہ کر اس میں حصہ لیا۔

یوسف ناظم نے ہر میدان میں ایمانداری اور بھلمنساہت سے اپنا رول ادا کیا۔ اور خدا کے حضور سرخرو گئے حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کو ادا کرتے رہے۔ انسانی زندگی کا حاصل تو یہی ہے۔ جانا تو سبھی کو ہے۔ ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو۔

☆

اسد رضا

طنز و مزاح کا تھا جو یوسف چلا گیا

زندگی کی 91ویں بہاریں دیکھ کر معروف و مقبول طنز و مزاح نگار اور مستند شاعر یوسف ناظم صاحب موت کی خزاں میں گم ہو گئے لیکن ان کی نگارشات ہمیشہ اردو قارئین کے دل و دماغ کو معطر کرتی رہیں گی۔ جالنہ (مہاراشٹر) کے ایک سادات خاندان میں پیدا ہونے والے سید محمد یوسف نے لڑکپن اور جوانی میں ناظم تخلص رکھ کر شاعری بھی کی اور عاشقی بھی، لیکن عزت سادات، کبھی نہیں گنوائی۔ درمیانہ قد، سر پر کم لیکن سفید بالوں، چوڑی پیشانی، ہلکی نیلی آنکھوں، مسکراتے ہوئے لبوں اور نہایت نرم مزاج کے حامل یوسف ناظم اگر چہ ظاہری صورت کے لحاظ سے تو یوسف ثانی نہیں تھے لیکن سیرت کے اعتبار سے وہ یقیناً یوسف ہی تھے۔ طنز و مزاح نگار ہونے کے باوجود انہوں نے باقر مہدی کے استثنیٰ کے کسی کی سخت تنقید بھی نہیں کی۔ تاہم ان کی تنقید سے بھی محبت و خلوص کا اظہار ہوتا تھا۔ اسکول میں حصول تعلیم کے دوران ہی یوسف صاحب نے شعر کہنا شروع کر دیا تھا، مشاعروں میں بھی کلام پیش کیا کرتے تھے۔ 1944 سے مرحوم نثر نگاری کی جانب راغب ہوئے اور اپنے طنزیہ و مزاحیہ مضامین سے اردو دنیا میں دھوم مچانے لگے۔ اردو طنز و مزاح کی تاریخ میں سب سے زیادہ مدت تک شائع ہونے کا ریکارڈ بنانے اور پھر خود ہی اسے توڑنے والے ماہ نامہ ''شگوفہ'' حیدرآباد میں بھی نہ صرف یوسف ناظم کے بے شمار مضامین شائع ہوئے بلکہ اس جریدے کے مدیر ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال نے یوسف ناظم نمبر بھی شائع کیا جسے ادبی حلقوں میں کافی پسند کیا گیا۔ ناظم صاحب کے مضامین ہندو پاک کے تقریباً تمام جرائد میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ انہوں نے ''اتواریہ'' کے نام سے بھی ممبئی کے ایک مشہور روزنامہ میں کالم لکھا۔ انتقال سے پہلے تک بھی وہ دہلی کے ایک روزنامہ میں ہفتہ وار کالم لکھتے رہے۔ روشن خیال یوسف ناظم کی 21 کتابیں منظر عام پر آئیں جن میں سے 5 کتابیں انہوں نے بچوں کے لیے لکھی تھیں جب کہ دو کتابیں منظوم تراجم پر مشتمل ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری اور مضامین سے روشن خیالی، وسیع القلبی اور محبت کا پرچار کیا۔

ان کی روشن خیالیوں کے سبب
ہر طرف روشنی کا موسم تھا

یوسف ناظم سے پہلے میری ملاقات ان کے دلچسپ و پُر مغز مضامین سے ہوئی تھی۔ اگر چہ وہ طنز و مزاح نگار تھے لیکن ان کی زبان عالمانہ تھی۔ فارسی کے اشعار اور ضرب المثل ان کے مضامین میں مصری کی ڈلیوں کی طرح آتے اور ذہن و دل میں شیرینی گھول جاتے۔ کبھی کبھی اور کہیں کہیں تو یوسف صاحب کی علمیت ان کے طنز و مزاح پر بھی حاوی ہو جاتی اور آخر کیوں نہ ہوتی، انہوں نے اس دور یعنی 1944 میں ایم اے کیا تھا جب ہندوستان میں

درجہ 3 فیل داروغہ، آٹھویں پاس ٹیچر اور دسویں پاس گزیٹڈ آفیسر بن جایا کرتے تھے۔ اپنی اسی علمیت اور قابلیت کی بدولت وہ محکمۂ محنت میں افسر بن گئے اور ڈپٹی لیبر کمشنر جیسے اہم عہدہ سے سبکدوش ہوئے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ سرکاری افسر ہونے کے باوجود وہ طنز و مزاح لکھتے رہے اور بیباکی و بے خوفی سے لکھتے رہے۔ یہ شاید ہندوستان جمہوریت نشان کی اعلیٰ جمہوری اقدار کا ہی نتیجہ تھا کہ ان کے طنزیوں پر کوئی مقدمہ نہیں چلا اور انہیں کسی طنزیہ پر سرکاری ملازمت سے معطل نہیں کیا گیا جب کہ پاکستان فوج نشان میں کئی طنز و مزاح نگار اپنی سرکاری ملازمت سے ہاتھ دھو چکے ہیں۔ وہاں سرکاری ملازم طنز نگار ''پکڑے جاتے ہیں خود اپنے ہی لکھے پر ناحق'' کے مصداق کبھی کبھی ملازمت سے ہی برطرف کر دیے جاتے ہیں۔ دور کیوں جایئے مستند و مقبول طنزیہ شاعر مرحوم دلاور فگار کراچی ڈیولپمنٹ اتھارٹی میں ملازم تھے، لیکن طنز و مزاح کی وجہ سے انہیں حکومت نے ملازمت سے محروم کر دیا تھا۔

یوسف صاحب سے دوسری ملاقات ٹیلی فون پر ہوئی تھی۔ میں نے ان سے طنز و مزاح کی اپنی پہلی کتاب ''شوخیِ قلم'' پر تبصرہ لکھنے کی درخواست کی تو مرحوم بخوشی اس کام کے لیے آمادہ ہو گئے اور ایک ہفتے بعد ان کا عنایت نامہ مع تبصرہ کے موصول ہوا۔ مرحوم یوسف کا یہ تبصرہ میرے لیے دراصل ایک انتہائی اہم تحریر ہے جسے میں آج بھی احتیاط سے محفوظ رکھے ہوئے ہوں۔ موصوف کی تحریر پکی تھی جسے پڑھنے میں ہم جیسے کچے لوگوں کو کبھی کبھی دقت بھی ہوتی تھی، لیکن جب پڑھ لیتے تھے تو بے انتہا مسرت بھی ہوتی تھی۔ بعد ازاں میری خواہش پر انہوں نے سہارا انڈیا پریوار کے اردو جراید کے لیے اپنے طنزیہ و مزاحیہ بھی بھجوائے جنہیں قارئین کرام نے کافی پسند کیا۔ یوسف ناظم سے میری تیسری اور آخری ملاقات ان کے باندرہ ممبئی میں واقع دولت کدہ پر ہوئی، ان دنوں میں روز نامہ راشٹریہ سہارا کے ممبئی ایڈیشن کا ایڈیٹوریل انچارج تھا وہ نہایت خندہ پیشانی سے پیش آئے اور اخبار کی کامیابی کے لیے دعاؤں کے ساتھ ساتھ اپنی دلچسپ اور طنز و مزاح سے آراستہ باتوں سے نوازا۔ یوسف مرحوم طنز و مزاح نگار ہونے کے باوجود نہایت شائستہ انداز میں گفتگو کرتے تھے لیکن درمیان میں شگفتگی کی پھلجھڑیاں بھی چھوڑتے جاتے تھے۔ اگرچہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اعلیٰ عہدہ [ڈپٹی لیبر کمشنر] پر فائز تھے اور مہاراشٹر اردو اکیڈمی کے جنرل سکریٹری بھی رہ چکے تھے، لیکن ان میں غرور و تکبر نام کو نہیں تھا۔ ہر چھوٹے بڑے سے وہ انکساری و محبت سے ملتے تھے۔

اگرچہ یوسف ناظم ایک اچھے شاعر بھی تھے اور انہوں نے منظوم تراجم بھی کیے، لیکن بات چیت میں وہ اشعار کا کم ہی استعمال کرتے تھے۔ اسی طرح ان کے طنزیوں اور مزاحیوں میں اشعار کا استعمال بہت کم ہے، البتہ بریکٹ کا استعمال فراخ دلی سے ہے۔ لہٰذا اردو دنیا میں مرحوم بریکٹ والے طنز و مزاح نگار کے نام سے مشہور تھے۔ مشتاق احمد یوسفی کے برعکس مرحوم یوسف ناظم نے اشعار کی پیروڈی بھی نہیں کی۔ لیکن شاعر ہونے کی وجہ سے ان کی تحریروں کے جملوں میں الفاظ کی نشست و برخاست اشعار کی طرح ہی پرکشش ہوتی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ طنز نگار یوسف ناظم نے شاعر یوسف ناظم کو دبا کر رکھا تھا لیکن میں یہ سوچ کر حیران ہوں کہ اچھے خاصے شاعر نثری طنز و مزاح کی جانب کیوں راغب ہوتے ہیں؟ یہ معاملہ صرف یوسف ناظم مرحوم کا ہی نہیں ہے بلکہ ماضی میں شوکت تھانوی، فکر تونسوی، مشفق خواجہ، ابن انشا اور حال میں مختار ٹونکی، نصرت ظہیر اور راقم الحروف شاعری کرنے

کے بعد ہی نثری طنز و مزاح کے میدان میں آئے۔

ہم بچپن سے سنتے آئے ہیں کہ ''بگڑا شاعر مرثیہ گو'' لیکن نوجوانی تک آتے آتے ہمیں یہ سوال کاٹنے لگا کہ شاعر تو بہت بگڑے لیکن وہ مرثیہ گو نہیں بنے، کیونکہ مرثیہ گو شعرا کی تعداد بہت کم ہوگئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اتنے سارے بگڑے ہوئے شاعر کہاں گئے۔ بعد تحقیق ازاں یہ راز سربستہ کھلا کہ کچھ شاعر طنز و مزاح نگار بن گئے اور اس میدان میں انہوں نے خوب نام اور دام کمائے۔ شاید اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ معاشرہ کی ناہمواریوں، فرد کی مضحکہ خیز صورت حال اور برائیوں کی حقیقت پسندانہ عکاسی کرنے میں شاعری کا دامن تنگ اور نثر کا بہت وسیع ہے۔ تاہم شاعری سے نثری طنز و مزاح کے میدان میں آنے والوں کے مضامین دوآتشہ ہوجاتے ہیں یعنی ان میں شعر کا حسن بھی ہوتا ہے اور نثر کی وسعت و گہرائی بھی۔ لہٰذا مرحوم یوسف ناظم کی بطور طنز و مزاح نگار کامیابی کا ایک سبب یہ بھی رہا ہے کہ وہ شاعر تھے، لیکن مرحوم نہ صرف شاعری اور طنز و مزاح نگاری کے میدان میں کامیاب تھے بلکہ اپنی گھریلو زندگی میں بھی کامیاب رہے۔ ماشاء اللہ ان کی اولادیں بھی تعلیم و روزگار کے لحاظ سے کامیاب ہیں۔ یوسف صاحب کو مرتے دم تک اپنی اہلیہ اور اہل خاندان کی محبت و قربت حاصل رہی۔ انتقال سے کچھ روز پہلے تک وہ مضامین اور کالم لکھتے رہے۔ اگرچہ یوسف ناظم مرحوم نے اب طنز و مزاح لکھنا کم کردیا تھا اور وہ حالات حاضرہ پر کالم زیادہ لکھ رہے تھے لیکن ان کالموں میں بھی کہیں کہیں طنز کے خار اور مزاح کی کلیاں نظر آجاتی تھیں۔

یوسف ناظم کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ حقیقت پسند تھے اور روایتی ادیبوں کی طرح یہ نہیں کہتے تھے کہ انہوں نے اردو دنیا کو بہت کچھ دیا لیکن اردو معاشرہ نے انہیں کچھ نہیں دیا۔ یہ صحیح ہے کہ انہیں اتنا نہیں ملا جتنے کے وہ مستحق تھے، لیکن اس سچائی کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ انہیں طنز و مزاح کی بڑی بڑی محفلوں میں احترام کے ساتھ مدعو کیا جاتا تھا۔ اردو دنیا نے انہیں انعامات و اعزازات سے بھی نوازا۔ انھیں گیان پیٹھ، اقبال سمان اور ساہتیہ اکادمی جیسے ایوارڈ نہیں دیے گئے اور شاید اس لیے نہیں دیے گئے کہ ادب کے چند ٹھیکیداروں کی نظر میں طنز و مزاح نگار اس لائق نہیں ہیں کہ انہیں کوئی بہت بڑا ایوارڈ دیا جائے۔ سرکار نے بھی انہیں کسی پدم اعزاز سے نہیں نوازا۔ علاوہ ازیں بڑے ادبی ایوارڈ اور سمان اکثر انہیں ادیبوں کو زیادہ ملتے ہیں جو ادب پر کم اور جوڑ توڑ پر زیادہ توجہ دیتے ہیں لیکن اس طرح دوڑ دھوپ کرکے جنہیں بہت بڑے بڑے ایوارڈ ملتے ہیں انھیں میڈیا میں کوریج بھلے ہی اچھا مل جائے لیکن تاریخ ادب میں بہت اچھا مقام نہیں ملتا۔ اس لحاظ سے بلاشبہ یوسف ناظم ناکام رہے کیونکہ انہوں نے ادب پر ہی توجہ دی جوڑ توڑ پر نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ جہاں شعر و ادب کے کھلاڑی تھے وہیں جوڑ توڑ میں اناڑی تھے۔ لہٰذا گیان پیٹھ ایوارڈ، اقبال سمان اور ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ نہ ملنے کے باوجود یوسف ناظم مرحوم اردو زبان کی تاریخ طنز و مزاح میں ہمیشہ زندہ رہیں گے اور ان کے مضامین مستقبل میں بھی قارئین کو تبسم زیر لب اور شگفتگی سے نوازتے رہیں گے۔ دراصل یوسف ناظم نے دیر تک اور دور تک لکھا اور خوب لکھا۔ تقریباً 65 سال قبل یعنی 1944 میں انہوں نے ڈاکٹر محی الدین زور کا قلمی خاکہ لکھا تھا اور تب سے وہ مسلسل لکھتے رہے۔ متعدد شعراء و ادباء کی اتنی لمبی عمر بھی نہیں ہوتی جتنی ناظم مرحوم کی تخلیقات کی عمر ہے۔ وہ 91 سال تک ہنستے اور ہنساتے رہے، یہاں تک کہ موت کو

بھی انہوں نے ہنس کر ہی گلے لگایا۔ شاید یوسف ناظم سے مل کر موت بھی ایک بار ضرور ہنسی ہوگی۔ لیکن زندگی بھر دنیا میں ہنسی اور خوشی تقسیم کرنے والا اردو کا یہ مستند طنز و مزاح نگار اپنے چاہنے والوں اور اعزا کو رلا کر چلا گیا۔ پتہ نہیں کیوں یوسف ناظم صاحب کے انتقال پُر ملال کی خبر سن کر یہ قطعہ دل و دماغ کی گہرائیوں سے نکل کر زبان پر آ گیا۔

تحریر سے وہ اپنی ہنسا کر چلے گئے
اشعار زندگی کے سنا کر چلے گئے
یوسفؔ تھے شاعری کے تو ناظم تھے طنز کے
افسوس وہ سبھی کو رُلا کر چلے گئے

☆

اطہر عزیز

رخصت ہوا وہ ناظمِ طنز و مزاح بھی

اب کوئی پوچھے تو کیسے شرح حالات کریں
دل ٹھہرے تو درد کہیں، درد تھمے تو بات کریں

فیض کا یہ شعر ہم برسوں سے سنتے آرہے تھے مگر ہماری محفل سے یوسف ناظم صاحب کے اٹھ جانے سے اس شعر کی کیفیت میں کچھ عجیب سی شدت پیدا ہوگئی ہے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ یوسف ناظم کی گفتگو کو ہم نے دائرۂ صوت و صدا میں محفوظ کرلیا ہے۔ مارچ ۲۰۰۷ء میں معرف مزاح نگار نصرت ظہیر (مدیر ادب ساز دلی) ممبئی یونیورسٹی کے ایک سیمینار میں شرکت کے لیے شہر آئے ہوئے تھے۔ موقع غنیمت جان کر ایک صبح ہم لوگ ناظم صاحب کی رہائش گاہ 'الہلال' باندرہ میں جا دھمکے۔ اس سے پہلے کہ 'علیک سلیک' کی تمہید بندھتی، ہم لوگوں نے انہیں حصارِ 'کیف وکم' میں باندھنا شروع کر دیا۔ وہ اس 'فی البدیہہ' مکالمے کے لیے 'فی الحقیقت' تیار نہ تھے...... مگر 'اب آگئے ہو تو آؤ تمہیں بحال کریں' کے تحت وہ اس غیر رسمی (بلکہ انہیں کے الفاظ میں غیر ضروری) بات چیت کیلئے ہمہ تن و ہمہ دہن گوش بر آواز ہو گئے اور پھر 'دامنِ یوسف' تہہ در تہہ یوں کھلتا گیا:

اطہر عزیز : ناظم صاحب! ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دیتے ہوئے ہمیں یہ بتائیے کہ آپ نے کب، کیسے اور کن حالات میں لکھنا شروع کیا؟

یوسف ناظم : بھئی کمال کرتے ہیں! اب تو ہم سے یہ پوچھا جارہا ہے کہ کب لکھنا بند کر رہے ہیں اور آپ پوچھ رہیں کہ کب لکھنا شروع کیا۔ سیدھی بات یہ ہے کہ ہم نے نہ کبھی لکھنے کا منصوبہ بنایا، نہ کسی منصب کیلئے لکھا۔ ۱۹۴۴ء میں ایم۔اے کرنے کے بعد حیدرآباد کے محکمۂ لیبر میں داخل تو ہوئے بحیثیتِ مترجم...... مگر باہر نکلے تو مصنف کا طوق گردن پر۔ اور مزاح کے تیر دامن میں۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے یعنی آگے کہیں گے دم لے کر۔ جو عمر لوگوں کی

دوڑنے بھاگنے کی ہوتی ہے وہ ہم نے ہنسنے ہنسانے میں کھپادی۔ ۱۹۳۸ء میں جب ہم بمشکل اُنیس بیس سال کے ہوں گے کہ باغیانہ رنگ چڑھ آیا۔ دوسری جنگِ عظیم کا دور تھا۔ مطیع وفرماں بردار لوگوں کا زمانہ۔ بس پھر کیا تھا۔ شعر وارد ہو گیا:

ہم کو نویدِ فتح نہیں، جنگ چاہیے دامانِ ہند خون سے گل رنگ چاہیے

نصرت ظہیر : یعنی یہ شعر آپ پر ۱۹۳۸ء میں وارد ہوا۔ اب یہ بتائیں کہ آپ جہانِ رنگ و بو میں کب مورود ہوئے؟

یوسف ناظم : طبعی اعتبار سے ۷رنومبر ۱۹۱۸ء اور طباعتی رُو سے ۱۹۲۱ء...... یعنی میں اپنی عمر سے تین سال بڑا ہوں۔ شروع شروع میں طبیعت شعر گوئی کی طرف مائل رہی۔ مخدوم محی الدین اُن دنوں آسمانِ شعروادب پر سوار تھے، ہم زمینِ شعر سجائے انہیں زمین سے جڑے ہوئے شعر سناتے تھے۔ ترقی پسند ادیبوں کے ساتھ چلے تو بہت دور تک مگر ان کی اداؤں کو اپنانے سے برسوں کتراتے رہے۔ سرکاری ملازم جو ٹھہرے۔ لوگ باگ تاک میں رہتے کہ کہیں یہ کیمونسٹ پارٹی سے تو نہیں جڑ گیا۔ اورنگ آباد سے انٹر کرنے کے بعد جامعہ عثمانیہ آ گئے۔ ان دنوں جامعہ عثمانیہ کی نئی بلڈنگ کا افتتاح ہونے جارہا تھا۔ حضور نظام خود تشریف لائے تھے۔ سونے کی کنجی، چاندی کا تالا۔ بڑا رعب دار افتتاح تھا۔ بعد میں وہ تالا کنجی ساتھ میں لے گئے۔ ہم بھی شریک تھے۔

اطہر عزیز : یعنی مال اڑا لے جانے میں؟

یوسف ناظم : (قہقہہ) ارے نہیں بھئی۔ اس افتتاحی تقریب میں ہم شریک تھے۔ اس زمانے میں کالج میں ایک تقریری مقابلہ ہوا تھا۔ ہم اس وقت فرسٹ ائیر میں تھے مگر سیکنڈ ائیر کے طالب علم کو مقابلے میں ہم نے مات دے دی۔ محبوب حسین جگر ہمارے میزبان تھے۔ ایک بار پروفیسر رشید احمد صدیقی کی صدارت میں ہم نے آل انڈیا مشاعرہ بھی پڑھا تھا۔

اطہر عزیز : کہیں ایسا تو نہیں کہ شاعری سے آپ مطمئن نہ ہوئے تو مزاح نگاری کی طرف مائل ہو گئے؟

یوسف ناظم : خیر مطمئن تو میں دونوں سے ہوں مگر ان دنوں حیدرآباد میں نثر نگاری کا میدان گرم تھا۔ ہر جانب مرزا فرحت اللہ بیگ سنائی دے رہے تھے۔ ان دنوں وہ جج تھے اور ہم طالب علم مگر اُن کی طرزِ نگارش نے ہماری طلب علم کو بڑی جلا بخشی۔ پروفیسر یوسف حسین خاںؒ، ڈاکٹر محی الدین قادری زور ہمارے اساتذہ تھے۔ پہلا خاکہ ہم نے اپنے استاد زور صاحب پر ہی لکھا جس کے سبب ان کا یہ معتوب شاگرد بعد میں محبوب بن گیا۔ سیاست اخبار اس وقت وجود میں نہیں آیا تھا۔ اپنی ٹیڑھی میڑھی تحریریں روزنامہ 'میزان' میں چھپتی تھیں۔ جس کے ایڈیٹر حبیب اللہ اوج ہوا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ ہندو پاک کے مختلف رسائل وجرائد میں چھپنے لگا۔ پھر کبھی مڑ کر نہیں دیکھا کہ کہیں پتھر نہ ہو جاؤں۔ اب تک بیس بائیس کتابیں آ چکی ہیں اور تقریباً اتنے ہی مسودے معمورۂ ناظم میں موجود ہیں۔ 'کیف و کم، فٹ پاتھ، دیوار یے، زیرِ غور، فقط، البتہ، بالکلیات، فی الحال، فی الفور، فی الحقیقت، فی زمانہ، فی البدیہہ، منجملہ، ورنہ، علیک سلیک، دامنِ یوسف، برائے نام، ایک کتاب اور' ...... یہ میری ایسی کتابیں ہیں جو سینہ بہ سینہ بلکہ

کینہ بہ کینہ پڑھی جاتی رہی ہیں۔ ہاں ایک کتاب 'انگریز ہندوستان میں' بھی تو آپ کے ادارے ایڈ شاٹ سے آرہی ہے۔ جس کا ہندی ترجمہ ہمارے پرانے خیر خواہ میر ساجد علی قادری نے کیا ہے۔ ۱۹۶۰ء میں تقسیم ریاست کے بعد میں بمبئی منتقل ہوگیا اور ۱۹۷۶ء سے بحثیت ڈپٹی لیبر کمشنر سبکدوش ہوں مگر بارگاہِ طنز و مزاح میں اب بھی قہقہہ بردوش ہوں۔

نصرت ظہیر　:　فرحت اللہ بیگ کے علاوہ آپ اور کس سے متاثر رہے؟

یوسف ناظم　:　حجاب امتیاز علی سے۔ حالانکہ وہ سنجیدہ ادیبہ تھیں مگر ان کی تحریر میں کمال کی شگفتگی تھی۔ شفیق الرحمٰن کی غالباً دوسری تصنیف کا دیباچہ انہوں نے ہی لکھا تھا۔ فرحت اللہ بیگ کے 'مضامینِ فرحت' کی آٹھ جلدیں ہم نے چاٹ ڈالیں۔ ان کے قلم میں غضب کا بہاؤ اور بیان میں کمال کا رچاؤ تھا۔ ڈھیروں صفحات انہوں نے سیاہ کرڈالے۔ انہیں لکھنے کا گویا ہیضہ ہوگیا تھا۔ جس کا تھوڑا بہت شکار غالباً خاکسار بھی ہے۔ بہتیرے علاج کروائے کہ یہ وبا آگے نہ پھیلے مگر 'قلم گوید کہ من شاہ مزاح ام' ۶۵ رسال سے قلم گھستا ہی چلا آرہا ہے۔ کوئی موضوع نہ ملا تو اپنے مربّیوں، محسنوں، مشفقوں پر لکھ ڈالا۔ سری نواس لاہوٹی کو مارواڑی ادیب بنا ڈالا۔ علی سردار جعفری، مشفق خواجہ، گوپی چند نارنگ، شیام کشن نگم، محبوب حسین جگر، سکندر علی وجد، راج بہادر گوڑ، مغنی تبسم، مظہر امام، عالی جعفری غرض یہ کہ کسی کو نہیں چھوڑا۔ بڑے چھوٹے، موٹے تگڑے، ٹیڑھے میڑھے، دبلے پتلے متعدد ادیبوں اور شاعروں پر خاکے تحریر کر کے ہم نے اپنی خاکساری کا ثبوت دیا ہے۔ اپنی زود نویسی پر بیٹھے بٹھائے خود ہی ایک رائے قائم کر کے ایک چھوٹا سا پیش لفظ لکھ ڈالا۔

''میں ہمیشہ اس غلط فہمی میں مگن رہا کہ زیادہ لکھنے سے (جسے بسیار نویسی کہا جاتا ہے) ادب میں اضافہ ہوتا ہے۔ میری کئی کتابیں اسی غلط فہمی کی پیداوار ہیں۔ مگر میں اتنا جانتا ہوں کہ ادب میں مزاح نگاری ایک خوشگوار، مستقل، مستحکم اور مہذب اسلوبِ نگارش ہے جسے نظر انداز کرنا مشکل ہے۔ یہ وہ جادو ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے اور بعض صورتوں میں سر کے اوپر سے بھی گذر جاتا ہے۔ یہ قطرے کے گہر بننے کا عمل ہوتا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس تعریف کا اطلاق میری ہر مزاحیہ کتاب پر ہو۔''

اطہر عزیز　:　ناظم صاحب! ایک ادیب کو مزاح نگار بننے کے لیے کن شرائط کا پابند ہونا ضروری ہے؟

یوسف ناظم　:　دوسری اصناف ادب میں شرائط ہی شرائط ہیں جب کہ مزاح کیلئے صرف ایک شرط ہے کہ وہ مزاح ہو۔ اور یہ ایک شرط کوئی آسان شرط نہیں ہے۔ بڑی بلکہ کڑی آزمائش سے گذرنا پڑتا ہے۔ مزاح میں موزونیت ہو...... مذمومیت نہیں۔ کہ مزاح کی آڑ میں آپ کسی کی بھی مذمت کرڈالیں۔ میں نے ہمیشہ اس بات کا خیال رکھا کہ جس پر لکھا جائے اس کی مرتبت میں اضافہ ہو، ازالہ نہیں۔ باقر مہدی کو پہلے علم کی بلندی پر پہنچایا بعد میں علم کو پہنچنے کے لیے کہا۔ آپ طنز و مزاح میں طعن و تشنیع نہیں کرسکتے۔ آپ کا کام ہے روتے بسورتے ہوئے لوگوں کو مہذب طریقے سے ہنسانا۔ نہ کہ ہنستے قہقہاتے ہوئے لوگوں کو غیر مہذب انداز سے رلانا۔ یہ آپ کو زیب نہیں دیتا۔ اسی لیے میں کہا کرتا ہوں کہ ''ظرافت اور شرافت دو بہنیں ہیں۔''

اطہر عزیز : سگی یا سوتیلی؟

یوسف ناظم : سگی بہنیں۔

نصرت ظہیر : تو ظاہر ہے پھر رضاعی ہوں گی؟

یوسف ناظم : کون سی رضائی؟......داغ والی رضائی......(زوردار قہقہہ)

اطہر عزیز : نئی نسل کے مزاح نگاروں میں آپ کن سے متاثر ہیں؟

یوسف ناظم : کمال ہے۔ میں تو پرانی نسل کے مزاح نگاروں سے کم کم ہی کسی سے متاثر ہوں۔ آپ نئی نسل کی بات کرتے ہیں۔ ویسے بمبئی میں مزاح نگار بہت ہی کم ہیں۔ فیاض احمد فیضی اور بھیونڈی کے رفیع انصاری میں مزاح نگاری کے جراثیم جرائم کی حد تک پھیلے ہوئے ہیں۔ کم لکھتے ہیں مگر کامیاب لکھتے ہیں۔ حیدرآباد میں مجتبیٰ حسین ہیں جو عمر میں مجھ سے چھوٹے ہیں مگر عمل میں مجھ سے بڑے بلکہ تگڑے ہیں۔ مگر مزاح میں وہ کسی تگڑم بازی کے قائل نہیں بلکہ اپنی طنزیہ تحریروں کے ذریعے اپنے قارئین پر بڑی تہہ داری سے اثر چھوڑ جاتے ہیں۔

اطہر عزیز : نصرت ظہیر کو آپ مزاح کے کس خانے میں رکھنا پسند کریں گے؟

یوسف ناظم : یہ آپ ان سے ہی پوچھیں کہ وہ مجھے کس خانے میں رکھنا پسند کریں گے۔ ایسا لگتا ہے کہ انہیں کسی نے میرے بارے میں بدگمان کر رکھا ہے۔

نصرت ظہیر : ارے جناب! میں کیوں آپ سے بدگمان ہونے لگا۔ میں تو آپ کا اُس زمانے سے پرستار بلکہ پیرایہ خوار ہوں جب ۱۹۶۰ء کے آس پاس 'اردو بلٹز' میں آپ کا کالم 'باتیں ہماریاں' چھپتا تھا۔ آپ کا پیرایۂ اسلوب مجھے ایسے پکڑے رکھتا تھا کہ اخبار خریدتے ہی میں سب سے پہلے آپ کا ہی کالم پڑھتا تھا۔ میری خوش گمانی بلکہ خوش مذاقی کا عالم دیکھئے کہ جن دنوں میں قومی کونسل، دلی کے ڈائجسٹ 'اردو درپن' سے وابستہ تھا تو آپ کے دو مضامین جو حکمت و طبابت سے متعلق تھے میں نے انہیں شگفتہ تحریر کے شاہکار نمونے کے طور پر اُس رسالے میں چھاپا۔ ۱۹۸۸ء میں جب میں نے اپنا پہلا مزاحیہ مضمون غالب اکیڈمی کے جلسے میں پیش کیا تو اس وقت آپ بھی مجلسِ صدارت میں تھے اور میری اس مزاحیہ تحریر کی آپ نے بڑے سنجیدہ انداز میں تعریف کی تھی۔

اطہر عزیز : حیدرآباد ہمیشہ طنز و مزاح کا مرکز رہا ہے۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟

یوسف ناظم : یہ سوال پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ایک جلسے میں کیا تھا جس پر ہم نے کہا تھا کہ حیدرآباد والوں پر ظلم بہت ہوا ہے۔ اب اس کے ازالے کے لیے کوئی راستہ تو نکلنا چاہیے۔ تو یہاں کے لوگوں نے مسلسل رونے بسورنے کے بجائے ہنسنے، قہقہہ لگانے ہی میں اپنی زندہ دلی کا ثبوت دیا۔ جسے آگے چل کر ہم لوگوں نے 'انجمنِ زندہ دلانِ حیدرآباد' کا نام دے دیا جس کی اب کئی شاخیں کھل گئی ہیں مگر مرکزی قہقہہ حیدرآباد سے بلند ہوتا ہے۔ جو گھومتا گھامتا بمبئی پہنچتا ہے اور جسے ہم 'انجمنِ زندہ دلانِ' بمبئی کے تحت محفل محفل سجا کر گاؤں گلیاروں میں پہنچاتے ہیں۔

نصرت ظہیر : آپ کا کوئی شعری مجموعہ بھی منظرِ عام پر آیا؟

یوسف ناظم : نہیں۔مگر اشعار اتنے ہیں کہ سمیٹنے پر آؤں تو مجموعے کے اندر سے زیادہ کچھ اشعار باہر بھی نکل آئیں۔پچھلے دنوں کچھ اشعار ہم پر یونہی اتر گئے ہیں۔کیوں نہ آپ لوگوں پر ہی اتار دوں۔

اطہر عزیز : ضرور۔ہم لوگ ہمہ تن گوش ہیں۔

یوسف ناظم : ملاحظہ ہو۔

ہمیں زندگی راس آنے لگی ہے نئی اِک کہانی سنانے لگی ہے
نہیں پاؤں ٹکتے تھے جن کے زمیں پر انہیں بھی زمیں آزمانے لگی ہے
قیادت جو من مانی کرنے لگی تھی عدالت.میں چہرہ چھپانے لگی ہے
شرافت کا معیار اونچا ہوا ہے وزیروں کے گھر آنے جانے لگی ہے

آخری شعر بطورِ خاص ڈاکٹر رفیق زکریا(مرحوم) کو مخاطب کرکے سناتا تھا۔بہت خوش ہوتے تھے۔ہائے اب کہاں لوگ اس طبیعت کے!شعری مجموعے پر ایک لطیفہ یاد آیا۔ایک بار میں نے اپنی کتاب(مزاحیہ مضامین کا مجموعہ)راجندر سنگھ بیدی کو پڑھنے کے لیے دی۔کچھ دنوں بعد ملاقات پر میں نے ان سے اس کتاب پر رائے پوچھی تو ہکا بکا ہوکر کہنے لگے۔ارے!میں نے تو اُسے شعری مجموعہ سمجھ کر کہیں اوپر ڈال دیا۔(زوردار قہقہہ)آخر کار چار گھنٹوں پر مشتمل ہماری یہ قسطوں میں بٹی،قہقہہ آمیز(بیچ بیچ میں چائے کا دور بھی چلتا تھا)گفتگو اختتام پذیر ہوئی مگر ہمیں کیا پتہ تھا ہماری اس گفتگو کے صرف دو سال کے اندر ہر ہر لمحہ،ہر ہر پل،ہر ہر موقع پر روتے بسورتے ہوؤں کو ہنسانے والا،جہانِ طنز و مزاح کا جیالا،میرِ کارواں سید یوسف المعروف بہ یوسف ناظم ۲۳رجولائی ۲۰۰۹ء بروز جمعرات بوقت صبح ۹ربجے اپنی اُسی رہائش گاہ'الہلال'باندرہ میں ۸۸رسال کی عمر میں سبھوں کو رُلاتا ہوا سفرِ آخرت پر روانہ ہوجائے گا۔راقم الحروف کے لیے یہ سانحہ کسی سوہانِ روح سے کم نہیں کہ مرحوم کا تحریر کردہ ایک طنزیہ شاہکار''انگریز ہندوستان میں''کا ہندی ایڈیشن تیزی سے طباعت کے مراحل سے گذر رہا تھا اور دو ایک روز میں اشاعت پذیر ہوکر انہی کے ہاتھوں اس کا اجرا ہونا تھا۔مگر افسوس قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا اور وہ ساتھ چھوڑ گئے۔چند روز قبل انہوں نے اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں ہم سے کہا بھی تھا''اطہر عزیز صاحب!یہ مانا کہ آپ کے ادارے کے تحت کتابیں اتنی معیاری و خوبصورت چھپتی ہیں کہ ان پر درج قیمت صرف کتاب کو دیکھنے کے لیے ہوتی ہے،پڑھنے کی قیمت تو اس سے کہیں زیادہ ہوتی ہے،مگر ہماری اس ہندی کتاب کی اشاعت میں اتنی تاخیر نہ ہوجائے کہ آپ ہمیں ڈھونڈتے رہ جائیں۔آہ!ان کا اندیشہ صحیح ثابت ہوا اور ہم سکتے میں ہیں کہ دستِ قضا نے کس چابکدستی سے دستِ ناظم اپنے پہلو میں چھپالیے۔

موت اُس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس ورنہ دنیا میں سبھی آتے ہیں مرنے کے لیے

(یہ انٹرویو بمبئی یونیورسٹی کے تعزیتی جلسے میں پڑھا گیا۔)

☆☆☆

رفیعہ شبنم عابدی

خاموش ہو گیا ہے چمن بولتا ہوا

منافقوں کی بھیڑ میں جب کہیں، کوئی خیر خواہ انتہائی مہربان شفیق، مشفق اور مخلص چہرہ دکھائی دے جائے تو آپ یقیناً یہی محسوس کریں گے نا؟ کہ جیسے جیٹھ کے تپتے ہوئے مہینے میں پروائی چل گئی ہو؟ یا دامن صحرا میں اوس نے گلاب کے کٹورے بھر کے رکھ دیے ہوں؟ یا دھوپ میں جھلستے ہوئے، جاں بلب، پیاسے مسافر نے کہیں برگد کی گھنی چھاؤں یا ٹھنڈے پانی کا بہتا ہوا چشمہ پالیا ہو؟؟ یوسف ناظم کو دیکھ کر کچھ ایسا ہی احساس ہوتا تھا۔

لوگ کہتے ہیں، وہ ایک ممتاز طنز و مزاح نگار تھے۔ دل کہتا ہے، وہ ایک سنجیدہ اور شائستہ سماجی نقاد تھے۔ اس کا ثبوت خود اُن کا یہ جملہ ہے۔ ''مزاح نگاری شائستہ نگاری ہے کیوں کہ ظرافت نہ تو اُم الخبائث ہے، نہ بنت اللطائف۔'' طنز و مزاح کی اس سے بہتر مثال ہو ہی نہیں سکتی۔ واقعی طنز و مزاح محض تفریح کا سامان نہیں، بلکہ ایک کڑوا سچ ہے۔ گیلی لکڑی کا دھواں ہے۔ کیکر کی چبھن ہے۔ کانٹوں بھری شاخ گلاب ہے۔ ایک آنسوؤں بھرا تبسم اور ایک نم ناک جھنجھلاہٹ ہے۔ ایک مخلص جذبۂ اصلاح اور ایک بے لوث سماجی خدمت ہے اور پروائیوں کے نام پر شعلوں کا خطرناک کاروبار ہے۔ اسی لیے یہ ہر کس و ناکس کے بس کی بات بھی نہیں اُنہیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد! یوسف ناظم ایک ایسے ہی حوصلہ مند شخص تھے۔ لیکن یہ سب میں اس وقت کیوں دہرا رہی ہوں؟ یہ سب تو میں نے اُس وقت لکھا تھا جب یوسف ناظم حیات تھے اور حسب معمول مردہ دلوں میں زندگی اور زندہ دلی بانٹ رہے تھے۔ لیکن کسے معلوم تھا کہ دو چار برس بعد ہی جہاں جہاں اُن کے لیے ''ہیں'' کا صیغہ لکھا گیا تھا، وہاں وہاں اب اسے ''تھے'' کہہ کر پڑھنا ہوگا۔

اب یہ کہنا ہوگا کہ اُن کے جملے، اُن کے فقرے، اُن کے چٹکلے محض مسخرگی نہیں تھے، محض لطیفہ گوئی بھی نہیں تھے۔ محض شرارت یا شوخی بھی نہ تھے۔ میں نے اُس جھریوں بھرے چہرے پر زمانے کی دھوپ چھاؤں کو کھیلتے ہوئے دیکھا تھا۔ اُن تجربہ کار آنکھوں میں جو گذشتہ ساٹھ پینسٹھ سال سے مسلسل سماج کے قبیح اور حسین پہلوؤں کا مشاہدہ کرتی رہی تھیں، زندگی کی حقیقتوں کو کروٹیں بدلتے دیکھا تھا۔ میں نے اُن سفید پلکوں کی نامعلوم نمی اور اُن ہونٹوں کی معنی خیز مسکراہٹ میں انسانی قباحتوں اور خامیوں کو ترحم کی پرتوں کے بیچ سانس لیتے ہوئے پایا تھا۔ فکر کی آفتابی حدت سے اُن بالوں پر جمی برف کے پگھلنے کا نظارہ کیا تھا۔ غرضیکہ ☆ ☆ ☆ ☆ ہی رتوں کو آتے جاتے، کتنے ہی دھوپ کے ٹکڑوں کو پھیلتے سمٹتے، کتنے ہی بادلوں کو گرجتے برستے اور بارشوں کی کتنی ہی بوچھاروں کو طوفان اور کتنے ہی قطروں کو سمند بنتے دیکھا تھا۔ اسی لیے تو اُن جادوئی انگلیوں کے پوروں سے توانائی کی وہ کونپلیں پھوٹتی رہیں، جنھوں نے زمین ادب پر طنز و مزاح کے تازہ وارد غنچوں کو تازگی اور شگفتگی بخش دی۔

ہمارے کئی انگار ادیب و نقاد بڑی آسانی سے کہتے رہے کہ یوسف ناظم زود نویس ہیں، بسیار نویس ہیں۔ ان کی مطبوعات کی رفتار یا تو حشرات الارض سے ملتی ہے یا ہندوستان کی آبادی سے۔ غور کیجئے تو زود نویسی یا بسیار نویسی ایسی آسان بھی نہیں یہ صلاحیت بھی شاعری کی طرح ''بزور بازو نہیں'' ملتی تا نہ بخشد خدائے بخشندہ! ہمارے ادب میں نیاز فتح پوری جیسا لکھاڑ ادیب میں اب تک پیدا نہیں ہوا۔ بعد کے لکھنے والوں میں کرشن چندر نے راجدھانی اکسپریس کی رفتار سے کہانیاں لکھیں اور عہد حاضر یوسف ناظم نے کمپیوٹر کی سی تیز رفتاری سے خرمن کے خوشہ چینیوں کے لئے مضامین نو کے انبار لگا دیے۔ مگر سوچئے تو درجنوں کتابیں یوں ہی وجود میں نہیں آجاتیں۔ ہزاروں حروف یوں ہی پردۂ ذہن پر انگڑائیاں نہیں لیتے۔ کہنے کہ تو لوگ لاکھ کہہ لیں کہ وہ ہر کس و ناکس پر ہر کہتر و مہتر پر کچھ نہ کچھ لکھ کر اپنے قلم کی حرمتوں کو ضائع کر رہے تھے۔ مگر یہ خام ذہنوں کی دل جلی آواز تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اپنے سے کم رتبہ، کم عمر، اور کم علم، نو آموز قلم کاروں کی ہمت افزائی اور تیز رفتاری کے ساتھ تخلیقی توانائی، یہ تضیع لوح و قلم نہ تھی بلکہ طبع رواں کا فیضان و کرم تھا۔ یہ اپنی ذات پر گمان نہیں بلکہ اپنی خودی کا ایقان تھا۔ یہ بخیلی نہ تھی، رزاقی تھی:۔ یہ کوزہ سازی نہ تھی، ساقی گری تھی۔ اور پھر ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ شبنم بانٹنا اور سمندر بھر احسان جتانا۔ یعنی مصلحت آمیز سائبانی کا دکھاوا اور ڈھنڈورہ کم مایہ اور بے چھایا پیڑوں کی آشفتہ بیانی ہو سکتا ہے، خورشید مزاجوں کا شیوہ نہیں:۔ اسی لئے اپنے فن کے تئیں، یوسف ناظم کا یہ رویہ دراصل یوسفی تھا، یہ مصر کی بادشاہی ہی نہ تھی۔ سچ ہے، منصب کی بزرگی کرسی کی سائز سے نہیں، دل کی وسعت سے ناپی جاتی ہے شاید اسی لئے دنیا کی تاریخ میں یوسف کا دامن مشہور ہو گیا، عزیز مصر کا تخت نہیں۔ ادب کے میزان نامے میں بھی یوسف ناظم کی یہ دریا دلی اندراج ہو گئی، اپنے سے جونیئر ادیبوں پر لکھنے سے اجتناب کرنے والوں کی تھڑ دلی جگہ نہ پا سکی!

پہلی بار زمانہ طالب علمی میں ان کو پڑھا تھا۔ دیکھنے کا موقع اس وقت میسر آیا جب مہاراشٹر اسٹیٹ کے قیام کے بعد وہ اسٹنٹ لیبر کمشنر کے باوقار عہدے پر متمکن ہو کر عروس البلاد کے باسی بن گئے۔ اور علمی و ادبی دلچسپیوں کے تحت آل مہاراشٹر انٹر کالجیٹ اور انٹر اسکول تقریری مقابلوں میں اکثر و بیشتر منصفی کے فرائض انجام دیتے دکھائی دیے اور مجھے فخر ہے کہ اس ممتاز ادیب کے قلم نے ہمیشہ ہی ''قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند'' کے مصداق ناچیز کو اولین انعام سے سرفراز فرمایا۔ اور اس کا ذکر اس ناچیز پر لکھے گئے خاکے میں بقلم خود کیا۔ برسوں بعد جب میں نے اپنی خانگی مصروفیات سے باہر نکل کر مشاعروں اور مذاکروں کا اسٹیج سنبھالا تو ناظم صاحب کبھی بجوکا کی طرح اور کبھی میری چھتر چھایا بن کر ہمیشہ میرے ساتھ رہے۔ عروس البلاد کے شاید بہت کم ایسے ادبی جلسے یا نشستیں ہوں گی جن میں یوسف ناظم کی صدارت اور ناچیز کی نظامت یا شرکت ساتھ ساتھ نہ ہوتی۔ بلکہ ان کے تعاون سے تو بڑے بڑے جلسے منعقد کرنے کا موقع ملا۔ خصوصاً انجمن ترقی اردو کی جانب سے، جس کے وہ ایک مدت تک صدر رہے اور ناچیز جنرل سکریٹری۔ ''جشن حافظ'' تو ان کا ایک عظیم الشان کارنامہ تھا۔ اس شان دار سمینار کے انعقاد اور کامیابی کی ذمہ دار چار شخصیتیں تھیں۔ علی سردار جعفری، مجروح سلطان پوری، یوسف ناظم اور پروفیسر حسینی۔ افسوس کہ یہ چاروں شخصیتیں اب اس دنیا میں نہیں رہیں، لیکن اس جشن کی تقریبات کے دوران جو

Inspiration ملا اور حافظ کے تعلق سے جو دل چسپی پیدا ہوئی وہ اتنی زبردست تھی کہ جس نے نہ صرف خاکسار سے ''مجذوب شیرازی'' جیسی تحقیقی کتاب لکھوائی بلکہ حافظ کی ایک سو ایک غزلوں کا منظوم ترجمہ کرنے کا حوصلہ بھی بخشا۔ بڑی شخصیتوں کی یہی پہچان ہوتی ہے۔ وہ علم بانٹتی ہیں اور ثواب لوٹتی ہیں۔ آگہی تقسیم کرتی ہیں اور جستجو خیرات کرتی ہیں۔

مجھے یاد آرہی ہے مکتبہ جامعہ ممبئی کی ایک شام، جس زمانے میں شاہد بھائی مکتبہ کا دوسرا نام مانے جاتے تھے۔ ان دنوں وہ غالباً سالانہ آوٹ کے سلسلے میں ممبئی آئے ہوئے تھے۔ اور ان کے آتے ہی جسب معمول مکتبہ میں ادیبوں، شاعروں اور دانش وروں کا جمگھٹا لگنا شروع ہوگیا تھا۔ ایسی ہی ایک شام تھی وہ! یوسف ناظم کی نئی، تازہ کتاب ''فی الحال'' مارکیٹ میں آئی ہوئی تھی۔ شاہد بھائی نے اچانک ہی اس کتاب کی رسم اجرا کی تقریب منعقد کرڈالی۔ ایک surprised تقریب۔ اور شرط یہ تھی کہ شرکت کرنے والے تمام صاحبان کتاب پڑھے بغیر یوسف ناظم کے فن اور شخصیت کے تعلق سے گفتگو کریں گے۔ شرکائے محفل تھے علی سردار جعفری، عزیز قیسی، فضیل جعفری، محمود چھاپرا، سریندر پرکاش، انور خان، انور قمر، حسن کمال، عبداللہ کمال اور ناچیز کے علاوہ دیگر حضرات شاید میں کچھ نام بھول رہی ہوں۔ عبداللہ کمال نے اس کا رپورتاژ بھی لکھا تھا جو'کتاب نما' ہی کے کسی شمارے میں شائع بھی ہوا تھا۔ بحث مباحثہ میں یوسف ناظم کی شخصیت اور فن سے متعلق نیز، طنز ومزاح، کی بابت بھی کئی اختلافی سوالات اٹھے۔ ان کی بسیار نویسی بھی زیر بحث رہی۔ اور میں ہمیشہ کی طرح ان کی طرف دار بنی رہی۔ کہیں کہیں جذباتی بھی ہوگئی۔ واپسی پر عزیز قیسی اور یوسف ناظم میرے اور عابدی صاحب کے ساتھ ہی تھے۔ کہنے لگے۔ ''آپ کو کیا ضرورت تھی میرے لئے یوں سینہ سپر ہوجانے کی؟ یہ کوئی مہابھارت تھوڑی ہی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''میں اپنے مزاج سے مجبور ہوں، وہ شخصیتیں جن سے میں عقیدت رکھتی ہوں۔ ان کے خلاف ایک لفظ برداشت نہیں کرسکتی۔ اسی لئے جب کوئی غالب، سردار جعفری، مجروح سلطان پوری، اور آپ کے خلاف کچھ بولتا ہے تو اپنے غصے پر قابو نہیں پاسکتی۔'' عزیز قیسی بڑے رسان سے اور دیر تک مجھے سمجھاتے رہے۔

پھر یاد آتا ہے وہ زمانہ۔ جس وقت یوسف ناظم مہاراشٹر اردو اکاڈمی کے جنرل سکریٹری تھے۔ میں اس کی رکنیت میں شامل تھی۔ یوسف ناظم کو لگتا تھا اردو کی ترقی وترویج کے لئے، وہ جو کچھ بھی سوچ رہے ہیں، وہ سارے کام پلک جھپکتے ہی ہوجائیں۔ اس عجلت پسندی کے سبب ایسا بھی ہوتا تھا کہ دیگر اراکین کو اطلاع دئے بنا اور کسی ایجنڈا یا میٹنگ کے بغیر ہی وہ اپنی مرضی سے بہت سے پروجیکٹ شروع کردیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اراکین اکادمی کی ایک بڑی تعداد ان کے اس طریقہ کار سے ناخوش تھی۔ اور اندر ہی اندر ایک لاوا سا پک رہا تھا۔ اس میں کچھ بیرونی عناصر اور ہوائیں بھی شامل ہوگئیں آخرکار اس اختلاف نے ایک احتجاج کا روپ اختیار کرلیا۔ اس دوران ان کے خلاف میڈیا میں بیان بازیوں اور افسانہ طرازیوں کا سلسلہ بھی چلا۔ ایک نوجوان ادیب نے جو اتفاق سے میرے شاگرد بھی رہ چکے تھے۔ اور ان دنوں کسی روزنامے کے لئے کام کررہے تھے، فون پر مجھ سے میرا Statement مانگا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں ان کے خلاف کچھ گرما گرم بیان دوں۔ میں نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ۔

''ناظم صاحب کے طریقۂ کار سے مجھے لاکھ شکایت سہی، لیکن میرے لئے وہ خاندان کے ایک بزرگ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور خطائے بزرگاں گرفتن خطا است۔ ویسے بھی مجھے یقین ہے کہ بزرگ خطائیں کم ہی کرتے ہیں۔ اور اگر کوئی کر بھی دے تو ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ'' دادا جان: آپ نے یہ بات غلط کہی ہے۔ یا ابا حضور: آپ چپ ہی رہیے اس معاملے میں آپ کچھ نہیں جانتے۔ یا عم محترم! آپ کو آتا ہی کیا ہے؟ مجھے تو بچپن ہی سے دو باتوں کی خاص تاکید کی گئی تھی۔ ایک یہ کہ بزرگوں سے گستاخی نہ کرو۔ اور دوسرے چھوٹوں کے منہ نہ لگو۔ میں نے آج تک اس پر عمل کیا۔ بزرگوں کا کوئی فعل یا قول پسند نہ آیا تو زبان نہ کھولی۔ اور چھوٹوں نے دریدہ دہنی کی تو جواب میں خاموشی اختیار کی۔ چہ جائے کہ یوسف ناظم کے خلاف کوئی بیان دینا۔ میں جانتی تھی کہ ان کے اس فعل میں بھی ان کا خلوص شامل تھا۔ اردو کی بے لوث خدمت شامل تھی۔ عمر کی اس منزل پر انہیں کوئی ذاتی مفاد تو حاصل کرنا نہیں تھا۔

اور پھر یوسف ناظم تو وہ بزرگ تھے، جن کی معیت میں میں نے بہت کچھ سیکھا تھا۔ انہیں کی معیت میں تو میں نے مہاراشٹر کالج کی بزم اردو کی جانب سے بہ حیثیت صدر شعبہ پہلی بار ممبئی میں ''انجمن زندہ دلانِ ممبئی'' تشکیل دی۔ اور اس کا پہلا جلسہ، جسے افتتاحی جلسہ قرار دیا جا سکتا ہے، بزم اردو مہاراشٹر کالج کی جانب سے ہوا جس میں ماہ نامہ ''شگوفہ'' (حیدرآباد) کے مدیر مصطفےٰ کمال نے بہ حیثیت مہمان اعزازی شرکت فرمائی۔ اس میں یوسف ناظم کے علاوہ مسز نورالعین علی، (غالباً) پرویز یداللہ مہدی، فیاض احمد فیضی اور ناچیز نے طنزیہ و مزاحیہ مضامین پڑھے۔ پھر اسی ''زندہ دلانِ ممبئی'' کے تحت ناظم صاحب کی کوششوں اور تعاون سے محسن اردو شیام کشن نگم سے ایک ٹرافی حاصل کی گئی اور بزمِ اردو، مہاراشٹر کالج کی جانب سے ''شیام کشن نگم ٹرافی انٹر کالج تقریری مقابلہ'' کا اعلان اور آغاز ہوا۔ شعبۂ اردو، مہارشٹر کالج کی جانب سے ہر سال منعقد کیا جانے والا یہ تقریری مقابلہ اپنی نوعیت کا منفرد مقابلہ تھا۔ یعنی اس میں روایت سے ہٹ کر، پہلی مرتبہ صرف طنزیہ و مزاحیہ عنوانات پر تقریریں کرنے کی شرط عاید کی گئی۔ اس مقابلے کا آغاز شیام کشن نگم، ڈاکٹر رفیق زکریا اور یوسف ناظم کی مشترکہ شرکت کے ساتھ ہوا۔ صد حیف! کہ نہ شام کشن نگم جیسے محسن اردو رہے، نہ ڈاکٹر رفیق زکریا جیسے دانش ور اور نہ یوسف ناظم جیسا طنز و مزاح نگار۔ اور طرفہ ستم یہ کہ زمانے کی الم ناکی کے ساتھ ساتھ یہ مزاحیہ مقابلہ بھی اکثر معرضِ التوا میں پڑتا چلا گیا۔ جی چاہتا ہے کہ اب اس کی تلافی یوں ہو کہ یوسف ناظم کے نام سے کوئی ٹرافی ایسی رکھی جائے جو طنز و مزاح کے فروغ میں اردو طلبہ کو تقریر و تحریر کی ترغیب دلا سکے۔

اس قسم کے اور بہت سے مقابلے یوسف ناظم کی قیادت میں اس وقت منعقد کئے گئے تھے جب وہ انجمن ترقی اردو کے صدر تھے۔ ان مقابلوں کا انعقاد غالبؔ کے دوسو سالہ جشن کے موقع پر کیا گیا تھا۔ اور جتنے بھی انٹر کالجیٹ اور انٹر اسکول مقابلے ہوئے، تقریری، تحریری، مباحثے، مذاکرے، غزل سرائی، غزل خوانی اور لطیفہ گوئی وغیرہ وغیرہ، ان کا سب کا موضوع مرزا غالبؔ ہی تھے۔ جشن انتہائی کامیاب ثابت ہوا۔ دراصل ان تقریبات کا مقصد طلبہ میں مرزا غالبؔ کے فکر و فن اور حیات و شخصیت سے متعلق ایک ادبی شعور اور ذوق پیدا کرنا تھا۔ اس کے

ہر جلسے میں چاہے وہ مہاراشٹر کالج میں یعنی قلب شہر میں منعقد ہوا، یا رضوی کالج باندرہ میں یا پھر اسمٰعیل یوسف کالج (مضافاتِ شہر) میں، یوسف ناظم ہر جگہ بہ نفسِ نفیس وقت سے پہلے حاضر رہتے اور بذاتِ خود دل چسپی لیتے۔ کسی صدر انجمن کا ایک ڈھلتی ہوئی عمر میں اس طرح فعال رہنا، کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔

عثمانیہ کے اس فرزند کو شعری ذوق تو مادرِ علمی سے وراثت میں ملا تھا۔ خاص طور پر بیت بازی کا ذوق۔ اس ذوق کو، جو فی زمانہ معدوم ہوتا جا رہا ہے، بیدار کرنے اور زندہ رکھنے کے مقصد سے مہاراشٹر اردو اکادمی کے تحت، یوسف ناظم کی سکریٹری شپ میں، اکبر پیر بھائی کالج میں بیت بازی کا ایک عظیم الشان مقابلہ منعقد کیا گیا۔ فریقین میں ایک طرف اکادمی کے اراکین تھے تو دوسری طرف کالج اور یونیورسٹی کے تازہ دم نوجوان طلبہ۔ منصفی کے فرائض سردار جعفری، مجروح سلطان پوری اور راہی معصوم رضا نے ادا کئے۔ اس مقابلے میں اکاڈمی کی ٹیم میں یوسف ناظم، عزیز قیسی، حسن کمال، ہارون رشید (سابق مدیر روزنامہ انقلاب)، خاکسار، شمیم طارق وغیرہ نے حصہ لیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس مقابلے میں حسن کمال بازی لے گئے کیوں کہ انہیں بے شمار اشعار ازبر ہیں اور بروقت یاد بھی آجاتے ہیں، بہترین شعر خواں تو وہی ٹھہرے، لیکن اس بیت بازی کو دل چسپ اور جان دار بنانے میں یوسف ناظم کے ان فقروں، جملوں اور چٹکلوں کا زبردست ہاتھ تھا جو دورانِ مقابلہ ان کی زبان سے نکل کر حاضرین کو محظوظ کرتے رہے۔

ایسا ہی ایک اور مقابلہ مرزا غالبؔ کے دوسو سالہ جشن کے موقع پر انجمن ترقی اردو کی جانب سے منعقد ہوا۔ اس میں شرط یہ تھی کہ فریقین جواب در جواب صرف غالبؔ ہی کے اشعار پڑھیں گے۔ گویا یہ ''مرزا غالب بیت بازی'' مقابلہ تھا۔ یہ مقابلہ بھی دراصل مرزا غالبؔ اور یوسف ناظم کے درمیان رہا۔ کیونکہ پڑھے جانے والے مرزا غالبؔ کے اشعار پر یوسف ناظم کی متوازی فی البدیہہ کمنٹری جاری رہی اور وہ گرہ بر گرہ لگاتے رہے۔

یوسف ناظم کو ویسے بھی غالبؔ کے بے شمار اشعار یاد تھے، جن کا برمحل استعمال وہ اپنی مزاحیہ تحریروں میں بڑی خوب صورتی سے کرتے تھے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مرزا غالبؔ کو جس نے نہیں پڑھا، وہ یوسف ناظم کے شائستہ مزاج میں چھپے حسن کو سمجھنے سے قاصر ہی رہے گا۔ اس اندازِ تحریر نے ان کی ظرافت میں شائستگی اور وقار پیدا کر دیا تھا۔ اسی لئے ان کے ہاں ابتذال ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا۔ یہی نہیں، انہوں نے مرزا غالبؔ کی شخصیت اور فن سے متعلق متعدد مضامین بھی لکھے۔ ان کی ظرافت میں شوخی کے ساتھ ساتھ تنقید کا ایک خوب صورت عنصر بھی شامل ہے۔ اسی سے متاثر ہو کر میں نے ایک مضمون ''یوسف ناظم کی غالبؔ شناسی اور ظرافتی تنقید'' کے عنوان سے اس وقت لکھا تھا جب رسالہ ''بنیاد'' (ممبئی) کی جانب سے ''جشن یوسف ناظم'' منایا گیا تھا۔ غالباً یہ 1990ء کی بات ہے۔ اس جشن کے بعد 'بنیاد' کا یوسف ناظم نمبر، بھی خصوصی شمارے کی شکل میں شائع ہوا تھا۔ غالباً یہیں سے ف۔س۔ اعجاز نے مذکورہ مضمون ماہ نامہ انشاء (کلکتہ) کے 'یوسف ناظم نمبر' کے لئے منتخب کیا۔

یہاں ایک دل چسپ واقعے کا ذکر ناگزیر ہے۔ بات یوسف ناظم اور ناچیز کی ہے۔ اس لئے ضروری سمجھتی ہوں کہ قارئین کے لئے کچھ وضاحت کرتی چلوں۔ میری اس تحریر میں یوسف ناظم کے ایک مزاحیہ مضمون ''مرزا

غالب کی صحت جسمانی'' کے کچھ حوالے دئے گئے تھے۔ ایک اقتباس یہ بھی تھا۔

''غالب نے اپنے بیش تر اشعار میں اپنی صحت کا ذکر کیا ہے اور ان کے اشعار کے ذریعے اس اطلاع کے ملنے پر کہ غالب عمر بھر بیمار رہے، ایک عقیدت مند کو واقعی قلق ہوتا ہے۔ کیونکہ خود غالب نے کہا ہے۔

تنگ دستی اگر نہ ہو غالب
تندرستی ہزار نعمت ہے

مرزا غالب کی اس صحت جسمانی کو دیکھتے ہوئے یہ امر لازم ہو جاتا ہے کہ ''نئی یادگار غالب'' مرتب کی جائے۔'' (بحوالہ مرزا غالب کی صحت جسمانی از یوسف ناظم)

اقتباس یہاں پر ختم ہوتا تھا اور اپنے مضمون کا تسلسل قائم رکھتے ہوئے میرا اگلا جملہ کچھ یوں تھا۔

''اور یوسف ناظم اس نیک کام میں دیر نہیں کرتے۔ بلکہ تن دہی سے اس کی تکمیل میں جٹ جاتے ہیں۔'' نئی یادگار غالب'' میں یوسف ناظم نے نہ صرف مزاح یا ظرافت ہی سے کام لیا ہے بلکہ صحیح معنوں میں تنقید کا حق ادا کر دیا ہے۔'' (بحوالہ یوسف ناظم کی غالب شناسی اور ظرافتی تنقید از رفیعہ شبنم عابدی)

اتفاق سے یوسف ناظم کے درج بالا اقتباس کے آخر میں اختتامی واوین ('' '') کی کتابت مفقود ہو گئی۔ (۔۔ثابت ہوا ہے گردن مینا پہ خون خلق!) بعض قارئین نے اسے میرے مضمون کے جملے سے جوڑ کر پڑھا اور از خود یہ فیصلہ کر لیا کہ مذکورہ شعر کو مرزا غالب سے منسوب کرنے کی ناقابل معافی حرکت کر کے ناچیز نے اپنی جہالت اور کم علمی کا ثبوت دیا ہے اور شاید کچھ اعتراضات ہوئے۔ شاید اس لئے لکھ رہی ہوں کہ جب یہ مضمون شائع ہوا، میں ہندوستان میں نہ تھی۔ امریکہ میں تھی۔ مجھے اس ستم ظریفی کی مطلق خبر نہ تھی۔ اتفاق سے ایک خط ممبئی کے پتے پر سلیم بنگلور صاحب کا آیا جسے میری بیٹی سیماب سید نے اسکین کر کے میرے ای میل پر ڈال دیا۔ خط بڑے سلیقے سے بہت ہی مہذب اور شائستہ انداز میں تحریر کیا گیا تھا جس کو پڑھ کر اندازہ ہوا کہ سلیم بنگلور صاحب ایک پڑھے لکھے شخص ہیں اور باذوق باعلم اور باخبر بھی۔ میری خوش قسمتی کہ خط جس لیٹر ہیڈ پر لکھا گیا تھا، اس پر ان کا فون نمبر بھی درج تھا۔ میں نے امریکہ ہی سے انہیں فوراً فون لگایا اور وضاحت کی کہ جس شعر کا حوالہ آپ دے رہے ہیں، اول تو وہ میری تحریر کا حصہ نہیں، یوسف ناظم کے مضمون ''مرزا غالب کی صحت جسمانی'' کا اقتباس ہے۔ رہ گیا سوال میری کم علمی کا۔ تو یہ ہیچ مدان لاکھ جاہل سہی' نادان سہی، کم علم سہی، غالب کی سخن فہم نہ سہی، سخن ناشناس طرفدار ہی سہی، لیکن اتنا شعور تو رکھتی ہے کہ غالب کی افتاد طبع اور رنگ کلام کو پہچان سکوں۔ پھر قربان علی بیگ سالک، شاگرد غالب کے شعر کو ان کے استاد سے کیسے منسوب کر دیتی جب کہ اس شعر سے (اور سالک علی کے حوالے سے) میری ملاقات ہائی اسکول کے زمانے میں ہی زبان دانی دوسرے پرچے کی رہنمائی کے لیے حکومت کی جانب سے لکھی گئی ایک کتاب ''اردو کمپوزیشن اور گرامر'' کے ایک مضمون کے توسط سے ہوئی تھی جس میں مضمون نویسی کے ضمن میں اسی عنوان سے ایک مضمون شامل تھا جس کے اخیر میں قربان علی سالک کے حوالے سے ہی یہ شعر بھی درج تھا۔ نیز یہ کہ ساری دنیا جانتی ہے کہ مرزا قربان علی بیگ سالک کا شمار مرزا غالب کے ان چند ممتاز شاگردوں میں ہوتا ہے

جن کو مرزا سے کافی طویل مدت تک قرب اور استفادے کا موقع ملا۔ اس کا ثبوت مرزا غالب کا وہ خط ہے جو انھوں نے ۱۶ر ستمبر ۱۸۶۳ء کو میر مہدی مجروح کے نام لکھا ہے اس عبارت کے ساتھ۔ کہ

''تن درستی ہزار نعمت ہے! ہائے! پیش مصرعہ مرزا قربان علی بیگ سالک نے کیا خوب بہم پہنچایا ہے، مجھ کو پسند آیا ہے۔

تنگ دستی اگر نہ ہو سالک
تن درستی ہزار نعمت ہے''

نکتہ یہ بھی ہے کہ سالک حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ پھر اپنے والد کے ساتھ چھ سال کی عمر میں دہلی چلے آئے جہاں مرزا غالب سے ان کی صحبت رہی۔ اور پھر ایک عرصے بعد حیدر آباد تشریف لائے اور نواب عماد الملک کی وساطت سے صیغۂ سر رشتہ داری کی خدمات پر مامور ہوئے۔ حیدر آباد ہی میں ان کی علمی و ادبی سرگرمیاں آخر دم تک (۱۸۸۱ء) جاری رہیں۔ خود یوسف ناظم کا تعلق بھی حیدر آباد سے بہت گہرا رہا۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ سالک اور اُن کے اس مشہور زمانہ شعر سے واقف نہ ہوتے؟ اپنی تحریروں میں قدم قدم پر غالب کے اشعار Quote کرنے والا یوسف ناظم جیسا سینیئر ادیب اور ممتاز ظرافت نگار اس قسم کی فاش غلطی ہرگز نہیں کر سکتا۔ شعر سالک کا ہی ہے لیکن انھوں نے ازراہِ ظرافت غالب سے منسوب کر دیا ہے تا کہ ''مرزا غالب کی صحتِ جسمانی'' کے تعلق سے قارئین اس کا لطف لے سکیں۔ سلیم بنگلوری صاحب تو میری اس گفتگو سے مطمئن ہو گئے اور معذرت چاہی۔ مگر میں نے دوسرے دن امریکہ ہی سے ناظم صاحب کو فون لگا کر تمام واقعہ سنایا۔ سُن کر محبت سے بولے۔

''آخر آپ ہر مرتبہ میری ڈھال کیوں بن جاتی ہیں؟'' پھر گویا ہوئے۔ ''اچھا ہوا آپ نے صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ میں کل ہی ف۔س اعجاز کو بذاتِ خود اس کے بارے میں لکھ کر اس اعتراض کی تردید کر دوں گا۔ اطمینان رکھیے۔ آپ پر حرف نہیں آئے گا۔ میں جانتا ہوں آپ ایک پڑھی لکھی خاتون ہیں۔''

ہائے اللہ! من آنم کہ من دانم۔ میکہ ہیچ ندانم بہر حال وہاں امریکہ میں میرے پاس نہ ''انشاء'' تھا، نہ 'انشاء' کا پتہ۔ میں براہِ راست کوئی جواب ف۔س۔ اعجاز کو بھجوا نہ سکی۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ کون سے حضرات نے اور کیا اعتراضات کیے تھے۔ اور ناظم صاحب نے اس کا کیا جواب دیا۔ البتہ چھ ماہ بعد جب میں ہندوستان لوٹی اور ناظم صاحب کو فون کیا تو سب سے پہلے میں نے اسی معاملے کے متعلق استفسار کیا۔ اور انھوں نے کہا۔ ''ہاں اعتراضات تو آئے تھے۔ لیکن میں نے جواب دے دیا۔'' میں نے کہا۔ ''اگر آپ کے پاس 'انشاء' کا مذکورہ پرچہ ہو تو مجھے دے دیجئے۔ میں بذاتِ خود یہ اعتراضات جاننا اور جواب دینا چاہتی ہوں۔'' کہنے لگے۔ ''ڈھونڈنا پڑے گا۔ آپ خود اعجاز صاحب کو خط لکھیے۔ آدمی مخلص ہیں ضرور آپ کو وہ پرچہ بھجوا دیں گے۔ لیکن مجھے کیا پتہ کہ اس سے قبل ہی وہ اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گے اور جب فرشتۂ اجل ان پر وار کرے گا تو میں ان کی ڈھال بھی نہ بن سکوں گی۔

میں ان کی ڈھال تھی یا نہ تھی لیکن وہ میرے لیے ایک بڑی طاقت ضرور تھے۔ میری تخلیقات کو ہمیشہ سب سے پہلے اُنھی کی پذیرائی کا سہارا ملا۔ میں نے اپنی کتاب پر بہت کم تبصرے لکھوائے لیکن ان کے خلوص کا یہ عالم تھا کہ میری ہر بات پر بغیر بولے خود ہی تبصرہ فرماتے تھے۔ ایک دلچسپ بات یہ تھی کہ وہ میرے حریفوں اور میرے مخالفین کو ''میرا دوست'' کہہ کر پکارتے تھے۔ جب کبھی میرا ذکر یہ بدی ہوتا تو مجھ سے فرماتے۔ ''آپ کے فلاں دوست کل آپ کی مدح میں رطب اللسان تھے۔'' کبھی کہتے۔ ''آپ بھی دوستوں کی تعداد بڑھانے میں کسر نہیں چھوڑتیں۔ دیکھیے آپ کے فلاں دوست نے آپ کی شان میں یوں زورِ فصاحت دکھایا ہے۔ افسوس ہوا۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا'' وغیرہ وغیرہ اور پھر مجھے تنبیہہ کرتے ''دراصل غلطی سراسر آپ کی ہے۔ آپ کو بھی تو مصلحت کوشی نہیں آتی۔ ہمیشہ اُپنی تلوار بن جاتی ہیں۔ دیکھیے حریف کتنا ہی شاطر سہی، آپ کو حکمت عملی سے کام لینا چاہیے۔ خصوصاً اس لیے کہ آپ ایک خاتون ہیں۔ اپنی فطرت کی کجی کو کم کیجئے۔ اور مرد معاصرین کے آگے سرنگوں ہو جائیے یا ہم رنگ ہو جائیے پھر دیکھیے آپ ہندوستان کی بلکہ اردو دنیا کی ایک بڑی شاعرہ اور ادیبہ ہونگی۔ ان کی اسی بات سے متاثر ہو کر ایک نثری نظم کہی تھی۔'' کربِ خود آگہی'' جو میرے شعری مجموعے ''اگلی رُت کے آنے تک'' میں شامل ہے۔ ایک مرتبہ جھنجھلا کر بولے۔

''مجھے معلوم ہے آپ بدلنے والی نہیں۔ آپ بدلیں نہ بدلیں، آپ کے ''دوست'' تو آپ سے بدلہ لے سکتے ہیں''

رعایت لفظی سے معنی آفرینی کا کام لینے کا یہ فن یوسف ناظم کی تحریروں ہی کا نہیں گفتگو کا بھی خاصہ تھا۔

ان کی زندہ دلی کا یہ عالم تھا کہ مشاعرے کا اسٹیج ہو، مذاکرے کی محفل، سیاسی جلسوں کا مجمع ہو یا نجی مجلس...... یہاں تک کہ بستر علالت پر بھی ظرافت اور بذلہ سنجی سے باز نہ آتے تھے۔ غالباً ۲۰۰۳ء کی بات ہے۔ ضیق النفس نے ان پر زبردست حملہ کیا۔ تنفس میں دشواری ہوئی تو اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ اعزہ واقربہ پریشان مگر وہ ہیں کہ چہک رہے ہیں۔ ایک عندلیب ہزار داستان کی طرح داخلے کے وقت ڈاکٹر نے ان کی عمر پوچھی۔ چہک کر بولے۔ ''صرف ۲۸ سال کا ہوں'' اس وقت ان کی عمر ۸۲ سال کی تھی۔ انھوں نے ۸۲ کے ہندسے کو پلٹ کے رکھ دیا تھا۔ اور ڈاکٹر کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اپنے سر پر ڈھنکی ہوئی روئی کا منوں بوجھ اٹھائے پھرنے والا یہ ظریف ضعیف، دل سے اب بھی جوانِ رعنا و توانا ہے۔ آج سوچتی ہوں، کاش ۸۸ کا عدد دو تین سال اور بڑھ جاتا۔ ۹۱ بن جاتا اور یوسف ناظم ۱۹ سال کے نوجوان کی طرح شوخیاں بکھیرتے۔ مگر افسوس قسام ازل نے انھیں اس عدد کو پلٹنے کا موقع فراہم نہیں کیا اور وہ موت کو 'ایک اور چکمہ' نہیں دے سکے۔ کیوں کہ ۸۸ پلٹ کر بھی ۸۸ ہی بنا رہا۔ کیا ہی مزہ آتا اگر وہ اپنی جوانی کو پلٹ آنے پر مجبور کر دیتے اور زلیخائے اجل ہاتھ ملتی رہ جاتی۔ اے وائے، یہ بلبلِ ہزار داستان چُپ کیا ہوا، لگا کہ۔　ع

خاموش ہوگیا ہے چمن بولتا ہوا

☆

ڈاکٹر شیخ رحمٰن اکولوی

یوسف ناظم صاحب کچھ یادیں کچھ باتیں

عام طور پر جس عمر میں نوجوانوں کو فلم اسٹارز سے ملاقات کرنے کا اشتیاق ہوتا ہے مجھے اُردو کے نامور قلم کاروں سے ملنے کا شوق تھا۔ جب یوسف ناظم صاحب سے ملنے کی خواہش پیدا ہوئی اُن دنوں میرے منی افسانوں کا مجموعہ ''عکسِ شعور'' (۱۹۷۸ء) شائع ہو چکا تھا۔ میں نے اس کی جلد یوسف ناظم صاحب کو روانہ کر دی۔ مجھے قطعی امید نہیں تھی کہ کوئی Responce ملے گا مگر خلاف توقع یوسف ناظم صاحب کا ''خط ملا'' آپ کا'' عکسِ شعور اسی وقت پڑھ لیا تھا۔ ان منی کہانیوں میں بعض بعض جگہ تو آپ نے بڑی میکسی باتیں کہہ ڈالی ہیں۔ پتہ نہیں جب آپ بڑی کہانیاں لکھیں گے تو کیا کریں گے۔'' اس خط سے میری حوصلہ افزائی ہوئی۔ ساتھ ہی آنجناب سے ملاقات کی راہ بھی ہموار ہوگئی۔ ایک دن میں اور شکیل اعجاز ممبئی کیلئے روانہ ہوئے۔ سوچا یوسف ناظم صاحب سے ملاقات کے ساتھ ساتھ ممبئی کی سیر بھی ہو جائے گی۔ جب ہم لوگ ان کے دولت کدہ پر پہنچے تو سہ پہر کا وقت تھا۔ بڑے تپاک سے ملے۔ چونکہ ہمارے پروگرام میں ممبئی کی سیر کرنا بھی تھا لہٰذا ہمارے پاس کیمرہ بھی تھا۔ رسمی بات چیت اور چائے نوشی کے بعد ہم نے ان سے تصویر کھنچوانے کی گزارش کی۔ ان کے چہرے کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ تصویر کھنچوانے کے موڈ میں نہیں ہیں لیکن ہمارا دل رکھنے کیلئے راضی ہوگئے ہیں اس وقت وہ کرتا پاجامہ پہنے ہوئے تھے۔'' میں ابھی حاضر ہوا'' کہہ کر وہ اندرونی کمرے میں چلے گئے اور جلد ہی واپس آگئے۔ انہوں نے کرتے کے اوپر کوٹ پہن لیا تھا۔ وہ صوفہ پر بیٹھتے ہوئے شکیل اعجاز صاحب سے بولے'' کلوز اپ لیجئے گا' پاجامہ فوٹو میں نہ آنے پائے۔'' شکیل اعجاز نے دو بار کیمرہ کلک کیا اور دو تصویریں کیمرے میں محفوظ ہوگئیں۔ اس کے بعد میں نے کیمرہ سنبھالا اور یوسف ناظم صاحب کے ساتھ شکیل اعجاز کی ایک تصویر کھینچی۔ بعد میں شکیل اعجاز صاحب نے بتایا کہ انہوں نے حضت کی ایک تصویر پاجامہ سمیت بھی لے لی ہے۔ (یہ تصویر ان کے پاس محفوظ ہے۔)

اس ملاقات کے بعد یوسف ناظم صاحب سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک رشتہ قائم ہو گیا۔ جب انہوں نے میرے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کے پہلے مجموعہ کا مقدمہ لکھا تو اس رشتہ کو ایک نام بھی دے دیا۔ وہ رقمطراز ہیں'' شیخ رحمٰن اکولوی میرے دوست ہیں وہ بھی نئے نئے۔ اس لیے میں نہیں چاہتا کہ میری تحریر پڑھ کر آپ ان کی چابکدستی کے بارے میں کوئی غلط رائے قائم کریں' بلاعنوان'' اس وقت آپ کے ہاتھوں میں کنگن کی طرح ہے اور کنگن کو آئینے میں نہیں دیکھا جاتا۔''

یوسف ناظم صاحب باغ و بہار طبیعت کے مالک تھے۔ اکولہ میں مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکیڈمی کی

جانب سے ''مہاراشٹر میں اردو طنز ومزاح کا آغاز وارتقاء'' کے موضوع پر سیمینار ہوا تو جب بھی موقع ملا محفل کو زعفران زار بناتے رہے۔ایک دعوت میں شوربہ میں تیرتی ہوئی سالم مرچوں کو دیکھا تو پوچھا یہ کیا ہیں ؟ کسی نے جواب دیا ''مرچیں'' قاب سرکاتے ہوئے بولے ''ظ انصاری صاحب کو ان کی زیادہ ضرورت ہے'' سب لوگ ہنسنے لگے۔ظ۔انصاری صاحب بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔سیمینار کے اختتام پر مہمانوں کے فوٹو کھینچنے کیلئے میکرہ مین نے کیمرہ سنبھالا تو یوسف ناظم بولے ''پہلے یہ بتادیجئے کہ مسکرانا کس کو ہے۔'' جب مہمانوں کے ساتھ مقامی حضرات نے فوٹو کھنچوانے شروع کیے اور فوٹو گرافر جلدی جلدی فوٹو کھینچنے لگا تو بولے۔''بھیا! کیمرہ مین فلم تو ہے نا ؟ '' جب ایک کاتب صاحب سے ظ انصاری صاحب نے ہاتھ ملایا تو بولے'' آپ کے ہاتھ میں دَم ہے۔کتابت کرنے کے لئے ہاتھ میں دَم ہونا چاہیئے۔'' یوسف ناظم صاحب جو اتفاق سے ظ صاحب کے پیچھے ہی کھڑے ہوئے تھے بولے'' ظ صاحب زمانہ قدیم سے صنفِ نازک بھی کتابت کرتی چلی آرہی ہیں۔'' ظ انصاری صاحب ان کی بات ان سُنی کر کے آگے بڑھ گئے۔یوسف ناظم صاحب اور ظ انصاری صاحب کے درمیان نوک جھونک چلتی رہتی تھی۔زندہ دِلانِ ممبئی اور مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکیڈیمی کے زیرِ اہتمام محفلِ طنز ومزاح میں جو ۱۷/مارچ ۱۹۹۰ء کو محترمہ عصمت چغتائی کے زیرِ صدارت منعقد ہوئی تھی اور جس میں راقم الحروف نے بھی شرکت کی تھی۔ظ انصاری صاحب نے جب بھی موقع ملا یوسف ناظم صاحب کو گھیرا۔اس وقت یوسف ناظم صاحب اکیڈیمی ہٰذا کے ممبر یا سکریٹری تھے۔یوسف ناظم صاحب نے جب ۱۲:۳۰ /بجے پہنچنے کا اعلان کیا تو انصاری صاحب نے آواز لگائی ''یہ شرفاء کے لنچ کا وقت نہیں ہے'' اس محفل میں منشی محمد حسین صاحب نے ''حج'' سے متعلق طنزیہ پڑھا تو بار بار مائک بند ہونے لگا۔انصاری صاحب نے جملہ کسا'' یوسف ناظم صاحب آپ حاجیوں پر طنز کرواتے ہیں اس لیے مائک بار بار بند ہو رہا ہے۔اللہ کی لاٹھی میں آواز نہیں ہوتی۔''

یوسف ناظم صاحب میرے پسندیدہ قلمکار رہے ہیں ان کی ظریفانہ نگارشات پڑھ کر لگتا ہے کہ جیسے ایک معصوم بچّہ اپنے دوست کو کسی چیز کی اوٹ سے چھوٹی چھوٹی کنکریاں مار کر چھیڑ رہا ہے اور خوش ہو رہا ہے۔کھیل کا کھیل اور دوست کو چوٹ لگنے کا ڈر بھی نہیں۔ان کے مزاج کی برجستگی' شوخی' شرارت' معصومیت اور شرافت ان کے فن کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

یوسف ناظم صاحب کی تحریروں میں قوسین کی بہتات ہوتی تھی۔قوسین کے دلچسپ اور پر مغز فقرے کبھی پھلجھڑیوں کا سماں باندھتے تو کبھی بوندا باندی کا فرحت بخش احساس عطا کرتے۔آج میں ان کے نام کے ساتھ قوسین میں (مرحوم) لکھ رہا ہوں تو کلیجہ منہ کو آرہا ہے۔ان کی موت میرا ذاتی نقصان ہے۔اس موقع پر میں خود کو پُرسے کا مستحق سمجھتا ہوں۔اُنتیس برس پہلے ان سے جو رشتہ بن گیا تھا' وہ ہمیشہ بنا رہے گا۔کیوں کہ موت انسان کو مار سکتی ہے رشتوں کو ختم نہیں کر سکتی۔اس دعا پر اپنی بات ختم کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو ہمیشہ اپنے رحم و کرم کے قوس میں رکھے آمین۔

پروفیسر خالد محمود
شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی۔۲۵

یادِ رفتگاں

قحط الرّجال میں ایک انسان کی موت

بلاشبہ پروفیسر ظفر احمد نظامی صاحب کی موت سے شاعری، افسانہ نگاری، انشائیہ نگاری، خاکہ نگاری، ترجمہ نگاری، سوانح نگاری اور معلمی سبھی کو نقصان پہنچا ہے۔ مگر اس قحط الرجال میں سب سے بڑا نقصان ''انسان'' کا ہوا ہے۔ اس انسان کا جس کے بارے میں غالب نے کہا تھا۔

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

اس عہد ناپرساں میں ہر شخص صرف اپنے لئے زندگی گذارنے پر مصر ہے، نظامی صاحب دوسروں کے لئے جیتے تھے۔ میں نے ہمیشہ انہیں دوسروں کے کام آتے یا کسی نہ کسی کی سفارش کرتے ہوئے پایا۔ انکار کرنا جیسے انہیں آتا ہی نہ تھا۔ بڑا سلجھا ہوا مزاج پایا تھا۔ نہ کسی سے کوئی شکوہ نہ شکایت نہ غصہ، نہ برہمی، نرم گفتار، نرم رفتار، چہرے پر ہر وقت ایک معصوم سی مسکراہٹ کھلتی رہتی جس پر کبھی شوخی کا رنگ غالب آجاتا۔ مروت کے ایسے پتلے کہ زبان سے کبھی لفظِ انکار نہیں نکلا۔ کام کی نوعیت کچھ بھی ہو ان کے منہ سے صرف ''ہوجائے گا'' سننے کو ملتا۔ ''ہوجائے گا'' ان کا تکیہ کلام بن گیا تھا۔ کسی نے کہا نظامی صاحب آسمان میں سوراخ کرنا ہے جواب ملتا ''ہوجائے گا'' کوئی کہتا بچوں کے لئے چاند تاروں کی ضرورت ہے، انتظام ہوجائے گا۔ آواز آتی ''ہوجائے گا'' اور لطف کی بات یہ ہے کہ ہو بھی جاتا۔ وہ نیکی کرتے اور گہرے کنویں میں ڈال کر خود تو بھول ہی جاتے جس کے ساتھ نیکی کی ہوتی وہ بھی بھول جاتا۔

نظامی صاحب عرصۂ دراز تک جامعہ اکیڈمک اسٹاف کالج کے ڈائرکٹر رہے۔ ان دنوں یہ کالج مکتبہ جامعہ کی پرانی عمارت سے ملحق ہوا کرتا تھا اور مکتبہ جامعہ شاہد علی خان نامی ایک جن کے قبضے میں تھا۔ کام کے معاملے میں نظامی صاحب بھی کسی جن سے کم نہ تھے۔ مگر دونوں میں دوستی کا رشتہ قائم نہیں ہوا تھا اس کا آغاز بعد میں ہوا۔ مکتبہ میں دنیا بھر کے شاعر و ادیب آتے رہتے۔ شاہد صاحب کبھی کسی کے اعزاز میں کوئی جلسہ یا نشست کرنے کا ارادہ کرتے تو انتظام اور مشورے میں ازرہ خالد نوازی مجھے بھی شامل کرلیتے۔ مکتبہ میں کوئی ہال نہ ہونے کی وجہ سے ہمیشہ جگہ کی تنگی کا احساس رہتا۔ موسم اچھا ہوتا تو مکتبہ کا لان کام آجاتا۔ مگر دلی میں اچھا موسم ہر وقت کہاں ہوتا ہے چنانچہ ہمیں کئی پروگراموں سے دست کش ہونا پڑتا۔ ایک دن میرے دماغ میں آئی کہ مکتبہ جامعہ اور اکیڈمک اسٹاف کالج کے اشتراک سے یہ مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔ میں نے اسی وقت شاہد صاحب کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ ہم اپنے کچھ پروگرام اکیڈمک اسٹاف کالج کے ہال میں کراسکتے ہیں۔ شاہد صاحب کی منظوری کے بعد جب یہی تجویز میں نے نظامی صاحب کے سامنے رکھی تو انہوں نے پرزور تائید کے ساتھ اپنی مسرت کا اظہار کیا اور اپنا

تکیہ کلام دہرایا۔ اس دن کے بعد سے اکیڈمک اسٹاف کالج میں ایک سے ایک ادبی اور ثقافتی پروگرام منعقد ہوا۔ اسی کے ساتھ دونوں جنات کے درمیان ایسی گہری اور پائیدار دوستی کا رشتہ قائم ہوگیا کہ نظامی صاحب کی موت کے علاوہ اسے کوئی اور نہ توڑ سکا۔ بلکہ موت نے بھی کہاں توڑا۔ دوستی کا رشتہ تو اب بھی مضبوط ہے اور ہمیشہ مضبوط رہے گا کوئی بعید نہیں کہ جنت میں بھی یہ دونوں مل کر ادبی جلسوں کی داغ بیل ڈال دیں۔ برادرم نعمان خان نے اپنے مضمون میں جس یادگار پروگرام کا ذکر کیا ہے وہ اسی سلسلہ دراز کی ایک کڑی تھا۔ اسی طرح تمثیلی مشاعرہ، جو جامعہ کی ایک قدیم ادبی روایت ہے، جب میرے سپرد کیا گیا تو میں نے اس میں کیف بھوپالی، تاج بھوپالی، اور شعری بھوپالی کو متعارف کرانے کا ارادہ کرلیا اپنے اس ارادے کا نظامی صاحب کے سامنے ذکر کرتے ہوئے مشورتاً پوچھا کہ ان بھوپالی شعرا کی تمثیل کس سے کرائی جائے۔ کیا یہ ارادہ پورا ہوگا فوراً بولے ضرور ہوگا اور پھر سب نے دیکھا کہ انہوں نے کیف صاحب اور تاج صاحب کی بڑی اچھی تمثیل خود ہی کرڈالی اسی تمثیل سے حوصلہ پاکر گذشتہ برس میں نے جامعہ کا تمثیلی مشاعرہ غالبؔ کی صدارت میں کرایا۔ غالبؔ کی تمثیل شاہد میر نے پیش کی۔ میک اپ میں شاہد میر ہو بہو غالبؔ نظر آرہے تھے انہوں نے غالبؔ کی غزل ''میں ہوں مشتاق جفا مجھ پہ جفا اور سہی'' راگ جھنجھوٹی میں پڑھ کر سامعین کا دل جیت لیا تھا۔ نظامی صاحب اچھے فن کار بھی تھے اور اچھے قلم کار بھی مگر بحیثیت انسان وہ ایک ایسی کتاب تھے جس کا ہر باب محبت کی روشنائی سے رقم کیا گیا تھا۔ منصب کے اعتبار سے نظامی صاحب، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں سیاسیات کے پروفیسر تھے اور اپنے سبجکٹ میں کامل دستگاہ بھی رکھتے تھے مگر انہیں اردو زبان وادب سے جو گہری رغبت، مناسبت اور وابستگی تھی اس کا ثبوت پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ادب کا ہر سنجیدہ طالب علم ان کے علمی اور ادبی کارناموں سے واقف ہے۔ ان کے افسانے، شاعری اور مضامین رسائل وکتب میں اور رسائل وکتب لائبریریوں میں موجود ہیں۔ ان مطبوعات کے علاوہ بھی وہ اردو کے فروغ کے لئے ہمیشہ سرگرم عمل رہے۔ مکتبہ جامعہ کے اشتراک سے اردو پروگراموں کے انعقاد کا ذکر اوپر آچکا ہے اب ایک دلچسپ واقعہ بھی سن لیجئے اس کا تعلق اسی دور سے ہے جب نظامی صاحب اکیڈمک اسٹاف کالج کے ڈائرکٹر تھے۔ ایک دن مجھے فون کرکے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ بہت مہذب اور پر خلوص انسان تھے۔ اس محبت سے بلاتے کہ کسی کو بلائے جانے کا احساس نہ ہو۔ گرمیوں کی دوپہر تھی مگر میں فوراً پہنچ گیا مسکرا کر بولے مجھے یقین تھا آپ ابھی آجائیں گے۔ تواضع کا سلسلہ جوان کا معمول تھا میرے پہنچتے ہی شروع ہوگیا کہنے لگے اورینٹیشن پروگرام میں باہر سے آئے ہوئے کچھ غیر مسلم اساتذہ کو اردو سیکھنے کا شوق ہے ان کی خواہش ہے کہ اگر کوئی اردو سکھانے والا مل جائے تو وہ اس کورس کے دوران ہی اردو سیکھ لیں۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ اردو سیکھنے کے لئے جامعہ سے بہتر جگہ اور اس سے اچھا موقع شاید انھیں پھر کبھی نہ مل سکے۔ پھر فرمایا کہ یہ کلاس ٹائم ٹیبل سے علیحدہ، لنچ کے بعد ڈھائی تین بجے ہوسکتی ہے اور جیسا کہ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس کا کوئی معاوضہ بھی نہیں ہے اسی لئے میں نے آپ کو زحمت دی ہے میں نے کہا بھائی جان! آپ کے اس اعتبار کا شکریہ! مجھے اردو پڑھنے کے شوقین لوگوں کو اردو پڑھانے کا خود بھی بڑا شوق ہے۔ اور اس کے لئے میں کسی بھی وقت حاضر ہوسکتا ہوں۔ رہا معاوضہ کا سوال تو اردو پڑھانے میں

جو لطف آتا ہے اور جو مسرت حاصل ہوتی ہے وہ خود اس کا معاوضہ ہے۔ اس دوران پڑھنے کے شوقین بھی جمع ہو چکے تھے۔ نظامی صاحب نے فرمایا تو پھر کل سے شروع کر دیجئے۔ میں نے کہا یہ لوگ چاہیں تو میں آج ہی سے تیار ہوں۔ میرے اس جواب سے وہ بہت خوش ہوئے اور اردو پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ اسی دن سے شروع ہو گیا۔ ابتدا میں ایک آدھ استاد نے اردو کے چند حروف کی یکساں آواز پر سوال اٹھا دیا تو میں نے انہیں سمجھایا کہ ہر زبان کا اپنا مزاج، اپنی تہذیب اور اپنا پس منظر ہوتا ہے اور اسی سے اس کی پہچان بنتی ہے مہندی میں بھی یہ صورت موجود ہے میں نے مثالیں دے کر بتایا۔ وہ مطمئن ہو گئے اور سیکھنے سکھانے کا عمل جاری رہا۔ اردو سیکھنے میں ان حضرات نے ایسی دلچسپی دکھائی اور اس قدر ذوق وشوق اور جوش وخروش کا مظاہرہ کیا کہ دو دو گھنٹے کلاس چلتی رہتی اور وہ دو دن کے کام ایک ہی دن میں کرلاتے۔ ان کے شوق کو دیکھ کر مجھے بہت مسرت ہوئی۔ صرف دو ہفتے کے بعد میں املا بول رہا تھا اور وہ لکھ رہے تھے۔ انہوں نے جس رفتار سے اردو سیکھی وہ میری زندگی کا خوشگوار تجربہ تھا۔ الوداعی جلسے میں مختلف مضامین کے ان اساتذہ نے سب سے زیادہ خوشی کا اظہار اردو سیکھنے پر کیا۔ وہ سب کے سب اکیڈمک اسٹاف کالج، اس کے ڈائریکٹر نظامی صاحب اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اس احسان کا کھلے دل سے بار بار اعتراف کرتے رہے کہ یہاں آکر ان کی ایک دیرینہ آرزو پوری ہو گئی۔ نظامی صاحب ان سے زیادہ خوش نظر آ رہے تھے۔ گویا ان کی بھی کوئی بہت بڑی مراد پوری ہوئی ہو۔ اردو سکھانے کا اس سے بڑا معاوضہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ نظامی صاحب کے عہد میں دو تین سال یہ سلسلہ جاری رہا پھر بوجوہ بند ہو گیا۔ اسی طرح وہ عمر بھر اردو کی خدمت کرتے رہے ان کی زندگی غالب کے اس مصرع کی مصداق تھی جس میں غالب نے دعویٰ کیا تھا۔ ع

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا

حالانکہ غالب کو تو ستائش کی تمنا بھی تھی اور صلے کی پروا بھی مگر نظامی صاحب کو واقعی نہ تھی وہ خاموشی سے اپنے کام میں لگے رہتے۔ مستقل کوئی نہ کوئی وظیفہ پڑھنا یا لکھنے پڑھنے میں مشغول رہنا بس یہی ان کا شعار زندگی تھا۔ زندگی کے دوسرے وظائف پر بھی وہ ذوق وشوق سے عمل پیرا ہوئے مگر اولیت کا شرف کتاب وقرطاس وقلم ہی کو حاصل تھا۔ محبت ان کے مزاج کا بنیادی وصف تھا، جس میں خوش مزاجی اور خوش مذاقی کی دھنک رنگی ہمہ وقت اپنی چھب دکھاتی رہتی محبت کے ہلکے اور گہرے نقوش ان کے قطعات میں زیادہ واضح اور صاف دکھائی دیتے ہیں۔ ان قطعات میں عشق کی لگاوٹ بھی ہے۔ فن کی بناوٹ بھی، وصل کی لذت بھی، ہجر کا سوز بھی، ملاقات کی آرزو بھی ہے یادوں کی کسک بھی۔ جب وہ ان قطعات کو اپنے مخصوص انداز میں چٹخارے لے لے کر پڑھتے تو ان کی آنکھوں میں خاص قسم کی چمک عود کر آتی تھی۔ چند قطعات یہ ہیں۔

ایک حقیقت ہو، ایک مورت بھی
پیار ہو پیار کی ضرورت بھی
ہائے کس نام سے پکاروں میں
تم جواں بھی ہو، خوبصورت بھی

آج ساری فضا نشیلی ہے
تیری نظروں سے زندگی لی ہے
سارے غم غرق ہوگئے ساقی
میں نے شاید شراب پی لی ہے

آج کل میری حال خستہ پہ
جانے کیوں آپ کی نوازش ہے؟
آپ اور مہربان ہوجائیں؟
بالیقین اس میں‌کوئی سازش ہے

جگمگاہٹ ہی جگمگاہٹ ہے
زندگی میں خوشی کی آہٹ ہے
اچھا اچھا! سمجھ رہا ہوں میں
تیرے ہونٹوں پہ مسکراہٹ ہے

یہ کوئی پیش وپس کی بات نہیں
ایک یا دونفس کی بات نہیں
آپ کو اور بھول جاؤں میں
بس یہی میرے بس کی بات نہیں

آرزو، درد، اشک، تنہائی
میری ہی داستاں کے حصے ہیں
آج کل ہر حسین کے لب پر
میری بربادیوں کے قصے ہیں

دل میں جذبات کی حرارت تھی
حسن کی ہرادا شرارت تھی
جس جگہ آج غم کا مسکن ہے
اس جگہ عشق کی عمارت تھی

ایک مکمل حیات ہے اس میں
جذبۂ بے ثبات ہے اس میں
عشق کی وسعتیں نہ پوچھ اے دل
سچ یہ ہے کائنات ہے اس میں

زندگی غم میں کھوگئی اے دوست
درد میں جذب ہو گئی اے دوست
تو نہ آیا، نہ آسکا ہوگا
میری تقدیر سوگئی اے دوست

آج سوئے چمن گیا ہوں میں
نور کی طرح چھن گیا ہوں میں
اے خوشا وہ مرے مقابل ہیں
آئینہ خانہ بن گیا ہوں میں

حسن رنگیں نکھارنے والے
جذبۂ غم ابھارنے والے
مجھ کو الجھا کے رکھ دیا تو نے
اپنی زلفیں سنوارنے والے

تیری ان شعلہ رو اداؤں سے
ہر نظر خود سلگ گئی اے دوست
دل سے چنگاریاں سی اڑ گئی ہیں
برف میں آگ لگ گئی اے دوست

اپنی بیماری کے آخری دنوں میں نظامی صاحب کئی ماہ تک اسکورٹ ہاسپٹل کے آئی سی یو میں رہے۔ ان کی بیٹی کے علاوہ خالدہ صاحبہ نے ان کے بڑی خدمت کی۔ میں جب بھی ہاسپٹل گیا انہیں وہیں پایا۔ ایک مرتبہ نعیم کوثر صاحب کے ساتھ پہنچا تو ان کی اور خالدہ صاحبہ کی بدولت آئی سی یو میں بھی ان سے ملاقات کا موقع مل گیا۔ بہت کمزور ہو گئے تھے مگر حسب معمول مسکرا کر ملے اور الٹا میرا حال چال پوچھنے لگے۔ اللہ ان کے درجات بلند فرمائے

(آمین)

انسانی صفات میں صبر وتحمل اور برداشت کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ ساری خوبیاں نظامی صاحب کی شخصیت کا حصہ تھیں غصہ یا تو انہیں آتی ہی نہ تھا یا ضبط کی قوت زیادہ عطا ہوئی تھی کم از کم میں نے انہیں غصے میں آگ بگولہ ہوتے کبھی نہیں دیکھا حالانکہ آگ بگولہ ہونے کے ایک دو مواقع خود میرے سامنے ان کے آگے سے گزرے مگر کیا مجال ''ناگفتی'' ایک حرف بھی ان کی زبان پر آیا ہو۔ وہ میرؔ کی طرح ''پراگندہ طبع'' نہ تھے بلکہ ''حلیم الطبع'' اور ''سلیم الطبع'' تھے۔ ع:

''افسوس ان سے میرؔ کو صحبت نہیں رہی''

بیاد پروفیسر ظفر احمد نظامی

یہ رہگذر یہ درو بام یہ بازار یہ ہاٹ
یہ محفلیں یہ نشستیں یہ دوستوں کا ہجوم

یہ بھاگتے ہوئے لمحے یہ روز و شب کا فسوں
یہ طاق عشق پہ رکھی ہوئی کتاب جنوں

نہ جانے گریہ کناں کس لیے ہیں چاروں طرف
دھواں دھواں یہ مناظر تھکے تھکے یہ چراغ

وہ ایک شخص جو زندہ تھا دوسروں کے لیے
جو ابر بن کے کڑی دھوپ میں نکلتا تھا

بصد خلوص ہر اک راہرو سے ملتا تھا
وہ جس کی ذات سے روشن تھی رہگذار ادب

وہ جس کے خامۂ خوش رنگ میں چمکتے تھے
خطوط چہرۂ ارباب علم و فن کتنے

وہ جس کی شوخیٔ تحریر نے اجالے تھے
ورق ورق پہ مہکتی عبارتوں کے چراغ

وہ سو گیا ہے تو خاموش ہیں نظارے سب
نہ محفلیں ہیں نہ جلسے نہ بزم عیش و طرب

کہ کھو گئے ہیں سر جادۂ جنوں کے سراغ
دھواں دھواں ہیں مناظر بجھے بجھے ہیں چراغ

اقبال مسعود یادرفتگاں

احمد فراز۔سخن مشتاق ہے عالم ہمارا

قصہ ہے اس وقت کا جب دنیا کے شاندار لڑاکو نے بغیر اسلحہ اٹھائے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ داستان ہے اُن لمحات کی جب ڈھاکہ کی سرسبز زمین پر سرخ پرچم لہرایا تھا۔ کہانی ہے ان دنوں کی جب کراچی کی گلیوں میں اسٹیپ ٹریز رقص ہورہا تھا۔ سینما گھروں میں عریاں فلمیں 'سرکس' کے نام پر دکھائی جارہی تھیں، واقعہ ہے ان دنوں کا جب ایک ملک سلور جوبلی کا جشن منانے سے پہلے ہی دولخت ہوگیا تھا۔ انھی دنوں کی ایک افسردہ خزاں رسیدہ شام کو ناظم آباد میں واقع مشہور طنز و مزاح نگار، ناقد محقق، شاعر، مشفق خواجہ کے دولت کدے کی دوسری منزل پر واقع ڈرائنگ روم میں احمد فراز سے پہلی ملاقات ہوئی۔ مشفق خواجہ اور احمد فراز دونوں چپ چپ سے تھے، خاموشی اور گمبھیر ماحول میں تعارف کے بعد احمد فراز نے مشفق خواجہ سے میری وہاں آمد سے قبل ہونے والی گفتگو کا سلسلہ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''ہم ہمیشہ عوام کے ساتھ رہے اور اپنی شاعری سے جو کچھ کرسکتے تھے کیا۔ ویسے ہم کیا اور ہماری شاعری کیا ؎

بس ایک قلم ہے کہ جس کی ناموس
ہم فقیروں کا کل اثاثہ ہے آبرو ہے

احمد فراز جیسے اہم، مقبول اور ہردل عزیز شاعر کے منھ سے اس عجز وانکساری کی امید نہ تھی۔ میری دلچسپی ان کی ذات میں دوچند ہوگئی، پھر گفتگو کا سلسلہ چل نکلا، میں نے بات آگے بڑھانے کے لیے کہا۔ ''لوگ کہتے ہیں کہ آپ فیض احمد فیض کے نقش قدم پر گامزن ہیں۔ احمد فراز نے بڑی سادگی سے کہا کہ: لوگ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔ کچھ توقف کرکے گویا ہوئے۔ ''فیض صاحب کی اور میری عمر میں کوئی بیس بائیس سال کا فرق ہے۔ ایک بڑا شاعر جب کسی عہد میں ہوتا ہے تو اس کا اثر اور رنگ کچھ نہ کچھ ہر ایک قبول کرتا ہے۔ جہاں تک فیض کا سوال ہے تو ان کی شاعری نے سردار جعفری اختر الایمان اور مخدوم محی الدین تک کو متاثر کیا ہے۔ یہ اثر اس لئے ہے کہ ہمارے موضوع ایک جیسے تھے، زمانہ ایک تھا۔ ظلم، ناانصافی اور استحصال سے ہم سب دوچار تھے۔ مثلاً وہ فلسطین یا ویت نام پر نظم لکھ رہے ہیں تو ہم یہاں بیٹھ کر فلسطین پر سوچ رہے ہیں کیونکہ یہ موضوع صرف فیض کا نہیں، فراز کا بھی نہیں، یہ ساری دنیا کا موضوع ہے۔ ہم نے فیض صاحب کی زمینوں میں کچھ غزلیں کہیں، دلچسپ یہ کہ فیض صاحب نے بھی ہماری زمینوں میں طبع آزمائی کی۔ بھائی لوگوں کو شگوفہ ہاتھ آگیا۔ کہ فیض صاحب کی جھلکیاں ہمارے کلام میں بہت ملتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ فیض اور فراز میں بحیثیت فرد اور بحیثیت شاعر بھی بہت سی مماثلتیں تھیں۔ دونوں کے شعری رویوں کی تشکیل میں قدیم وجدید طرز سخن کا امتزاج تھا۔ دونوں کو ان کے ممالک کے صاحب اقتدار ہمیشہ

شک وشبہہ سے دیکھتے رہے۔ فیض نے بھی خودساختہ جلاوطنی اختیار کی اور ملکوں ملکوں پھرا مسافر، دونوں کو قید و بند کی اذیتیں برداشت کرنا پڑیں۔ دونوں کے حصے میں بے پناہ مقبولیت آئی۔ دونوں کے کلام میں غنائیت کا اس درجہ عمل دخل ہے کہ برصغیر کے عظیم گلوکاروں نے سر، ساز و لے سے ان کے کلام سجا کر ہواؤں میں خوشبو بکھیر دی دلوں کے تار چھیڑ دیے اور بادلوں کے دامن تھام کر یہ مہک سرحدوں کو عبور کرگئی۔ وہاب اشرفی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ فراز کی شاعری فیض سے مستعار ہے وہ غلط فہمی کا شکار ہیں، فراز اپنے عہد کے ممتاز و منفرد شاعر تھے، ان پر فیض کا تتبع کا الزام لگانا غلط ہوگا۔ فراز کی شاعری میں ہزار خامیاں تلاش کی جائیں پھر بھی ان کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ نقادوں کو چاہیے کہ وہ از سرِنو جائزہ لیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ احمد فراز برصغیر ہند و پاک کے واحد شاعر تھے جو سب سے زیادہ پڑھے جاتے ہیں۔ سب سے زیادہ شائع ہوتے ہیں۔ سب سے زیادہ انٹرنیٹ کی سائٹ پر موجود رہتے ہیں اور سب سے زیادہ فروخت ہوتے اگر چہ وہ فیض احمد فیض سے بڑے شاعر نہیں لیکن مقبولیت اور رائلٹی میں اس کا کوئی مدمقابل نہیں ہے۔

مشفق خواجہ کے دولت کدے پر دو تین گھنٹے کی ملاقات ایک یادگار تھی وہ کافی دیر تک مسکراتے، ہنستے مگر سگریٹ کے کش لیتے ہوئے شعر سناتے رہے ایک مصرعہ سے دوسرا مصرعہ ایک غزل سے دوسری نظم درمیان میں گفتگو کے شگفتہ گل کھلتے رہے۔ احمد فراز فیض احمد فیض کے برخلاف شعر بہت پیارے ایسے دلار سے سناتے رہے کہ جیسے کوئی باپ اپنے بچوں کے ساتھ خوش فعلیاں کر رہا ہو۔ اس ملاقات میں پہلی بار علم ہوا کہ وہ ایک معزز سید خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے جد امجد ایک صوفی بزرگ تھے۔ ان کے والد آغا برق خود فارسی اور اردو کے شاعر تھے۔ اس سیدزادے احمد شاہ کے اندر جو حق کے لیے لڑنے کا جذبہ تھا وہ نہ مصلحتوں کا شکار ہوا نہ کبھی اس کی انا کو مجروح کرسکا۔ ساتھ ہی کوہاٹ کی کوہستانی مٹی نے سرکشی، ضد، حوصلہ مندی اور مستقل مزاجی عطا کی تھی کہ یہ تند خو قبائلی روایات کی مرہونِ منت ہے، جو کبھی شکست قبول نہیں کرتی۔

شدت تشنگی میں بھی غیرت تشنگی رہی
اس نے جو پھیر لی نظر میں نے بھی جام رکھ دیا

احمد فراز کے ہم وطن فارغ بخاری نے لکھا ہے کہ ''اس بھلے آدمی کی زندگی کی ورق گردانی کیجیے تو قدم قدم پر خطرے کے نشان نظر آئیں گے۔ ہوش مندی سے اس نے کبھی کوئی کام نہیں کیا اگر وہ دوسروں کی طرح زیادہ ہوش مند ہوتا تو اتنا بڑا شاعر نہ بن سکتا۔'' احمد فراز کا تعلق جس سرزمین سے تھا وہاں سے وہ اردو کا پہلا بڑا شاعر ہے جس پر اس خاک پاک کا زرہ زرہ فخر کریگا۔ اس کی مقبولیت نے سیاسی سرحدوں، لسانی حد بندیوں اور علاقائی تنگ نظری کے تمام طلسمات کو توڑ دیا تھا، اگر چہ فراز کی مادری زبان پشتو ہے اور ان کی تعلیم ایسے ماحول میں ہوئی تھی جہاں بیدل، سعدی، حافظ، عرفی، نظیری اور غالب کی فارسی شاعری کے چرچے تھے۔ فراز اردو ٹھیک سے بول بھی نہیں پاتے تھے۔ حالانکہ اس میں بخوبی لکھ سکتے تھے۔ چنانچہ ریڈیو پاکستان میں جو پہلی ملازمت ملی وہ اردو اسکرپٹ رائیٹر کی تھی۔ فراز کی خوش قسمتی سے اس کا تبادلہ عروس البلاد کراچی ہوگیا۔ روشنیو کے اس شہر میں ریڈیو

پاکستان میں اس وقت اپنے عہد کے آفتاب و مہتاب، ارم لکھنوی، سیماب اکبرآبادی، شاہد احمد دہلوی کی حکمرانی تھی ان کا سکہ رائج الوقت تھا۔ وہاں ان حضرات کی صحبت نے فراز کے فکر وفن کی آبیاری کی۔ انھیں دنوں کلاسیکی شعرا کی زمینوں میں فراز نے غزلوں پر غزلیں لکھیں اور ہر غزل آٹھ، دس اشعار کی۔ اس مشق سخن نے فراز کے کلام کو جلا بخشی، زبان وبیان پر قدرت حاصل ہوئی۔

شمع کی لو تھی کہ وہ تو تھا مگر ہجر کی رات
دیر تک روتا رہا کوئی سرہانے میرے

کچھ آج شام ہی سے دل ہے بجھا بجھا
کچھ شہر کے چراغ بھی مدھم ہیں دوستو

عاشقی میں میرؔ جیسے خواب مت دیکھا کرو
باولے ہوجاؤ گے مہتاب مت دیکھا کرو

مسافت دل کی تھی سو جادہ مشکل پسند آیا
ہمیں بھی مثل غالبؔ گفتہ بیدل پسند آیا

احمد فراز کے ساتھ ملاقات پر وقت کی اڑتی دھول جمتی گئی۔ موسم آتے بھی رہے اور جاتے بھی رہے۔ ہندوستان و پاکستان کے درمیان گھر گھر کے بادل آتے رہے، کبھی موج خوں، کبھی دوستی کے گلاب، رفاقتوں، معانقوں کا موسم، کبھی ایک دوسرے پر کف درد دہن۔ احمد فراز نے اس دوران مقبولیت اور شہرت کی وہ بلندی حاصل کر لی۔ جہاں خود شہرت کو پہنچنے میں ابھی دیر لگے گی۔ ان کی متعدد شعری مجموعے کتب فروشوں کے شوکیسوں میں سج گئے، گھروں میں داخل ہو گئے دلوں میں جگہ بنالی اور زبان زد عام بن گئے۔ اس دوران وہ واقعہ ہوا جس نے احمد فراز کی عزت میں مزید اضافہ کر دیا ہوا یوں کہ 1976ء میں ان کو ڈائریکٹر جنرل پاکستان اکادمی آف لیٹریں بنایا گیا بعد میں وہ صدر نشین نیشنل فاؤنڈیشن ہو گئے۔ اس دوران ضیا الحق کا دور حکومت زرد گلابوں کا موسم بن کر آ گیا۔ کوئی بھی فوجی حکمراں، عوامی آواز اور شاعر کی نوا سے ہراساں رہتا ہے راوی کا بیان ہے کہ ایسے موسم میں احمد فراز نے ایک نظم، محاصرہ، پڑھ دی جس کا نشانہ مطلق العنانی کے خلاف صدائے احتجاج تھی۔ چنانچہ وہی ہوا جو روس میں مایا کوفسکی کی ایک نظم پر ہوا جس میں انھوں نے کہا تھا ''ہم فضاؤں میں فولاد اچھالتے ہیں اور اسٹالن کے عتاب کا شکار ہوتے ہوئے بچ گئے تھے کہ وہ روسی انقلاب کے ہراول دستے کے شاعر تھے۔ لیکن احمد فراز کو کون بچاتا۔ نہ وہ جنگ آزادی کے مجاہد تھے نہ مسلم لیگ کے ہم نوا وہ تو بائیں بازو کے خودسر، سرفروش مجاہد تھے۔ انھوں

نے بطور احتجاج پاکستان کا سب سے بڑا شہری اعزاز ''ہلال امتیاز'' واپس لوٹا دیا اور بانگ دہل لکھا کہ سند رہے اور وقت ضرورت کام آئے۔ ''میرا ضمیر مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا اگر میں محض خاموش تماشائی کی طرح اپنے اردگرد دیکھتا رہا۔ کم سے کم میں اتنا تو کرسکتا ہوں کہ آمرانہ سرکار یہ جانے کہ اپنے انسانی حقوق کے لیے باخبر اور بیدار عوام کیا سوچتے ہیں۔ مین اس معزز اعزاز کو واپس کر کے یہ احساس دلانا چاہتا ہوں کہ میں اس سرکار کے ساتھ کسی بھی طرح اس کا ہمنوا نہیں ہوں۔''

احمد فراز نے جرائت و جواں مردی سے حق پرستی و حق گوئی کو شعار بنایا تو اس کی تحریک ان کو تاریخی صداقتوں اور اپنے معاشرے کی صالح اقدار سے ملی۔ اس کی مثال وہ نعت رسول ہے جس میں حضرت محمدؐ کی محض روحانی برکتوں کا ذکر نہیں کیا بلکہ اُس اخلاقی جرائت اور بے خوفی سے شرار بولہبی کے مقابلے کا ذکر کیا ہے جس سے خود انھوں نے اپنے لئے شب یلدا میں ہمت، حوصلے اور یقین کے چراغ روشن کئے ہیں۔

احمد فراز سے دوبارہ ملنے اور ڈھیر ساری گفتگو کرنے کا موقع اس وقت ملا جب مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی دعوت پر وہ 14 تا 16 نومبر 1998ء کو پہلی بار بھوپال شریف لائے اور یہ موقع اکادمی کے اس وقت کے فعال چیرمین عزیز قریشی کی انتھک کوشش کا نتیجہ تھا۔ ورنہ اس سے چند ماہ قبل حکومت مدھیہ پردیش کے محکمہ پولس اور مرکزی وزارت داخلہ کی مشترکہ مساعی کے باوجود احمد فراز کو بھوپال نہ لایا جاسکا تھا۔

عزیز قریشی نے ہزار سیاسی اور اقتصادی دشواریوں کے باوجود احمد فراز کو بھوپال بلا ہی لیا۔ شہر کے ادبی حلقے اور عوام جس محبوب شاعر کے خواب دیکھتے تھے۔ جس کا کلام خود اس کے ذہن سے سننے کے متمنی اور دیکھنے کے آرزو مند تھے۔ وہ حقیقت کا روپ دھار کر چکا تھا۔ یہ تین دن بہت مصروف تھے، ترقی پسند تحریک کے قائد اور اردو کے اہم ترین شاعر سردار جعفری بھی اس سہ روزہ تقریب کے مہمان محترم تھے یہ تین دن شہر کے ادبی حلقوں، بھوپال کے خوش فکر اور خوش ذوق عوام کے لیے تاریخی و یادگار دن بن گئے تھے۔ احمد فراز نے شیش محل اور ریاض منزل جا کر ان مقامات کو دیکھا جنھوں نے شاعر مشرق اقبال کے قدم بوسی کی ان کمروں کو دیکھا جہاں اقبال نے قیام کیا تھا اور یہیں ایک شب انھوں نے خواب میں حضرت محمدؐ کی زیارت کی تھی۔ اقبال لائبریری کی ستائش کی اور بھوپال کے حسن جہاں زیب پر فدا ہو گئے۔

سردار جعفری کو 14 نومبر اور احمد فراز کے لیے 16 نومبر کو منعقدہ استقبالیہ جلسے جن میں ہر دو معزز شعرا کو شال، میمنٹو اور سپاس نامے پیش کئے گئے۔ 15 نومبر کی شب ایک شاندار مشاعرہ اقبال میدان میں منعقد کیا گیا۔ ان پروگراموں میں ہزاروں سامعین نے احمد فراز کو سنا، مگر تشنگی تھی کہ کم ہی نہ ہوتی تھی۔ رات بھیگتی گئی مگر فرمائش اور مزید سنانے کا اسرار بڑھتا ہی رہا۔ اقبال میدان کے چہار سمت پھیلے محلات، مساجد کے گنبد، مینار سب ہمہ تن گوش تھے دور تالاب کی لہریں بھی جیسے فراز کو سننے کو مضطرب تھیں۔ اس موقع پر فراز نے اپنی نظم دوستی کا ہاتھ سنائی

تمہارے دیس میں آیا ہوں دوستو اب کے
نہ ساز و نغمہ کی محفل نہ شاعری کے لیے

اگر تمھاری انا ہی کا ہے سوال تو پھر
چلو میں ہاتھ بڑھاتا ہوں دوستی کے لیے

احمد فراز نے نظم سنانے سے پہلے کہا کہ ''ہندوپاک کی عوام کو ایٹم بموں کی ضرورت نہیں بلکہ محبتوں کی حاجت ہے جس کی خوشگوار فضا میں ہم دونوں ممالک کے بنیادی مسائل جہالت، غربت، بیماری اور بھک مری کو دور کرسکیں۔

عزیز قریشی نے استقبالیہ جلسے میں الفاظ، جذبات اور پھولوں کا نذرانہ پیش کرتے ہوئے کہا'' آپ نے ہماری درخواست پر پاکستان سے تشریف لانے کی زحمت گوارا فرمائی جس کے لیے ہم دل سے شکرگزار ہیں، لیکن شکریہ کے رسمی الفاظ ہمارے جذبات امطنان کو ادا نہیں کرسکتے۔ یوں بھی آپ کی شاعرانہ عظمت اور قبول عام کی سند توصیفی کلمات کی محتاج نہیں ہے۔ ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ بھوپال کے سلسلہ افتخار میں ایک اور اہم نام کا اضافہ ہوا ہے۔

سردار جعفری نے احمد فراز کے جواب میں اپنی نظم کون دشمن ہے سنائی یہ نظم احمد فراز کی نظم سے بہت پہلے لکھی گئی تھی۔ غالباً 1970 کی جنگ کے زمانے میں شاعرانہ اظہار میں یہ فراز کی نظم سے بہتر ہے اگرچہ ساری نظم اپنے خطابیہ اور بیانیہ لہجہ کے باوجود بلکہ شاید اسی وجہ سے بہت زیادہ مقبول ہوئی۔ سردار جعفری کی ایک اور نظم گفتگو کا بھی یہ ہی موضوع ہے لیکن فنی اور تخلیقی اعتبار سے یہ اول الذکر دونوں نظموں سے بہتر ہے۔

سہہ روزہ تقریبات کے دوران احمد فراز نے مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے زیر اہتمام شائع سہا مجددی کی تحریر کردہ دیوان غالب کی شرح پر مبنی کتاب مطالب الغالب کا اجرکیا اور دلی مسرت اور فخر کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ غالب ہمیشہ سے میرے پیرومرشد رہے ہیں اور میرا یقین ہے کہ وہ 19ویں صدی کے ہی نہیں آنے والی صدیوں میں بھی بڑے شاعر تصور کیے جائیں گے۔

احمد فراز شملہ ہلس پر واقع لیک ویو ہوٹل اشوکا کے شاندار سوٹس میں مقیم تھے جس کے وسیع شیشوں کے دریچے کے سامنے بھوپال تال اپنی ساری خوبصورتی اور حسن کے ساتھ جلوہ فگن تھا ساتھ کے کمرے میں سردار جعفری ہیں۔ موسم خوشگوار ہے، نوائے عاشقانہ اور ذکر دلبرانہ کے ساتھ دوران گفتگو فراز نے کہا۔ اہم چیز نام ونمود نہیں، رحم، انصاف، اور انسان دوستی ہے۔ ہم جس سماج اور لوگوں کے درمیان بھلی بری زندگی گزار رہے ہیں۔ ان سے مجھے محبت ہے۔ میں ہر انسان کو خود کفیل دیکھنا چاہتا ہوں۔ دنیا میں سارے مسائل کا لب لباب یہ ہے کہ آدمی دوسروں کے حصے کی دھوپ بھی خود اوڑھ لینا چاہتا ہے۔

پاکستان کی صورتحال سے فراز ایک محب وطن کی طرح فکر مند تھے مگر وہ دوسرے پاکستانی شعرا کی طرح ہندوستان والوں کی دل بستگی کے لیے اپنے ملک کی ہجو نہیں پڑھ رہے تھے۔ مجھے اس موقع پر جگر مرادآبادی کی یاد آ گئی۔ انھوں نے ملک کی آزادی کے بعد ہندوستان کی سیاسی صورتحال پر ایک طنزیہ غزل لکھی تھی ؎

جہل خرد نے دن یہ دکھائے
گھٹ گئے انسان بڑھ گئے سائے

مگر جب وہ پاکستان گئے اور کراچی میں اس غزل کی فرمائش کی گئی تو انھوں نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ وہ غزل آپ کے یہاں سنانے کے لیے نہیں ہے وہ گلہ وہ شکایت تو میں نے اپنے ہم وطنوں سے کی ہے۔ میرے اس سوال پر کہ ہم عصر صورتحال میں وہ کیا سوچتے ہیں۔ فراز نے کہا کہ آج کے نام نہاد ترقی یافتہ معاشرے میں انسان کی بے دردی اور ضمیر فروشی پر رنجیدہ ہوں، جمہوریت کی سر عام عصمت دری سے غم زدہ ہوں۔ انھوں نے آگے کہا۔''ہندو پاک کے درمیان رشتوں کی حرمت کے لیے کوشاں ہوں۔ ہم چاہتے ہیں کہ دکھوں سے نجات کی کوئی سبیل پیدا ہو'' ہم اور آپ اور ہمارے جیسے سینکڑوں ہزاروں آج اس تعلق سے سوچ رہے ہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ ان کے لہجے میں ایک طرح کی تڑپ، گرمی اور خلوص تھا۔ میرے ذہن میں فراز کے کئی مصرے اور شعر گونجنے لگتے ہیں۔ بسمل ہو تو قاتل کو دعا کیوں نہیں دیتے / ہواؤں کے سخن نا معتبر ہیں / سر وجواں کی موت پہ روئیں گی قمریاں کب تک / وہ جو صرف حرف چراغ تھا / بستی والوں کے منھ پر / آنکھوں پر / خود اُن کے ہاتھ دھرے ہیں / سارا شہر بلکتا ہے / پھر بھی کیسا سکتہ ہے /

سردار جعفری کی آواز سن کر میں پھر متوجہ ہوتا ہوں، وہ کہہ رہے ہیں کہ'' کچھ کرنے کی آواز سینے میں دہکنا چاہیے۔ بلا سے ہم نے نہ دیکھی بہار کی صورت کل کچھ اور جیالے اُٹھیں گے اور وہ سب کر گزریں گے جو ہم چاہتے ہیں دنیا میں تعمیر کے دروازے کبھی بند نہیں ہوتے کچھ لوگ عظیم الشان کارنامے انجام دیتے ہیں اور انسانی تاریخ میں امر ہو جاتے ہیں۔''

احمد فراز کا قد صنوبر، جسم ساگوان کی لکڑی کی طرح مضبوط، رنگ کھلتے گلابوں کی طرح، سرخی مائل بالوں میں چاندی کے تاروں کی آمیزش، کھلی وسیع پیشانی جسم پر زمانے کے سرد وگرم نے اپنے نشان ثبت کر رکھے تھے، روشن آنکھیں کچھ سوچتی کچھ تلاش کرتی کچھ مسکراتی شرارتی سی جن میں ایک طلسم ہے۔ ایک کشش ہے۔ چہرے پر دانشوری کی چمک، ہونٹ ادھ کھلے مسکراتے ہوئے لبوں نے کھلنا کم کم سیکھا تھا۔ آواز کا بیس نمایاں، پراثر، خواب ناک، گفتگو کرتے اور اشعار کی قرائت کرتے تو لہجہ دھیما ہی رہتا، مگر پر اعتماد، طبیعت کی نفاست اور جمالیاتی ذوق لباس سے نمیاں، کھلے گلے کی رنگین چیک کی قمیض، سیاہ رائل بلو بلکہ بلبو بلیک دو بٹن کا امیرکی کوٹ، پتلون دوسرے رنگ کی اور سیاہ چمک دار شوٗان کی خوش پوشاکی اور جامہ زیبی کی مظہر، پیٹ کے لیے کبھی ریڈیو اسٹیشن، کبھی جامعات، کبھی ادارہ ادبیات کی فائلوں پر نوٹ لکھے، تجاویز پیش کیں، اسکرپٹ لکھے مگر نہ شاعری کو تجارت سے آلودہ کیا نہ اپنے عقیدے اور فکر پر آنچ آنے دی۔ شاعری کے محضر پر ایک منفرد، عہد ساز شاعر کی حیثیت سے دستخط رقم کیے۔

اس نے سکوت شب میں بھی اپنا پیام رکھ دیا
ہجر کی رات بام پر ماہ تمام رکھ دیا
اب روشنی ہوتی ہے کہ گھر جلتا ہے
شعلہ سا طواف در و دیوار کرے ہے

میں آج زد پہ اگر ہوں تو خوش گماں نہ ہو
چراغ سب کے بجھیں گے ہوا کسی کی نہیں

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

اس قدر مسلسل تھیں شدتیں جدائی کی
آج پہلی بار اُس سے ہم نے بے وفائی کی

تم نہ خوش تو میاں کون ہے خوش پھر بھی فراز
لوگ رہتے ہیں اِسی شہر دل آزار کے بیچ

احمد فرازؔ کے اشعار اور غزلیں وقت کی کسوٹی پر کھرا سونا ثابت ہوتی ہیں۔ان میں غیر معمولی مضمون آفرینی بھی ہے۔نازک خیالی بھی ہے۔تازہ گوئی اور اشعار سازی نے مرکزی کردار ادا کیا ہے۔پھر حسن، خوبصورتی اور معشوق کے قدر رعنا پر جو غزلیں لکھیں ہیں انھوں نے اس کو بستانِ تازہ کا گل سر سبد اور گلستانِ رنگین کا عندلیب جوش نوا بنادیا ہے۔غالبؔ کی زمین:

یہ ہم ہیں جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو کبھی نامہ برکو دیکھتے ہیں

اس میں قافیہ 'کو' کے بجائے 'کے' استعمال کر کے ایک رنگین خواب ناک فضا بنائی ہے۔

سُنا ہے لوگ اسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں
سو اُس کے شہر میں کچھ دن ٹھہر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے رات اسے چاند تکتا رہتا ہے
ستارے بام فلک سے اتر کر دیکھتے ہیں

سُنا ہے اس کے بدن کی تراش ایسی ہے
کہ پھول اپنی قبائیں کتر کے دیکھتے ہیں

رُکے تو گردشیں اس کا طواف کرتی ہیں
چلے تو اس کو زمانے ٹھہر کے دیکھتے ہیں

یا

تری آنکھوں کے آگے کب سے نرگس
کھڑی ہے لے کے کشکولِ گدائی

فراز نے تغزل کی نئی روایت کی تعمیر میں نئی فکر کی ترتیب وتدوین کی ہے۔ اس کا شعلہ ادراک، الفاظ کے طلسمی پیرہن میں دھنک بن کر روشن ہے۔

احمد فراز کی شہرتوں اور کارناموں کی خوشبو چہار سو اس طرح پھیلی ہوئی ہے کہ ان کی شخصیت اور ان کے ارد گرد یا اندر کے تضاد کا احساس نہیں ہوتا۔ ویسے بھی انسان اگر ہے تو وہ نیکیاں بھی کرے گا اور اس سے لغزشیں بھی سرزد ہوں گی ورنہ یزداں واہرمن فرشتے اور ابلیس کی تخصیص نہ ہوتی کہ سکہ کے دو پہلو ہوتے ہیں اور دونوں اہم ہیں۔ سکّہ کی قدر وقیمت کا تعین تب ہی ہوسکتا ہے جب دونوں رخ موجود ہوں۔ یک رُخہ سکہ کا بازار میں کوئی زرخ نہیں ہے نہ چلن ہے وہ بے قیمت ہے یا پھر بیش قیمت اگر بیش قیمت ہے تو اس کی جگہ عجائب گھر ہے یا پھر ملنگ کا ڈیرا۔

عطاالحق قاسمی نے اپنے ایک کالم میں لکھا ہے کہ فراز بے حد منہ پھٹ تھے اور اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کسی کی دل آزادی کی پرواہ کئے بغیر برسر محفل کر دیتے تھے۔ وہ دوسرے پاکستانی شعرا کی طرح ہندوستانی شعرا کو در خور اعتنا نہیں سمجھتے، اس سلسلہ میں ایک واقعہ جس کے راوی عزیز قریشی ہیں۔ یہ ہے کہ 1987ء میں عالمی اردو کانفرنس کے موقع پر جب احمد فراز دہلی آئے تھے اور پرگتی میدان میں منعقدہ مشاعرہ گو یا انھوں نے لوٹ کر نادر شاہ کی طرح اپنی جھولی میں ڈال لیا تھا۔ انھی دنوں ایک نجی محفل میں شرکت کے بعد جب فراز ہوٹل واپس جارہے تھے تو میزبانوں نے عزیز قریشی سے درخواست کی کہ آپ اپنی موٹر میں ان کو لے جائیں فراز جس ہوٹل میں مقیم ہیں وہ آپ کے راستہ میں ہی ہے۔ عزیز قریشی ان دنوں ممبر پارلیمنٹ تھے۔ محفل کیونکہ رات گئے تک چلنے کا امکان تھا۔ اس لیے انھوں نے اپنے ڈرائیور کو رخصت کر دیا تھا۔ یہ ان کی ایک عادت سی ہے کہ وہ اپنے ماتحتوں کو بلاوجہ پریشان نہیں کرتے چنانچہ گاڑی وہ خود ڈرائیو کر رہے تھے۔ احمد فراز اگلی نشست پر ہی ان کے ساتھ بیٹھے تھے راہ میں گفتگو کے دوران عزیز قریشی نے سردار جعفری، مجروح سلطانپوری اور کیفی اعظمی کا ذکر چھیڑا جو نہ صرف ان کے دوست تھے بلکہ حقیقی معنٰی میں ان کی شاعری کے عاشق تھے ان کی نظموں کی نظمیں اور اشعار ان کو حفظ ہیں۔ فراز نے کہا کہ ''ان حضرات کی شاعری بھی کوئی شاعری ہے۔ ان کے اشعار اگر کسی اخبار میں شائع ہوں اور اس اخبار میں سموسہ رکھ دیا جائے تو وہ بھی بدبو دینے لگے گا۔'' عزیز قریشی ایسی باتوں کے روادار نہ تھے انھوں نے پوری قوت سے بریک پر پیر رکھا اور گاڑی دور تک شوں کی آواز کرتی اور سڑک پر ٹائیروں کے سیاہ نشان بناتی ہوئی رک گئی۔ وہ

تھوڑی دیر تک اپنے غصہ پر قابو پاتے رہے۔فراز نے حیرت سے پوچھا۔کیا ہوا؟ آپ نے گاڑی کیسے روک لی؟ عزیز قریشی نے جواب دیا۔مسٹر احمد فراز آپ نے ہمارے ملک کی ہمارے ادب کی اور اپنی سخن شناسی کی توہین کی ہے۔آپ مہمان نہ ہوتے تو میں آپ کو اسی جگہ اتار دیتا۔

دوسرا واقعہ 15 رنومبر 1998ء کا ہے۔اقبال میدان بھوپال میں ہند پاک مشاعرہ،عوام کا اژدھام اسٹیج پر شعرا کی کہکشاں بجی ہے۔ادب کے آفتاب و ماہتاب یکجا ہیں۔نظامت اشعار سے ذہنوں کو مسخر کرنے والے بشیر بدر کر رہے ہیں اور مشاعرے کو ساحرانہ انداز میں بلندیوں کی طرف لے جا رہے ہیں کہ انھوں نے بھوپال کے ہر دل عزیز بزرگ شاعر عشرت قادری کو کلام سنانے کے لیے مدعو کیا۔میں اسٹیج پر فراز کے نزدیک موجود تھا۔عشرت قادری نے احمد فراز کو مخاطب کر کے ہجرت کے تعلق سے شعر پڑھے۔فراز نے برا سا منھ بنایا اور کہا ہجرت سے مجھے کیا لینا دینا۔میں نے کوئی ہجرت نہیں کی۔پاکستان میرے بزرگوں کا وطن ہے اور میں وہیں پیدا ہوا ہوں۔بعد میں انھوں نے ہوٹل پہنچ کر بھی اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے ہم عصر شعرا کو دوسرے پاکستانی شعرا کی طرح نظرانداز کرنے کی ادبی بددیانتی کے قائل تھے۔انھوں نے کسی جگہ انٹرویو کے دوران کہا تھا کہ پاکستانی شعرا کا چیلنج ہندوستان سے بڑا ہے اس لیے یہاں کے مقابلے ہماری شاعری زیادہ رواں اور طاقتور بن گئی ہے۔جیسے جنوبی افریقہ کی شاعری اس وقت دنیا کی سب سے طاقتور شاعری ہے یا فلسطین کی شاعری ہے۔

احمد فراز کی شخصیت کا یہ پہلو بھی دلچسپ ہے ایک مکمل شخصیت کا اظہار،جس میں خیر کی خوشبو بھی ہے اور انسانی کمزوریوں کا اظہار بھی،آسمان کے ستارے چھو لینے اور یزداں پر کمند ڈالنے کا جوش و جذبہ بھی،چاند کو چاہنے اور پانے کی ضد بھی،وفادار بیوی کے باوجود تاک جھانک کی عادت معشوقوں کی دلداریاں،شہرتوں اور بلندیوں کے باوجود عام آدمی کا درد،انصاف،آزادی اور مساوات کے سربکف،بلا سے ہم نے نہ دیکھی تو اور دیکھیں گے چمن میں رنگ بہار،اسی جستجو میں،اسی سرگرمی میں اس کے جسم کا آہن ریزہ ریزہ ہو کر ماہ و سال کی ہوا اڑاتی رہی۔کسی شام چراغ روشن ہونے سے پہلے مصائب سے نبردآزما ہونے والا جیالہ اندھیرے کے خلاف جوجھنے والا مجاہد تھک کر چور ہو گیا۔اس آباد خرابے میں تاریک راہوں کے مسافر نے کسی سے کوئی کرن مانگ کر نہ اسے شرمندہ کیا نہ خود شرمسار ہوا۔اپنی یہ شان،یہ کج کلاہی برقرار رہی۔گو جسم اب تک سلامت تھا،مگر دماغ میں سناٹا،شور،نہ داد نہ فریاد۔ایک خاموشی کہ سارے شور شرابے کا انجام یہی خاموشی ہے۔

کوئی مرنے سے مر نہیں جاتا
دیکھنا وہ یہیں کہیں ہوگا

(اجلال مجید)

صابرارشاد عثمانی۔لندن یادرفتگاں

آہ!...احمد فراز

احمد فراز مرحوم سے میرے ملاقات بہ نفسِ نفیس تو کبھی ہوئی نہیں مگر ایک بار ایک بفے (buffet) میں انہیں بلند آواز میں باتیں کرتے ہوئے سنا تھا۔ ہوا یوں کہ گذشتہ صدی کی آخری دہائی میں جب ڈاکٹر نوید مرحوم نے اپنے والد صاحب کی یاد میں لندن میں عالمی مشاعرہ منعقد کرایا تھا تو وہاں بفے کے دوران میں ایک صاحب گرجتی ہوئی آواز میں آمریت پر اپنے تاثرات پیش کر رہے تھے۔ جو صاحب میرے ساتھ کھڑے ہوئے تھے ان سے دریافت کیا یہ ہیں کون صاحب؟ انہوں نے مجھے کچھ ایسی نظروں سے دیکھا کہ کہہ رہے ہوں،''ارے بے خبر تجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ شخصیت کون ہے تو تو یہاں کیا کرنے آیا ہے''۔ بہر صورت بڑی شفقت سے مجھے مطلع کیا،''یہ ہی تو ہیں احمد فراز''۔ میں بھی اپنی پلیٹ تھامے ہوئے ان کے حلقہ میں داخل ہو گیا۔ اس وقت وہ جمہوریت کا باب بند کر کے اردو پر اپنے خیالات ظاہر کر رہے تھے۔ ان کے سارے فرمودات تو یاد نہیں البتہ یہ یاد رہ گیا کہ وہ کہہ رہے تھے،''اردو میں لفظ 'کل' بغیر بیساکھی کے نہیں چل پاتا ہے''۔ اس کے بعد گذشتہ سال جب میں ''متعلقات مشفق خواجہ'' مرتب کر رہا تھا اس سلسلے میں کئی مرتبہ احمد فراز صاحب سے ٹیلیفون پر گفت وشنید ہوئی۔ ہر مرتبہ احمد فراز صاحب نے یہ وعدہ کیا کہ کچھ لکھوں گا۔ افسوس احمد فراز صاحب کی تحریر کے بغیر کتاب مرتب ہوئی۔

احمد فراز ہمارے عہد کا وہ شاعر ہے جس نے کمیونٹی کی جانب اپنے فرائض کو پہچانا، جس نے خلق خدا کے درد کو اپنی ذات میں محسوس کیا انسان کی عمومی بیکسی کو حتی المقدور سمجھنے کی کوشش کی، جب ہی تو کہتا ہے ؎

فراز اس شہر میں کس کو دکھاؤں زخم اپنے
یہاں تو ہر کوئی مجھ سا بدن لیے ہوئے ہے

اور یہ ہی وجہ ہے کہ احمد فراز کی مقبولیت کا عوام کے درمیان میں گراف چڑھتا چلا گیا اور برصغیر ہند کے اکثر گلوکاروں نے ان کے کلام میں اپنا بھی بھلا دیکھا اور ساتھ ہی خود ان کے کلام کے ایسے رومانی اشعار کو زبانِ زد عام بنانے میں مثبت کردار ادا کیا ؎

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

وہ دشمن جاں جان سے پیارا بھی کبھی تھا
اب کس سے کہیں کوئی ہمارا بھی کبھی تھا

میں تجھ سے کیسے کہوں یار مہربان میرے
کہ تو علاج نہیں مری ہر اداسی کا

یا ایسے شعر جن میں شاعر کی معصومیت، بے چارگی جھلک رہی ہے اور جہاں شاعر اپنا تخلص بطور استعارہ بطور عوام میں سے ایک فرد استعمال کر رہا ہے۔

پاگل ہو فراز آج جو راہ دیکھ رہے ہو
جب اس سے ملاقات کا وعدہ بھی نہیں

احمد فراز نے ۱۹۷۷ سے ۱۹۸۵ کے زمانے میں جنرل ضیا کی آمریت کے خلاف آواز بلند کی۔ اسی دوران میں ''مانسہرکیمپ ۷۷ء میں بند کر دیے گئے۔

بے آواز گلی کوچوں میں غزل سرا ہے
شہر سخن کا ایک مسافر تنہا تنہا

اپنے تاثرات ''پہلی آواز'' میں یوں پیش کی ہے۔

اتنا سناٹا کہ جیسے ہو سکوت صحرا
ایسی تاریکی کہ آنکھوں نے دُہائی دی ہے
جانے زنداں سے ادھر کونسے منظر ہوں گے
مجھ کو دیوار ہی دیوار دکھائی دی ہے
دور اک فاختہ بولی ہے بہت دور کہیں
پہلی آواز محبت کی سنائی دی ہے

قید و بند کے زمانے میں وہ اپنے احساسات کی عکاسی اس طرح کرتے ہیں۔

نیند کے طائران بے پرواہ
شاخ مژگان سے گئے پرواز
ایسی ویرانیوں سے گھبرا کر
جب اٹھاتا ہوں تیری یاد کی آواز
توڑ دیتی ہے سلسلے سارے
پہرہ داروں کی بد نما آواز

قید جو بند کے زمانے میں ان پر جو بیتی اس کے لئے کہتے ہیں:

''میرے خیال سے اپنے آپ کو قابو میں رکھنے ہی سے زیادہ متاثر ہوا'' وہ ان کے نتائج سے بھی واقف تھے۔ جس کا اقرار کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''جو کچھ میں نے تحریر کیا اس سے باخبر تھا۔ لیکن در حقیقت دنیا کے دوسرے انقلابات میں یہ ہی اپنے

احساسات کے اظہار کرنے کا طریقہ ہے، ہمیشہ دانشوران پس پردہ اپنا حق ادا کرتے رہے ہیں۔ حالاں کہ اس اسٹیج پر میرا کردار مختصر ہے۔ لیکن میرے نزدیک میں نے اپنا فرض ادا کردیا کیوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ آخر میں قلم کی طاقت پر غالب ہوگی۔''

انہی تاثرات کو اپنے آپ کو خطاب کرتے ہوئے
فراز ہم تم تو وہ ہیں
جن کے نصیب میں زندگی کی ساری اذیتیں ہیں
کہ جس مسافت میں ہم چلے ہیں
وہ حرف حق کی مجاہدت ہے
ہمیں نہ حوص حشم نہ مال ومنال کی آرزو رہی ہے
نہ ہم کو طبل وعلم نہ جاہ وجلال کی جستجو رہی ہے
بس ایک قلم ہے کہ جس کی ناموس
ہم فقیروں کا کل اثاثہ ہے، آبرو ہے
بس ایک سچ ہے
کہ جس کی حرمت کی آگہی ہے
مرے بدن، ترے بدن میں
مرے قلم میں، ترے قلم میں
وہی لہو ہے
کہ جس سے عرفان کی نمو ہے
کہ جسے انسان کی آبرو ہے

......فراق گورکھپوری جیسے نابغۂ روزگار عالم، شاعر وناقد کا خیال احمد فراز کی شاعری کے بارے میں یہ تھا:

''احمد فراز کی شاعری اردو میں ایک نئی اور انفرادی آواز کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کے وجدان کی اور جمالیاتی شعور کی ایک خاص شخصیت ہے جو نہایت دل کش خدوخال میں مزین ہے۔۔۔۔ وہ صداقت کے نئے مقامات سے اپنی باتیں کہتے ہیں اور یہ باتیں دعوت فکر دیتی ہوئی حد درجہ دل کش و دل نشیں ہیں۔ ان کا کلام اردو شاعری کے نئے موڑ کے کئی نازک زاویوں کی لچک اور تھرتھراہٹیں اپنے اندر رکھتا ہے۔''

فراز کی شاعری کے بارے مین کسی اور کلام کی گنجائش ہی کہاں رہتی ہے۔ اور ان کی شخصیت کا جس خوب صورت انداز سے کشور ناہید نے احمد فراز کی انتقال کے بعد اپنے '' کھلے خط'' مطبوعہ (اخبار اردو، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد شمارہ، اگست ۲۰۰۸ء ص ۸۵) میں تحریر کیا ہے:

''تمہیں گزشتہ تیس سالوں سے حق تصنیف پر ایک اچھی رقم ادا کی گئی۔ تمہاری شاعری کی کتابیں ہاتھوں

ہاتھ فروخت ہوئیں، تمہاری مقبولیت کا یہ عالم تھا جب کہ تمہاری عمر کے لوگ اپنے بچوں کے بچوں سے جی بہلاتے ہیں۔تم نے پسند ہی نہیں کیا کہ تمہیں "چچا" کے نام سے پکارا جائے۔تم نے پسند کیا 'فراز صاحب"

تمہارا انداق سلیم اس قدر دلگیر تھا تمہارے فقرے بازی سے مزاحیہ نگار مشتاق یوسفی بہت لطف لیتے تھے۔"

اس کے بعد کوئی اور کیا کہہ سکتا ہے سوائے اسکے۔

احمد فراز کی کثرت شراب نوشی و تمباکو نوشی ہی شاید انہیں ہم سے دور اس دنیا میں لے گئی جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آیا۔

اور فراز چاہئیں کتنی محبتیں تجھے
ماؤں نے تیرے نام پر بچوں کے نام رکھ دیئے

کچھ تو فراز اپنے قصے بھی ایسے ہی تھے
اور کچھ کہنے والوں نے بھی رنگ بھرائے

بھلے سے احمد فراز اپنی وکالت اس طرح کرتے تھے، لیکن جب وہ ایسے شعر کہتے تھے تو کیا ان کی حسن پرستی اور تعلّی کی عادت بھی اسی بادہ خواری کا نتیجہ تھی۔

مجھے تعجب ہوگا۔

☆☆☆

صفیہ صدیقی، لندن

ایک روشن چراغ تھا...نہ رہا!

رسل صاحب کی شخصیت

رالف رسل صاحب ایک بے حد سچے اور کھرے انسان تھے، وہ سچ کہتے تھے اور سچ ہی سننا پسند کرتے تھے، انھیں اس بات کا بہت قلق تھا کہ لوگ ان سے وعدے تو کر لیتے ہیں مگر پورا نہیں کرتے، عموماً یہ بات ہم پاکستانی لوگوں کے بارے میں ہوتی تھی، جو حاکم وقت ان سے اردو زبان کی ترویج لیے فنڈز دینے کے لیے وعدہ تو کر لیتے تھے مگر دیتے وقت ذرا سا بھی خیال نہیں کرتے تھے اور بے حد پریشان کرتے تھے۔ رسل صاحب انسانوں میں طبقاتی نظام کے سخت خلاف تھے اور ایسے لوگوں سے ملنا جلنا پسند بھی نہیں کرتے تھے جن کی پیشانی پر امارت اور تفخر کی سلوٹیں نمایاں ہوں اور آواز رعب کی درشتی ہو۔

میں نے مولانا حسرت موہانی کے بارے میں کہیں پڑھا تھا کہ ایک دفعہ علی گڑھ یونیورسٹی کی طرف سے ان کو مدعو کیا گیا اور بہت سے لوگ اور طلبہ ان کو لینے کے لیے اسٹیشن پر ہار وغیرہ لے کر آئے تھے پھر گاڑی آنے کے بعد لوگ ان کو ڈھونڈھتے پھرے اور پوری گاڑی دیکھ ڈالی، مولانا کہیں نہیں تھے، جب لڑکے واپس جا رہے تھے تو انھوں نے دیکھا کہ ایک بلڈنگ سائٹ پر کچھ مزدور آگ جلائے بیٹھے تھے اور اپنا کھانا کھا رہے تھے اور مولانا بھی ان کے ساتھ دال روٹی کھا رہے تھے، لڑکوں نے حیرانی سے پوچھا مولانا آپ اور یہاں، ہم تو آپ کو اسٹیشن پر ڈھونڈھ رہے تھے، مولانا بولے، بھئی اسٹیشن پر بہت بھیڑ تھی میں نے سوچا کوئی بڑا آدمی آیا ہوگا تو میں پیچھے سے اتر کر چپکے سے چلا آیا۔ رسل صاحب بھی ایسا ہی ایک واقعہ بتاتے تھے اور شائد انھوں کہیں یہ لکھا بھی ہے کہ ایک دفعہ وہ علی گڑھ جا رہے تھے اور غالباً ڈاکٹر ذاکر حسین کے یہاں ان کو ٹھہرنا تھا، ان کا ڈرائیور فرسٹ کلاس اور سکنڈ کلاس کے ڈبے میں ان کو ڈھونڈھتا رہا، وہ واپس جانے ہی والا تھا کہ ایک تھرڈ کلاس سے رسل صاحب نکلے، وہ راستے بھر موم پھلی کھاتے اور ڈبے کے دیہاتیوں سے ہنستے بولتے آئے تھے اور بقول ان کے وہ ان سے زبان دیکھتے آئے تھے۔

رسل صاحب سے میری ملاقات ۱۹۷۸ میں سواس (SOAS) میں ہوئی جب میں نے ایک میچور اسٹوڈنٹ کی حیثیت سے یونیورسٹی میں داخلے کی درخواست دی تھی اور چونکہ وہ انڈولوجی کے شعبے کے سربراہ تھے اس لیے وہ میرا انٹرویو لے رہے تھے۔ اس کے بعد میری ان سے برابر ملاقات ہوتی رہی اور وہ ایک کلاس بھی لیتے تھے، مجھے ابھی تک اس شرمندگی کے احساس کی کیفیت یاد ہے جب میرے بھاگم بھاگ کلاس میں شامل ہونے کی کوشش کے بعد بھی میں تاخیر سے پہنچتی اور دوسری طالب علم لڑکیوں کے ساتھ کلاس لیتے ہوئے رسل صاحب کہتے 'صفیہ یو آر ٹین منٹس لیٹ۔' میں ٹیوب بدلتی ہوئی پھر اسٹیشن سے تیز رفتاری سے چلنے کی کوشش کرتی تا کہ کلاس میں تاخیر نہ ہو مگر کبھی ٹرین دیر سے آتی کبھی لفٹ وقت پر آ کر نہ دیتی، اور کہیں نہ کہیں دس منٹ ادھر ادھر ہو ہی جاتے، یہ طالبات اٹھارہ انیس برس کی تھیں اور میں جوان سے عمر میں کہیں بڑی تھی شرم سے پانی پانی ہو جاتی، لیکن یہ لڑکیاں

میری بہت عزت کرتیں اور اس امر کی معترف تھیں کہ آپ ایک گھر کی ذمہ داریوں کے باوجود تعلیم حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ سوایس (SOAS) چھوڑنے کے بعد جب کبھی رسل صاحب سے لکھنے پڑھنے کی بات ہوتی تو وہ کہتے صفیہ آپ معقول انسان ہیں۔ وہ اس سے زیادہ کسی کی تعریف نہیں کرتے تھے، معقول ان کی تعریف کی انتہا تھی۔ اور جب میں کہتی کہ لوگ تو مجھے نامعقول سمجھتے ہیں تو وہ بہت محظوظ ہوتے، ہمارے یہاں جس طرح لکھنے والے تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہیں وہ اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے آپ لوگ ابھی تک داستانوں والی زبان لکھتے ہیں، حقیقت سے دور پرے۔ جس طرح یہاں پر اور غالباً یہاں کی سب یونیورسٹیوں میں استاد اور طالب علم ایک دوسرے کا نام لیتے ہیں اسی طرح سوایس میں بھی طالب علم رالف کہہ کر مخاطب کرتے، مگر وہ سب انگلستان میں نشونما پانے والے بچے تھے اور میں ایک دوسری تہذیب کی پروردہ تھی جہاں بڑوں کا احترام کرانے کی روایت تھی، حالانکہ جو طالب علم نام لے کر اپنے استاد کو پکارتے تھے وہ بھی احترام کرتے تھے، مگر میں نے رسل صاحب سے کہدیا کہ میں آپ کو رسل صاحب ہی کہوں گی، وہ ہماری تہذیب سے بخوبی واقف تھے اس لیے انھوں نے ہنس کر کہا ٹھیک ہے آپ کی جو مرضی ہو آپ کہیئے۔ ان کی ہدایت تھی مجھے کہ میں آسان زبان میں لکھا کروں تا کہ یہاں کے اردو داں بچے بھی پڑھ سکیں۔ اور ان کا کہنا تھا کہ سچ کہنے اور لکھنے سے کبھی ڈرنا نہیں چاہیے۔

رسل صاحب کو اردو سے بہت محبت تھی اور اس کے لیے زیادہ سے زیادہ کام کرتے اور لوگوں کو اس کے پڑھنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے ہمارے کلاس میں ایک نوجوان مارٹن ڈوڈ آئے تھے جو ایک اعلی سوسائٹی سے تعلق رکھتے تھے، انھوں نے ابتدائی تعلیم بورڈنگ اسکول میں پائی تھی، پھر وہاں سے نکلنے کے بعد ان میں اپنے خاندان سے بغاوت کے جذبات بیدار ہو گئے اور انھوں مزید پڑھنے کے بجائے نوکری کر لی، وہ طویل فاصلے سے سامان لانے اور لے جانے والے ٹرک کے ڈرائیور کی حیثیت سے کام کرنے لگے، بورڈنگ اسکول میں انتہائی سخت نظام زندگی کے زیر تربیت رہنے کے بعد انھیں یہ آزادی اچھی لگی، اور اسی طرح جب وہ پشاور پہنچے تو وہاں کے باشندوں کی آزاد زندگی انھیں بہت بھائی۔ وہ پشاور کے رہنے والوں سے بولنا بات کرنا چاہتے تھے اور باقاعدہ دوستوں کی طرح رابطہ رکھنا چاہتے تھے، تو وہ پشتو پڑھنے کے لیے سوایس آ پہنچے، پشتو زبان کی تعلیم کی وہاں کوئی سہولت نہیں تھی اور رسل صاحب نے ان کو اردو پڑھنے پر رضامند کر لیا، اور اب سنا ہے مارٹن ڈوڈ پی ایچ ڈی کر چکے ہیں اور آج کل اردو کی تعلیمی ترقی اور ترویج کے شعبے سے منسلک ہیں۔

رسل صاحب کی تحریر اور ترجے کی بابت لکھنا آسان نہیں اور اس کے لیے باقاعدہ تحقیق کی ضرورت ہے اور ان کی بابت بہت لکھا بھی جا چکا ہے۔ سوایس کے بعد بھی انھوں نے مجھ سے رابطہ رکھنے کی خواہش کی تھی اور وہ میرے افسانے پڑھتے اور اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے، مگر میں تو صرف ان کی شخصیت کے چند پہلو پر روشنی ڈالنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ وہ اتنے اعلی انسان تھے اور اردو زبان کے لیے اتنے مخلص کہ ان کی بابت کچھ لکھنا بھی مشکل ہے، (وہ کہہ رہے ہوں گے کہ پھر وہی داستان کی زبان معقول انسان کہہ دینے میں کیا ہرج تھا؟) ان سے بات چیت کرتے ہوئے، ان کے تعلق سے میں نے بہت کچھ سیکھا، بہت سی ایسی باتیں جو ایک مسلمان کی حیثیت سے مجھ میں ہونی ہی چاہئیں تھیں لیکن ہمارے معاشرے میں عقیدے اور کردار میں کتنا تضاد ہے یہ حیرت انگیز

ہے، مجھے اپنے اوپر بھروسا تھا کہ ایک باشرع خاندان میں جہاں قناعت، سخاوت اور سچائی پر بہت زور تھا وہاں مجھ میں کچھ کمزوریاں اول تو ہوں گی نہیں اور اگر ہوئیں تو بہت کم، لیکن رسل صاحب سے تعلق رکھنے کے بعد آہستہ آہستہ یہ گرہ کھلتی گئی کہ بہت چھوٹی چھوٹی باتیں بھی کتنی اہمیت رکھتی ہیں، اور مجھے احساس ہونے لگا کہ مجھے پہلے ہی اس بات کا خیال ہونا چاہئے تھا ان سے کسی کو دکھ پہنچ سکتا ہے یا اس کا خود پر اعتماد متزلزل ہوسکتا ہے۔ جو اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے۔ میں حیران ہوتی کہ میں نے پہلے کیوں نہیں سوچا یا اس رخ پر میری نظر کیوں نہیں گئی۔

ایک مرتبہ ہم کلاس میں مذہب پر بات کررہے تھے تو رسل صاحب نے مجھ سے میرے عقیدے کے بارے میں پوچھا، میں نے بتایا کہ میں مسلمان ہوں، انھوں نے سوال کیا کیا کبھی آپ نے اس عقیدے پر غور بھی کیا، میں نے بتایا کہ ہاں، اور اکثر، ان کا سوال تھا کہ آپ کو اپنے مذہب کی کیا بات پسند ہے۔ میں نے کہا سردست میں اس کی صرف دو خوبیاں آپ کو بتا سکتی ہوں، پہلی تو یہ کہ میرے مذہب میں ہر انسان برابر ہے، کسی کو کسی پر فوقیت نہیں، رسل صاحب مسکرائے، انھیں پہلے سے معلوم رہا ہوگا وہ نہ جانے کب سے برصغیر آجا رہے تھے اور وہاں کے کتنے بڑے بڑے لوگوں سے مل رہے تھے، اسکالر، دانشور، اور اس امر سے بھی واقف رہے ہوں گے کہ ان کی روزمرہ کی زندگی میں اس کا اطلاق بھی کتنا یا قطعی نہیں، بہرکیف اس گفتگو پر کلاس کی ایک سوشلسٹ ملک پولینڈ سے آئی ہوئی ایک طالبہ کی توجہ بھی میری طرف ہوگئی، میں نے بتایا، اور دوسری بات ہے کہ اللہ کریم فرماتا ہے کہ اگر تم کسی کی دل آزادی کروگے تو میں بھی تم کو معاف نہیں کرسکتا جب تک وہ شخص تم کو معاف نہ کردے۔ یہ سن کر وہ لڑکی بولی ایسے مذہب کو تو میں بھی مان سکتی ہوں۔ مگر اس دن گھر واپس آتے ہوئے ٹیوب میں راستہ بھر میرے دماغ میں عقیدے کے یہ دو پہلو جن کو میں بہت فخر سے بیان کرآئی تھی دھمال ڈالتے رہے، اور میں شرمندگی اور خجالت کی بارش میں بھیگتی رہی۔ اب مجھے اپنے معاشرے کی منافقت بہت نمایاں نظر آرہی تھی۔

رسل صاحب میرے افسانے پڑھتے اور اس پر گفتگو بھی کرتے، انھوں نے میری ایک کہانی، اجنبی دوست کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا۔ یہ ان کو بہت پسند آئی تھی، البتہ ان کو اس کا اختتام پسند نہیں آیا تھا اور پھر میں نے کہانی کو تھوڑا سا اور آگے بڑھایا تھا اور یہ اختتام انھیں پسند آیا تھا، اور روس کاؤن سن کے جناب عمر میمن نے مجھ سے پوچھا کہ آپ نے اچھی خاصی کہانی کو ایک کمزور اختتام کیوں دے دیا، مگر رسل صاحب کی بات سن کر خاموش ہوگئے، ایک کہانی کے بارے میں دو نقاد اور ادیبوں کی آراء کتنی مختلف ہوسکتی ہیں اور یہ اس وقت میرے لیے حیران کن بات تھی۔

رسل صاحب بڑے مزے سے کہتے تھے کہ میں ملحد ہوں۔ وہ خدا کو نہیں مانتے تھے مگر اس کے بندوں سے کتنے قریب تھے۔ ان سے کتنا پیار کرتے تھے۔ کتنی عزت کرتے تھے۔ ہند و پاک کے کتنے ہی لوگوں کے ذہن میں ان کا شفیق، ہنستا ہوا چہرہ محفوظ ہوگا۔ رسل صاحب یقیناً اپنے بچوں سے بھی قریب رہے ہوں گے تبھی تو ان کے آخری وقت میں وہ سب ان کے پاس تھے اور سب دوست اور شناسا بھی جو ان سے عقیدت رکھتے تھے محبت کرتے تھے جو ان کے شاگرد تھے سب ہی ان کو رخصت کرنے آئے تھے۔ انھوں نے بھرپور زندگی گزاری اور زندگی کا ایک ایک دن کارآمد گزارا، کچھ نہ کچھ کرتے ہوئے:

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

جائزے

[تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے، اڈیٹر کا مبصر کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں۔]

مولانا ابوالکلام آزاد (فکروعمل کے چند زاویے)

مصنف: ڈاکٹر وہاب قیصر
قیمت: ۱۶۰ روپے
مبصر: ڈاکٹر توقیر احمد خاں
ناشر: خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

ڈاکٹر وہاب قیصر کو مولانا ابوالکلام آزاد سے والہانہ لگاؤ ہے۔ مولانا آزاد سے ان کا یہ عشق اس حد تک پہنچ گیا کہ انھوں نے مولانا آزاد کو اپنا آئیڈیل تسلیم کرلیا ہے، اور وہ اپنے آئیڈیل کے ذکروفکر اور کارہائے نمایاں سے دنیا کو نہ صرف واقف بلکہ باخبر رکھنا چاہتے ہیں اس لیے موقع بہ موقع ان کی شخصیت پر کچھ نہ کچھ لکھتے رہے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل مولانا آزاد کے سائنسی علوم پر مضامین کی دریافت نے لوگوں کو حیرت میں ڈالا تھا۔ یہ کارنامہ بھی غالبًا پہلی بار ڈاکٹر وہاب قیصر ہی نے انجام دیا تھا۔ اس طرح وہ نئے نئے انداز سے مولانا آزاد سے متعارف کراتے رہتے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ بلاشبہ ماہر ابوالکلام آزاد یا مولانا آزاد پر ایک مستند اتھارٹی قرار دیے جاسکتے ہیں۔ موجود کتاب مولانا آزاد فکروعمل کے چند زاویے ان کے مختلف اوقات میں لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ہے جو گذشتہ دور میں مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس مجموعۂ مضامین میں ڈاکٹر وہاب قیصر کے کل ۱۹ مضامین شامل ہیں۔ جو بالترتیب اس طرح ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد (سوانح) مولانا آزاد اور خدنگ نظر، مولانا آزاد، لسان الصدق اور اردو کا فروغ، مولانا آزاد اور الندوہ، مولانا آزاد کی انشائیہ نگاری، مولانا آزاد کی ترجمہ نگاری، مولانا آزاد اور علمی اصطلاحات، مولانا آزاد اور سائنسی علوم، مولانا آزاد کے سائنسی مضامین، الہلال اور تحریک آزادی، خطبات آزاد اور جدوجہد آزادی، قول فیصل جدوجہد آزادی کی پرعزم تحریر مولانا آزاد کا سیاسی تدبر، غبار خاطر دانشوروں کی نظر میں، کاروان خیال کے مکتوبات، مولانا آزاد اور فنی تعلیم، مولانا آزاد قرآن اور سائنس، ترجمان القرآن کی چند لفظیات، تعبیرات اور تشریحات، مولانا آزاد اور اردو یونیورسٹی۔ ان تمام مضامین میں آخری مضمون ایسا ہے جسے صرف اس لیے لکھا گیا ہے کہ ملک کی ایک یونیورسٹی کا نام مولانا آزاد کے نام پر رکھا گیا ہے۔ وہ حقیقت میں اس مضمون کا مولانا آزاد سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اگر تعلق ہے تو وہ اتنا کہ وہ آزادی سے قبل ہندوستان کی عبوری حکومت میں وزیر تعلیم تھے۔ اور آزادی کے بعد ملک کے پہلے وزیر تعلیم مقرر ہوئے۔ اس طرح ان کے وزارت تعلیم میں گیارہ سالہ تجربات کی روشنی میں اس مضمون کی اہمیت اور ضرورت بڑھ جاتی ہے گویا اس مضمون کو منہا کردینے کے بعد جو مضامین موجودہ کتاب میں شامل ہیں وہ مولانا آزاد کی تقریبًا پوری شخصیت اور کارناموں پر روشنی ڈالتے ہیں اور شاید بہت ہی کم کوئی گوشہ ایسا باقی رہ جاتا ہے جس کی مولانا کی شخصیت اور خدمات کے پیش نظر کمی محسوس کی جاسکے۔ اس طرح یہ کتاب عہد حاضر میں مولانا آزاد کی مکمل شخصیت کو سمجھنے اور کم

وقت میں سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ نہ صرف مولانا آزاد کے شائقین بلکہ یونیورسٹی کے ان طلباء اور طالبات کے لیے بھی کارگر ہے جن کے کورس میں بھی مولانا آزاد کا پرچہ شامل ہے۔ اس طرح ڈاکٹر وہاب قیصر کی یہ کاوش بہت کارگر اور فائدہ مند ہے انھوں نے ان مضامین کے ذریعہ مولانا آزاد کی شخصیت اور کارناموں کو یکجا مہیا کر دیا ہے اس اعتبار سے بھی یہ کتاب سود رساں اور مفید ثابت ہوگی۔

سونی پر چھائیاں (مجموعۂ کلام)

شاعرہ: شائستہ یوسف
مبصر: ڈاکٹر تو قیر احمد خاں
قیمت: ۵۰۰ روپے
ناشر: اردو اکیڈمی، بنگلور
ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمٹیڈ اُردو بازار
جامع مسجد دہلی۔۱۱۰۰۰۶

یہ کتاب شائستہ یوسف کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ کتاب کے تقریباً تین چوتھائی حصے میں نظمیں اور ایک چوتھائی حصہ میں غزلیں ہیں۔ تمام نظمیں جدید رجحان کے تحت لکھی گئی ہیں جن میں ایک بھی پابند یا قدیم اصناف سخن کے مطابق نہیں ہے۔ ہمارے عہد میں نظم کی نئی اصناف، نظم معری، آزاد نظم اور اب تو نثری نظمیں بھی بڑی تیزی سے رواج میں آرہی ہیں۔ نئے چلن اور نئے رجحان سے متاثر ہو کر شائستہ یوسف نے اپنی شاعری میں یہ طور اپنایا ہوگا۔ نظموں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں فکر کی گہرائی اور خیالات کا بہاؤ ہے۔ جدید ہیئتی تجربے کو اپناتے ہوئے ہر ایک نظم کسی نہ کسی موضوع پر لکھی گئی ہے جس میں شاعرہ کا درد اور انسانی رشتوں کی بے چینی نظر آتی ہے۔ نظمیں گرد و پیش کے ماحول سے وابستہ ہیں۔ ان میں انسان کی تباہی، اخلاق کی پستی گردش ایام کی شکایت اور انسان کی بے بسی اور بے چارگی نمایاں ہے۔ شاعرہ نے اپنے اظہار کے لیے زیادہ تر اسلامی روایات اور اساطیر کو ذریعہ بنایا ہے۔ ان کا ذہن شفاف ہے۔ شاعری، فن اور کائنات کے بارے میں ان کا نظریہ واضح ہے۔ کہیں کہیں قدرت کے کرشمے حاوی ہیں اور انسانی مجبوری کا احساس دلایا گیا ہے۔ خیالات اور موضوعات کے اعتبار سے یہ نظمیں بہت عمدہ اور نفیس ہیں لیکن ان کے اظہار کے لیے جو فورم اپنایا گیا اگر وہ بھی عمدہ اور نفیس ہوتا تو سے اور مینا دونوں ہی قابل تعریف ہوتے۔ یہ شاعرہ کی ذاتی پسند ہے کوئی ان پر اظہار خیال کیوں کرے۔ غزلیں تمام کی تمام بحر و وزن اور غزل کی فارم میں ہیں اور غزل کی کلاسیکی روایت کے مطابق ہر ایک شعر پُر اثر ہی نہیں یاد رکھنے لائق ہے جبکہ نظموں کا ایک بند بھی یاد نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ جدید اور کلاسیکی شاعری کا فرق ہے۔ غزل کا جادو دیکھئے کہ اپنی پرانی شکل کو برقرار رکھتے ہوئے آج بھی محبوب اور مقبول ہے۔ غزلوں میں زیادہ تر جو پیکر استعمال ہوئے ہیں ان میں روشنی، نور، چراغ، بجلی اور چمک وغیرہ بار بار آتے ہیں جو شاعرہ کے ذہن کی

ضوفشانی یادنیا کے اندھیرے میں جلاطلبی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔مظاہر فطرت کے استعمال کے علاوہ زنداں اور ''دریچہ'' بھی پائے جاتے ہیں جو زندگی کی گھٹن اور انسانی مجبوری کی طرف ذہن کو منعطف کرتے ہیں۔'' اندھیرا'' اور ''اُجالا'' زندگی کی دھوپ چھاؤں، خوشی اور غم کے نمونے ہیں جن سے کسی انسان کو کسی بھی طرح سے فرار ممکن نہیں۔غرض شائستہ یوسف کی شاعری میں جو اقدار نظر آتی ہیں وہ نہایت مضبوط اور مستحکم ہیں۔ان کی شاعری کی امیجری وقت کے ساتھ بہہ جانے والی نہیں بلکہ بے حد پائیدار ہے۔ان کی شاعری ان کا ایک خواب نظر آتی ہے جس کی تکمیل کی تمنا دل میں مچل رہی ہے۔''سونی پر چھائیاں'' اُن کی نظم ''درپن کی سونی پرچھائیاں'' سے ماخوذ ہے، جہاں دنیا کی موجود چهل پہل میں ساری خوشیاں اور ترقی یافتہ زمانے میں اعزاز وانعام کے باوجود انسان کی تنہائی ختم نہیں ہوتی اور قلب کا اطمینان نصیب نہیں ہوتا۔یہی شائستہ یوسف کا فکر اور نظریہ ہے کہ انسان تمام مسرتیں مل جانے کے بعد بھی غمگین سوگوار اور پژمردہ ہے۔ان کی شاعری کا لہجہ نسائی ہے جس میں نسائیت کے ساتھ ساتھ جگہ جگہ عورت کا کردار نظر آتا ہے۔''سونی پرچھائیوں'' سے منتخب چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

کہیں نغمے کہیں فسانے ہیں
شاعری کی گداز بانہوں میں
آنکھ لگنے بھی نہ پاتی کہ چونک اٹھتی ہوں
کبھی جنت کا مزہ ہے کبھی دوزخ کا عتاب
میری باتوں میں کھنک ہے مری آنکھوں میں چمک
گھل جاؤں تیرے جسم میں یہ چاہتا تھا جی
سمجھ میں آتی ہے بادل کی آہ وزاری اب
سمجھ میں آتا نہیں زندہ ہیں کہ مردہ ہیں

تجھ سے ملنے کے سب بہانے ہیں
کچھ ادھورے مرے فسانے ہیں
موت کا خوف ہی خوابوں سے جگاتا ہے مجھے
ہے عجب وقت ہنساتا ہے رلاتا ہے مجھے
کون یہ نت نئے زیور سے سجاتا ہے مجھے
لیکن حجاب سا تھا ترے میرے درمیاں
وہ مہربان مجھے بھی بہت رلاتا ہے
کبھی تو مارتا ہے اور کبھی جلاتا ہے

ہلکی، ٹھنڈی، تازہ، ہوا

شاعر: ظفر گورکھپوری

مبصر: عبدالاحد ساز

قیمت:-/150 روپے

ملنے کا پتہ: نئی کتاب پبلشرز، D-24، کالندی کنج مین روڈ، ابوالفضل انکلیو پارٹ-I، جامعہ نگر، نئی دہلی- 25

''ہلکی ٹھنڈی تازہ ہوا'' ظفر گورکھپوری کے تقریباً نصف صدی سے جاری طویل شعری سفر کا ساتواں پڑاؤ ہے، ان کا پہلا شعری مجموعہ ''تیشہ'' 1962ء میں شائع ہوا تھا۔جس کے بعد اس پورے عرصے میں وادیٔ سنگ، گوکھرو کے پھول، چراغِ چشم تر، آر پار کا منظر اور زمین کے قریب، منظر عام پر آ کر ادبی وعوامی قبولیت سے سرفراز

ہوئے۔ بچوں کے لئے کہی گئی نظموں کے دو مجموعے 'ناچ رہی گڑیا' اور 'سچائیاں' ان پر مستزاد ہیں۔ اتنے طویل تخلیقی مراحل طے کر چکنے کے بعد زیرِ نظر کتاب میں شاعر کی تازہ دمی و تازہ کاری کو قارئین یقیناً محسوس کریں گے۔ جس کی واضح وجہ یہ ہے کہ ظفؔر کی شاعری شروع ہی سے اپنی ذات اور اپنے عہد کے افکار و محسوسات کے باہمی رشتے کو متواتر منعکس کرتی چلی آئی ہے۔ ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر آغازِ سخن کے بعد جہاں ان کی شاعری میں ایک موڑ آیا، وہاں بھی انہوں نے ترقی پسند شاعری کے جمالیاتی پیرایوں اور موضوعاتی انسلاکات کو ''انحراف برائے انحراف'' کی منفی بنیادوں پر ترک نہیں کیا۔ اسی طرح جدیدیت کو بھی محض فیشن یا چلن کے طور پر نہیں بلکہ احساس وشعور کی کھلی آنکھوں کے ساتھ قبول کیا، جس کی وجہ سے جدید شاعری کا وہ معتوب حصہ جو بے جا ابہام' داخلیت اور لایعنیت سے عبارت تھا، ان کے کلام میں راہ ہی نہ پا سکا۔ اب جب کہ مابعد جدیدیت، کی اصطلاح کے تحت ادب میں روایات کی بازیافت، سماجی سروکار اور قاری کے ساتھ تخلیق کار کی راست رشتگی کی بات چل رہی ہے تو یہ سارا سامان ظفؔر کے یہاں پہلے ہی سے فراہم ہے کہ زندگی اور معاشرے سے ان کی شاعری کبھی الگ رہی ہی نہیں۔

سو غزلوں اور بائیس نظموں پر مشتمل زیرِ تبصرہ شعری تصنیف میں جو تازہ تر اظہاری جہت ہے، وہ انسانی معاشرے اور نظامِ قدرت کے بگڑتے ہوئے باہمی توازن اور اس (Ecological Disbalance) کی وجہ سے پیدا ہونے والے فطری، سائنسی، معاشرتی، جذباتی اور نفسیاتی مسائل، اندیشے اور خدشات سے منسوب ہے۔ اس رو سے چند شعر ملاحظہ ہوں:

بڑھ رہا ہے آدمی پھر سے انہیں غاروں کی سمت ۔۔۔ اہل دانش کی ہمہ دانی کہاں لے جائے گی

سارا سیارہ ہے زہریلے دھوئیں کی زد میں ۔۔۔ پنچھی کس دیس میں کس حال میں کیسے ہوں گے

دعا، مکاں، آنسو کچھ نہیں ہے کچھ دنوں سے ۔۔۔ زمینوں کی یہ دنیا بے زمیں ہے کچھ دنوں سے

ارض و سما، ہم تم، سب اس کے نشانے پر ۔۔۔ ایک ذرے نے کیسی قیامت کردی ہے

اور نظم ''میرے چراغوں کو دفن کردو'' کا یہ اقتباس بھی جو تیزی سے مصنوعیت اختیار کرتی ہوئی دنیا اور پھیلتے ہوئے جزیشن گیپ کا المیہ ہے۔

تو میرے بچو!
نئے زمانے میں جینے والو
بلند دیواروں اور اونچی چھتوں کے نیچے
نئے کھلونوں کے ساتھ
مصنوعی زندگی تم کو راس آئے
میرے چراغوں کو میرے ہمراہ دفن کردو
اندھیری دنیا تمہیں مبارک۔

دیگر تحرکات و موضوعات کے علاوہ جن میں رومانویت، جمالیات اور آفاقی انداز وحقائق کے ادراک تنوعات شامل ہیں، دو اور جہتیں ہیں، جنہیں گاؤں سے شاعر کی باطنی مناسبت اور شہر میں گزارے ہوئے طویل عرصے کے کرب ومحن کے وسیع خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ گاؤں ظفر گورکھپوری کی شاعری میں 'ماضی قریب' کے نہیں بلکہ ''ماضی جاری'' کے صیغے میں زندہ ہے۔ کہیں یادِایام (ناسٹیلجیا) کی آسودگی کے ساتھ، کہیں بچھڑ جانے کی کسک لئے ہوئے اور کہیں مراجعت کی موہوم خواہش کے طور پر ہے۔

مٹی تجھ سے کیا رشتہ ہے جس دن ہم نے چھوڑا گھر — دیر تلک دیواریں روئیں، دور تلک ساتھ آیا گھر
مولوی کی بید، بچپن ماں کی آنکھیں، پہلا عشق — ذہن میں محفوظ ہے سب کچھ، بھلایا کچھ نہیں
اتنا ہی بچوں نے گھر کا کونا کونا چھان لیا — چوروں جیسا کیسا چھپا ہے دادا کی پگڑی میں چاند

اور اس کے برخلاف ممبئی جیسے جدید صنعتی شہر میں گزران کے تجربے اپنے حسی، جذباتی اور فکری ردعمل کے ساتھ غزلوں اور نظموں میں جابجا بکھرے پڑے ہیں۔

ہمیں نے اس کے لئے راستے بنائے تھے — کہ گھر تک آگیا بازار، یہ تو ہونا تھا
درکا رخ بدلا گیا، دیوار سرکائی گئی — یہ ضرورت تھی کہ تبدیلی کسی ڈر سے ہوئی
مسائل، شور، مہنگائی، ضرورت، وحشتیں، نعرے — بہت بچھو ہیں رستے میں، سنبھل کر گھر سے باہر آ
دور تک بھیڑ مسائل کی، سوالوں کے ہجوم — کیا ہنر والے ہیں بچ بچ کے نکلتے ہوئے لوگ

سب اپنے آپ میں الجھے ہوئے ہیں
کسی کہ پاس رک کر سوچنے کا وقت
نہ کچھ کرنے کی فرصت
سڑک پر لاش ایک کب سے پڑی ہے
کوئی کیوں مڑ کے دیکھے
اٹھے خود لاش
اور پیروں سے اپنے
چتا یا قبر تک جا پائے تو جائے

(نظم، ڈڈ۔Dead)

عہد حاضر کی شہری زندگی کا یہ تجربہ ایک طرف جب پھیل کر شاعر کے اندرون میں اترتا ہے اور دوسری طرف جب زمانے اور تاریخ کے ابعاد تک رسائی اختیار کرتا ہے تو کئی گہرے اور وسیع کینویں کے اشعار معرض وجود میں آتے ہیں۔ مثال کے طور پر دو شعر علی الترتیب شرف نظر ہوں۔

آئینہ ان سے شناسا، نہ تو پتھر واقف — آج انسان کے حصے میں جو حیرانیاں ہیں
جب ایک لمحے کو اپنے بس میں کرنا اتنا مشکل ہو — زمانے اتنے سارے کس طرح مٹھی میں آئیں گے

اسی سیاق میں نظم ''زہر کارخ'' کا کلائمکس بھی ملاحظہ ہو۔

یہ میرے خون میں جو بہہ رہا ہے زہر
اس کا توڑ کس منتر سے ہوگا
کہاں منتر کوئی ایسا
کہ میں نے زہر کارخ کر دیا ہے کل کی جانب
کہ میں نے سینگ اپنے
اگار کھے ہیں آنے والی نسلوں کے سروں پر
مجھے آسان ہوگا مارنا کیا۔؟

جن قارئین کے ذہن میں ظفر گورکھپوری کا شعری سفران کے گزشتہ مجموعوں کے توسط سے اجاگر ہے وہ اس کتاب میں بھی ایک قدر مشترک کے تواتر کی توثیق کریں گے اور وہ ہے زندگی کے ساتھ پیہم کمٹمنٹ اور مثبت رجائی رویہ۔ تمام تر ذاتی کلفتوں اور معاشرتی المناکیوں سے گزرتے ہوئے شاعر نے زندگی سے محبت اور دائمی سچائی پر اپنے اعتماد کو مستحکم رکھا ہے۔ چنانچہ یاس وحرماں کے غبار میں عزم وامید کی شعاعیں اور زندگی کے حق میں کچھ اپنی سی کرگزرنے کے جذبے کی مشعلیں برابر جھلملاتی رہتی ہیں۔

تو نے جو درد کی دولت ہمیں دی تھی، اس میں
کچھ اضافہ ہی کیا، ہم نے خیانت نہیں کی
غرق تو ہونا ہے، پر جتنی بھی مہلت ہے نصیب
ہم کوئی نقش ہی پانی پہ بنا کر دیکھیں

کتاب کے پیش لفظ کے طور پر شامل ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی کے مبسوط مضمون کا آخری جملہ ''ظفر گورکھپوری کی بدولت اردو، غزل میں پچھلی کئی دہائیوں سے ایک ہلکی ٹھنڈی تازہ ہوا چل رہی ہے'' ظفر کی شاعری کی قدر و قیمت کا تعین کرتا ہے۔ جیسے فلیپ پر درج مشاہیر کی مختصر آراء اور مہمیز کرتی ہیں۔

آزادی کے بعد ہندوستان کا اُردو اَدب

مصنف: محمد ذاکر
قیمت: 275 روپے
مبصر: منور حسن کمال
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس 3108 وکیل اسٹریٹ، کوچہ پنڈت لال کنواں، دہلی۔٦

ہندوستان کی آزادی کے بعد جہاں پورا ملک اتھل پتھل کا شکار تھا، سماجی اقدار اپنی جڑوں کی تلاش میں

سرگرداں تھیں اور ادبی اقدار یکسر تھم سی گئی تھیں، ایسے ماحول میں ہمارے ادبا اور شعرا اردو ادب کی سابقہ روایات کی روشنی میں اس کی یکجائی کے لئے کوشاں تھے۔ زیرنظر کتاب 'آزادی کے بعد ہندوستان کا اُردو اَدب' میں جو ڈاکٹر محمد ذاکر کا تحقیقی مقالہ ہے، اس دور کے اردو ادب کے رجحانات اوران کے تجزیے کی کوشش کی گئی ہے۔

۱۵راگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کی سیاسی، سماجی بلکہ ایک حد تک ادبی تاریخ میں نئے سورج کی پہلی کرن سے تشبیہ دیا گیا ہے۔ یہیں سے اس مقالے کا آغاز ہوتا ہے اور اردو ادب کے اس مطالعے کو ۱۹۶۲ء تک محدود رکھا گیا ہے۔ اگر چہ یہ ایک مختصر زمانہ ہے، لیکن کہا جاتا ہے، وہ لمحات جو سالہاسال کی آرزوؤں کی تکمیل اور قومی جدوجہد کا حامل ہوں صدیوں پر بھاری ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے اس کتاب کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

ڈاکٹر محمد ذاکر نے گہرائی اور گیرائی کے ساتھ ان سولہ برسوں کے اردو ادب کا محاکمہ کیا ہے، جہاں سماجی اور تاریخی سطح پر ادب نئی کروٹیں لے رہا تھا۔

یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں آزادی سے پہلے کا اردو ادب پر گفتگو کی گئی ہے، جس کے ذیل میں تین ادوار کے تحت مصنف نے اپنی بات واضح کی ہے۔ دور اول 1857 تا 1918 میں اصلاح پسندی، حب الوطنی اور قومیت پرستی پر گفتگو کی گئی ہے۔ مصنف کی رائے ہے کہ اس دور کے ادب کو انقلاب اور کسی حد تک اس کے ردعمل (اکبر) معروضیت پسندی، نیچرل ازم اور حقیقت نگاری (ادبی مقصدیت) کی ابتدا اور اس کے اثرات مرتب ہونے کا دور کہنا چاہئے۔ دور دوم 1919 تا 1936 میں حریت پسندی کو موضوع گفتگو بنایا گیا ہے۔ اس کو ہندوستان کی عام بیداری کے دور سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ دور سوم 1937 تا 1947 ترقی پسندی کا دور ہے۔ اس کے تحت مصنف نے قومی زندگی پر جنگ کے اثرات کا بھی ذکر کیا ہے۔

دوسرا باب آزادی اور آزادی کی چھاؤں ہے، جس میں مصنف نے اس سیاسی اور سماجی فضا کے خدوخال واضح کرنے کی کوشش کی ہے، جو تقسیم ہند، فرقہ وارانہ فسادات، شرنارتھیوں کی ہندوستان میں آمد، ہندوستان کے لسانی مسئلے، بین الاقوامی ذمہ داریوں کے احساس، محکوم اقوام کی جدوجہد آزادی میں دلچسپی، ہندوستان میں آہستہ روی سے بدلتی ہوئی سماجی زندگی، تشدد آمیز انقلاب پسندی کی تحریک کی نعرہ بازی اور اس کے خاتمے سے عبارت ہے، باب سوم جس کا عنوان آزادی کے بعد ہندوستان کا اردو ادب ہے، جو دراصل کتاب کا نام بھی ہے، اس کے تحت عالمی سیاسی صورت حال اور ہماری شاعری پر محنت شاقہ اور دقت نظر کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، اس کے ذیل میں اس دور کی غزل، نظم، طنز و مزاح اور دیگر اصناف ادب کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔ باب چہارم کا بھی درج بالا عنوان ہے جس کے ذیل میں اس دور کے ناول، افسانہ، ادبی تحقیق، ڈرامہ، طنزیہ ومزاحیہ مضامین اور پیروڈی کے ساتھ ساتھ رپورتاژ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

کتاب کے آخر میں اشاریہ پیش کیا گیا ہے، جو سابقہ ایڈیشن میں نہیں تھا۔ گویا یہ ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

ڈاکٹر محمد ذاکر نے اس وسیع ادبی منظر نامے کا بڑے انہماک سے تحقیقی وتنقیدی مطالعے کر کے ایسا شہ پارہ ترتیب دیا ہے، جس کی اہمیت کم وبیش نصف صدی کے بعد آج بھی اتنی ہی ہے، جتنی اس وقت محسوس کی گئی تھی،

جب یہ مقالہ تحریر کیا گیا تھا اور شایع ہوا تھا۔

آزادی کے بعد ہندوستان کا اردو ادب کی دوبارہ اشاعت پر ڈاکٹر محمد ذاکر ہم بے بضاعتوں کی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں مزید حوصلہ علم وقلم بخشے۔ آمین!

میرے ڈرامے لندن میں

مصنف: شمس الدین آغا

مبصر: منور حسن کمال

قیمت:=/400روپے، 5برطانوی پونڈ

ناشر: Adshot Publications, 104-B, Asmita III, Naya Nagar, Mira Road (E) Mumbai

ہندوستان میں فلم اور ڈرامے کا سب سے بڑا مرکز ہمیشہ سے ممبئی رہا ہے، وہاں فلمیں بنائی جاتی رہی ہیں اور ڈرامے اسٹیج کیے جاتے رہے ہیں۔ گزشتہ صدی کی چوتھی دہائی میں ممبئی جب بمبئی تھا اسی شہر کے ماحول میں زیر تبصرہ کتاب 'میرے ڈرامے لندن میں' کے مصنف شمس الدین آغا نے آنکھیں کھولیں۔ فلم اور ڈرامے کا خمیر شمس الدین آغا کی روح میں ساتھ ساتھ ہی سمایا۔ انہوں نے ڈرامے کی ابتدا اپنے تعلیمی دور میں ہی کردی تھی پھر جب وہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد لیکچرر ہوئے تو باقاعدہ انہوں نے اردو ڈرامے لکھنے کے ساتھ ساتھ ان کو اسٹیج بھی کرنا شروع کردیا۔ 1964 میں جب لندن پہنچے تو یہ شوق وہاں بھی ساتھ ساتھ چلا گیا۔ لندن میں ڈراموں کا شاندار ماضی رہا ہے اور وہاں آج بھی ڈرامے اپنی دیرینہ روایات کے ساتھ اسٹیج کیے جاتے ہیں۔

لندن میں اردو ڈرامہ پیش کرنے کے لئے بڑی محنت کرنی پڑتی ہے، سب سے اہم بات یہ ہے کہ ڈرامہ کی زبان ایسی اختیار کی جاتی ہے، جو سامعین اور شائقین فوراً سمجھ جائیں۔ اس لئے کہ لندن اگرچہ اردو کی نئی بستیوں میں شمار کیا جانے لگا ہے، لیکن آج بھی وہاں اردو پڑھنے والوں کے مقابلے اردو سمجھنے والوں کی تعداد زیادہ ہے۔ یہی وہ طبقہ ہے، جو اردو ڈراموں کی جانب کھنچا چلا آتا ہے۔

شمس الدین آغا چوں کہ لندن میں کم وبیش نصف صدی سے رہائش پذیر ہیں، اس لئے وہ وہاں کے مسائل بخوبی سمجھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ڈراموں میں ایسی زبان استعمال کی ہے، جو راست طور پر ناظرین وسامعین کے دلوں میں اتر جاتی ہے، مصنف نے اپنے ڈراموں میں برصغیر ہندوپاک اور بنگلہ دیش تک کے لوگوں کے مسائل پر بھی روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

اس کتاب میں 8 ڈرامے پیش کئے گئے ہیں، جن کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اگر اسٹیج پر دیکھے جاتے تو واقعی بڑا دلچسپ منظر ہوتا۔ پہلا ڈرامہ ''فلائٹ جو چھوٹ گئی'' ہے۔

یہ ایک سادہ اور آسان سا ڈرامہ ہے، اس ڈرامے کا تانا بانا ہمارے سماج میں موجود خرافات، جہالت اور ریاکاری کی بعض مثالوں سے بنایا گیا ہے۔ اس میں تضادات کی طرف بھی اشارے کیے گئے ہیں۔ مزاحیہ کی

حدیں وہاں شروع ہوتی ہیں، جہاں ایسے کی حدیں ختم ہوتی ہیں گویا قہقہوں کے سیلاب میں سماج کی مجروح آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں۔

دوسرا ڈرامہ ٹیپو سلطان ہے، اس ڈرامے میں یہ دکھایا گیا ہے کہ جیت کیا ہے؟ اگر جیت مخالف پر فتح پانے کا نام ہے تو ٹیپو سلطان کو جیت حاصل نہیں ہوئی۔ اس کے باوجود ٹیپو سلطان زندہ ہے، وہ لوگ جنہوں نے ٹیپو سلطان کو شہید کیا قعر مذلت میں کھو گئے۔ ساتھ ہی ٹیپو سلطان ان لوگوں کی فہرست میں زندہ ہیں، جنہوں نے دنیا میں عظیم کارنامے انجام دیے۔ ٹیپو کی داستان کو شمس الدین آغا نے ڈرامائی انداز میں پیش کر کے اردو ادب کو ایک تحفہ دیا ہے۔

'لندن کی ہوا' میں مصنف نے ان لوگوں کے مسائل کو اجاگر کیا ہے، جو لندن میں رہتے ہیں، لیکن وہاں کسی کے دھوکے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ خاص طور پر شادی بیاہ کے معاملوں میں اور ان لوگوں کا بھی جو ایک ایک قدم شادی کے سلسلے میں احتیاط کے ساتھ اٹھاتے ہیں۔ 'شرابی' میں شرابی کی برائیوں کی جانب خوبصورت پیرایہ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ 'سینٹر ہر ایک دن' ایسا ڈرامہ ہے، جہاں آپس میں لوگ ایک دوسرے کے خیالات سے آگاہ ہوتے ہیں۔

'جرم الفت' سلیم، انارکلی، گلنار، جودھابائی اور اکبر کی کہانی پر مشتمل ہے، جس میں مصنف نے محبت کرنے والوں کی صحیح رہنمائی کی کوشش کی ہے۔ 'مرزا غالب لندن میں' ان کا معتبر ڈرامہ ہے، جس میں غالب جنت سے وہاں آتے ہیں اور اردو کی زبوں حالی پر ماتم کناں ہوتے ہیں، لیکن انہیں یقین دلایا جاتا ہے کہ اردو زندہ رہے گی۔

'بات ایک رات کی' میں ان فلمی رائٹرز کی نفسیات کو اجاگر کیا گیا ہے، جو پروڈیوسر کے پلان کے مطابق فلمی کہانیاں اور ڈائیلاگ قلم بند کرتے ہیں۔ پھر ایک رائٹر اپنی بیوی اور اس کے سابق بوائے فرینڈ جو پھر اس سے ملنے لگا ہے، کو جدا کرنے کے لئے ایک کہانی بنتا ہے، لیکن خود ہی اس کا شکار ہو جاتا ہے۔

شمس الدین آغا نے ڈراموں پر اپنی گرفت مضبوط رکھی ہے، کہیں بھی جھول کا اندازہ نہیں ہوتا، کتاب کو خوبصورت گیٹ اپ اور نفیس کاغذ نے مزید دیدہ زیب بنا دیا ہے۔ انہیں اس کتاب کی اشاعت پر بے شمار مبارکبادیاں پیش کرنے کو جی چاہتا ہے۔

گل صد برگ (قرۃ العین حیدر کے مضامین کا مجموعہ)

مرتب: ڈاکٹر مجیب احمد خاں
سن اشاعت: 2006ء
قیمت: 120 روپئے
تبصرہ نگار: ڈاکٹر عفت زرین

قرۃ العین حیدر ہمارے عہد کی عظیم فن کار ہیں، جنہوں نے ہندوستان کے تہذیبی دھاروں کے مربوط تسلسل کو ضبط تحریر میں لانے کی کامیاب کوشش کی انہوں نے ملک کے بدلتے ہوئے منظر نامے کو اپنی فن کارانہ

صلاحیتوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ان کی کہانیاں اور ناول ہند آریائی تہذیب سے لے کر جاگیردارانہ نظام تک آزادی کے بعد عالمی سطح پر پیش آنے والے مسائل کی ادبی نقطہ نظر سے ترجمانی کرتے ہیں اور ان کی تخلیقات اپنی اس معراج کو چھوتی ہوئی نظر آتی ہیں، جہاں سے ہم ایک اعلیٰ فن پارہ کی شناخت کرتے ہیں۔ان کے فنی کمالات کا یہ جوہر کم وبیش ان کی تمام تخلیقات میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

''گل صد برگ'' جس کے لفظی معنی ہیں پھول کی بہت ساری پتیاں، مگر یہ لفظ گیندے کے پھولوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے گلاب کے لئے نہیں، مگر پتیاں چاہے گیندے کی ہوں یا گلاب کی، دونوں کی اہمیت کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس کتابی مجموعے کو یہ نام دیا گیا ہے۔اس مجموعے میں قرۃ العین حیدر کے ان مضامین کو یکجا کیا گیا ہے، جواب تک مختلف اخبارات ورسائل میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے۔اس مجموعۂ مضامین میں مندرجہ ذیل عنوانات پر نگارشات قلم بند کی گئی ہیں۔

(۱) قرۃ العین حیدر (آپ بیتی) (۲) اردو ناول کا مستقبل (۳) ادب اور خواتین (۴) ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے (۵) انیس قدوائی کی ادبی خدمات (۶) بیگم شائستہ سہروردی اکرام اللہ (۷) ہماری سلطانہ آپا (۸) جو مجھکو تو شاخِ گلاب ہوں...... (۹) ڈاکٹر رفیق زکریا (۱۰) ہماری رشیدہ آپا (۱۱) جشن گلزار (تقریر) (۱۲) الٰہی یہ جلسہ کہاں ہو رہا ہے (۱۳) ایک منفرد خاتون ہماری حسینہ آپا (۱۴) یہ خلد بریں ارمانوں کی۔

تمام مضامین اپنے موضوع کے اعتبار سے اپنی ایک الگ اہمیت کے حامل ہیں اور اپنے قاری کو اپنے ساتھ باندھنے کا فن ان کے ان مضامین سے بخوبی سیکھا جاسکتا ہے۔

بہر حال اس کتاب کا پہلا مضمون قرۃ العین حیدر کی آپ بیتی ہے۔یہ مضمون ریسرچ کرنے والوں کے لئے کافی اہم ہے۔کیونکہ انہوں نے اس مضمون میں صرف اپنے بچپن کی زندگی قلم بند نہیں کی ہے، بلکہ ادبی دنیا کی اپنی ابتدائی کاوشوں کا ذکر بھی کیا ہے اور ان افسانوں کے نام بھی تحریر کیے ہیں، جو ضائع ہو چکے ہیں یا اب ہماری پہنچ سے باہر ہیں۔

سیریا میں دس روز

مصنف: ف س اعجاز

قیمت: ۲۵۰روپے

مبصر: ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی

طابع وناشر: انشاء پبلیکیشنز B 25 زکریا اسٹریٹ، کلکتہ 700073

زیر نظر کتاب مصنف کا دوسرا سفرنامہ ہے۔اس سے قبل وہ اپنا ''یورپ کا سفرنامہ'' شائع کر چکے ہیں۔اعجاز ہندوستانی دانشوروں کے ایک وفد کے ساتھ ملک شام کے سفر پر گئے تھے۔یہ وفد شام کا مہمان تھا۔اس لئے وہاں کی تقاریب میں شرکت کی بنا پر وہ بے حد مصروف بھی رہے۔پھر بھی انہوں نے اپنے فطری ذوق تحقیق وتحسین سے

اپنے لئے وہ وقت بھی نکالا، جس میں انہوں نے تمام مقامات کو بخوبی دیکھا اور وہاں کے مقامی باشندوں سے مل کر وہاں کی تہذیب، طور طریقے، رسم و رواج کا بھرپور مطالعہ کیا اور اس طرح اس سفرنامے کو تاریخی، جغرافیائی، سماجی اور معاشرتی معلومات کا خزانہ بنا دیا ہے۔ اس کے مطالعے کے دوران مجھے بار بار یہ محسوس ہوا کہ میں اپنے گاؤں میں رہتے ہوئے شام کے ان تمام دیدنی مقامات کی سیر میں ان کا شریک سفر ہوں۔ کسی سفرنامہ کا یہی پیرایۂ اظہار اس کی اہمیت و افادیت کا ضامن ہوتا ہے۔ سفرنامے میں بہت سی اہم جگہوں کی تصاویر کی شمولیت مثلاً شام کی بارونق مساجد، مندروں، مزاروں، بازاروں اور پہاڑوں وغیرہ نے کتاب کو ایک ایسی فلم کا روپ دے دیا ہے جو اپنے ہر قاری کو غرق حیرت کر کے اسے بار بار دیکھنے اور دیکھتے رہنے کے لئے اکساتی ہے۔ اعجاز صاحب نے شام کے مختصر لمحاتِ قیام میں، اپنے مقصدِ سفر کی ساری تقاریب میں شریک رہ کر بھی، نہ تھکنے والے عزم و حوصلے سے وہاں کی ساری جزوی معلومات مثلاً سیریا کا محل وقوع، درجہ حرارت، موسم، طوالت ساحل، کام کے اوقات، سرکاری تعطیل، زبان، اندرون ملک ذرائع آمد و رفت، مذاہب، سکۂ مروجہ وغیرہ کا مکمل جائزہ اس پونے دو سو صفحات کی کتاب میں جمع کر کے بلاشبہ دریا کو نہیں، بلکہ سمندر کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ عمریت اور مریم گرجا کے ضمن میں کیے گئے انکشافات سے یہ حقائق سامنے آتے ہیں کہ یہیں 1600 ق م میں دنیا کا پہلا اسٹیڈیم بنا تھا جہاں اہل شام کھیلوں کی مشق کیا کرتے تھے۔ آٹھ صدی بعد یونانیوں نے یہاں وہ اسٹیڈیم بنایا جس میں اولمپک کھیلوں کی شروعات ہوئی، یہیں دنیا کا پہلا گرجا بھی ہے جسے ۲۰ء میں بطرس St. Peter نے حضرت مریم کے نام پر قائم کیا تھا۔ حضرت مریم یہاں لوقا کے ساتھ آئی تھیں اور دنیا کی اولین چرچ سروس میں انہوں نے شرکت کی تھی۔ یہیں لوقا نے مریم کی ایک پینٹنگ Icon بنائی جو عیسائیوں میں بہت اہم مانی جاتی ہے۔ اس شہر کی ایک اور اولیت یہ ہے کہ میری چرچ میں دنیا کے اولین حروف کا ایک پتھر پر نقش بھی موجود ہے جو اغاریت Ugarit کی دین ہے۔ یہاں حضرت عیسیٰؑ سے منسوب ایک تلوار اور اس کی میان قابل دید ہے۔ ان تمام اذکار کے علاوہ اس سفرنامے میں ملک شام کی ادبی محفلوں، تفریح گاہوں، حتیٰ کہ نائٹ کلبوں کا بھی دلچسپ ذکر ہے۔ کتاب کا آخری حصہ دردناک ہے۔ چند صفحات میں مصنف نے جسے ''قنیطرہ...... کیا یہ مقتل ہے؟'' کا عنوان دے کر اور بھی غمناک بنا دیا ہے۔ اس میں وفد کی گائڈ مرنا اوغیان کی دلچسپ گفتگو ہے۔ اعجاز صاحب کے مرنا سے پوچھنے پر کہ ''گولان کا کتنا حصہ اسرائیل کا ہے'' تو اس نے غضبناک لہجہ میں جواب دیا تھا۔ اسرائیل کا یہاں کچھ نہیں ہے۔ یہاں سے پچیس کیلومیٹر دور گولان کے پیچھے تک کے گاؤں ہم عربوں کے ہیں۔ (صفحہ 171) ایک اور موقع پر سیریا کے ایک اسپتال کی جانب اشارہ کر کے مرنا نے بتایا تھا۔ آپ دیکھیں یہ ایک بیمارستان ہے۔ جسے صیہونیوں نے اکتوبر میں توپ کے گولوں اور بندوق کی گولیوں سے چھید ڈالا تھا۔ جتنے بیمار اس اسپتال میں تھے سب مر گئے۔ مرد و عورتیں جو علاج کیلئے داخل تھیں، ان کے ہاتھوں اور گلوں سے صیہونی لوگ زیور نوچ کر لے گئے۔ گولان کا ایک حصہ اب تک اسرائیل کے قبضے میں ہے اور اس سوال پر کہ اس جنگ میں کتنے سیریائی مرے، مرنا کا جواب تھا۔ لاتعداد، شمار نہیں، چھ سو گاؤں تلف کر دیئے گئے تھے۔ ملبہ آپ راستے میں دیکھتے آئے ہیں، آگے دیکھیں گے''۔ وہاں ایک

مسجد تھی اس کو بھی یہودیوں نے مسمار کردیا۔ ایک گرجا تھا وہ بھی منہدم کردیا گیا'' (ص168)

شگفتہ اسلوب میں واقعات و مقامات کی منظر کشی کتاب کی دلکشی کا باعث ہے۔ مختصر عرصۂ قیام اور حد سے زیادہ انہماک کے باوجود نہایت جامع معلومات سے پر یہ روداد سفر ایک دلآویز کہانی کے روپ میں پیش کرکے اعجاز صاحب نے اپنے نام کا اعجاز دکھادیا ہے۔

گل نا آشنا

مصنف: نور پرکار

قیمت: 250 روپے

مبصر: منور حسن کمال

تقسیم کار: قلم پبلی کیشنز: 7/17

ایل.آئی.جی. کالونی پائپ لائن روڈ کرلا (مغربی) ممبئی-400070

اردو کی نئی بستیوں میں سے ایک کویت کی سرزمین شعروادب کا ایسا گہوارہ ہے، جہاں اردو کے سپہ سالار اردو کے ساتھ ساتھ وطنِ عزیز کی خوشبو کو پھیلانے میں جان وتن ایک کیے ہوئے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب 'گل نا آشنا' کے مصنف نور پرکار اس قبیل کے لوگوں میں سرفہرست ہیں۔ وہ جب ممبئی کے بانکوٹ علاقہ میں رہائش پزیر تھے، یہاں بھی اردو ان کا اوڑھنا بچھونا تھی اور جب تلاش روزگار نے انہیں کویت پہنچا دیا، وہاں بھی اردو کی زلفِ گرہ گیر کی قید سے خود کو آزاد نہیں کرسکے، بلکہ اس کے پیچ وخم کے ایسے شکار ہوئے کہ عرب ٹائمز اور کویت ٹائمز میں شاعر بہ نگاہ شاعر مستقل کالم شروع کردیا۔ یہ کالم اردو کے شیدائیوں میں اس قدر مقبول ہوا کہ نور پرکار جو دراصل خود بھی شاعر وافسانہ نگار ہیں، اپنی شاعری سے زیادہ دوسروں کی شاعری پر تبصراتی مضامین قلم بند کرنے لگے۔ زیر نظر کتاب اُنہی مضامین کا مجموعہ ہے۔ وہ اگرچہ اب وطن عزیز لوٹ آئے ہیں، لیکن شاعر بہ نگاہ شاعر، ان کا ایسا سلسلہ تھا، جو ایک دستاویزی حیثیت اختیار کرگیا ہے۔ اور اب کتابی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔

خلیجی ممالک میں اردو کو ایک خصوصی اہمیت حاصل ہے، وہاں متعدد انجمنیں ہیں، جہاں شعروادب کی محفلیں سجتی رہتی ہیں۔ اپنے زمانہ قیام میں نور پرکار ان محفلوں کی جان ہوا کرتے تھے۔

اس کتاب میں اکسٹھ (۶۱) شعرا پر مضامین پیش کیے گئے ہیں، جن میں قدیم شعرا میں اکبرالہ آبادی، انشاء اللہ خاں انشا، شیخ محمد ابراہیم ذوق اور نظیر اکبرآبادی شامل ہیں تو گزشتہ صدی کے علی جواد زیدی، قمر مرادآبادی، سہیل غازی پوری، سرور جہاں آبادی اور شاد عارفی پر بھی مضامین کتاب کی زینت ہیں۔ ساتھ ہی دیپک قمر، باقر نقوی، پروفیسر بلبیر روما، ڈاکٹر وزیر آغا، مظہر امام، مظفر حنفی، سیدہ نسرین نقاش وغیرہ پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔ جابجا کویت میں مقیم ایسے شاعروں کا بھی تذکرہ ہے، جن کے نام اردو دنیا میں نسبتاً نئے معلوم ہوتے ہیں۔ چند مثالیں دیکھئے:

حق نواز خرم، اپنے نام کی مناسب سے واقعی حق گوئی کے پرستار ہیں۔اس حق نوازی میں اکابرین کی طرح واضح حقیقتوں کے نرغے سے نکلنے کی قطعی کوئی کوشش نہیں کی، بلکہ ایک شعر میں واضح طور پر اپنے پیشے کا ذکر اس خوبصورتی سے کیا ہے کہ قاری و ناقد داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے:

کپڑے سینے میں رزق لکھا ہے
گرچہ بچوں کا جسم ننگا ہے

رخسانہ مہر علی کی سوچ کا سارارخ فطری قرار پاتا ہے کہ یہ وراثتی شاعرہ ہونے کے زمرہ سے خارج ہیں۔ گہرائی اور گیرائی اور لفظوں کی سچائی اگر توانا جذبوں کے احساس کے ساتھ اجاگر ہوتو زمانے کی تلخیوں کو سمیٹنے کی خو یقیناً وسعت پذیری کی علامت بن جاتی ہے۔

شمس ملتانی نے پھر ایک بار ملتان قلم قبیلہ کی یاد دلائی ہے، جس کے کویت میں روح رواں معروف نعت گو شاعر محمد اقبال سندھو ملتانی ہیں۔

میر عرفانی کے اندر کا شاعر اور انسان نامساعد حالات میں بھی زندہ توانا رہا، جو غم کی بات بھی خوش دلی کے ساتھ بیان کرتا رہا۔ پر وقار لہجے کو ترنم کے ساتھ سامع کو جھومنے پر مجبور کرتا رہا۔

نور پرکار کے یہاں برجستگی اپنی پوری توانائی کے ساتھ نظر آتی ہے، الفاظ ایسے نپے تلے کہ جیسے اسی جملے کے لیے معرض وجود میں آئے ہوں، اوپر سے لہجے کی چاشنی اور گھلاوٹ اپنی جانب راغب کیے بغیر نہیں چھوڑتی۔ گل نا آشنا کی اشاعت پر نور پرکار بلاشبہ مبارک باد کے مستحق ہیں اور یہ ان کا ہم پر ایسا فرض ہے، جس کو ادا کرنا از بسکہ ضروری ہے۔

سیاہ رات (ناول)

مصنف: وکیل نجیب
قیمت:-/250روپے
مبصر: سعدیہ اقبال
ملنے کا پتہ: نجیب منزل، نیر لال اردو اسکول،
مومن پورہ ناگپور 440018 (ایم ایس)

زیر نظر کتاب ''سیاہ رات'' جس کے مصنف وکیل نجیب ہیں، ایک سماجی، سیاسی، ثقافتی اور دور حاضر کے مسئلہ سے دوچار ہونے والا بیانیہ ناول ہے۔ یہ ناول برصغیر کے سلگتے سماجی، سیاسی افکار کا آئینہ دار ہے۔ جیسا کہ اس کتاب کے عنوان سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس میں پریشانیوں کے لامتناہی سلسلہ کا تذکرہ ہے۔ یہاں سیاہ رات سے مراد ظلم وتشدد، بدعنوانی اور بے ایمانی ہے جس سے دور حاضر میں انسان گھرا ہوا ہے اور کسی طرح اس سے فرار ممکن نہیں، مصنف نے اس کے باوجود آسودگی کے راستے ڈھونڈے ہیں اور اپنے عزم مصمم سے سیاہ رات میں بھی روشنی تلاش کر لی ہے۔

ایک ایسا تخلیق کار جس کی زیادہ تر تخلیقات بچوں کے لئے رہی ہوں کیا وہ پختہ ذہن قارئین کے معیار پر بھی کھرا ثابت ہوتا ہے؟ جواب مثبت میں ہے اور اس کی مثال ''سیاہ رات'' کی شکل میں آپ کے سامنے ہے۔

وکیل نجیب کے بارے میں اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ ایک مصنف یا ادیب معاشرے کی آنکھ ہوتا ہے اس لئے وہ معاشرے کے مسائل کو سب سے پہلے دیکھ لیتا ہے۔ نجیب صاحب نے موجودہ صورت حال میں تعلیم یافتہ مسلم نوجوانوں کو دہشت گردی کے الزام میں ملوث کئے جانے کے کرب سے متاثر ہوکر یہ ناول تحریر کیا ہے۔ اس طرح کے واقعات ہندوستان میں ہوں، انگلینڈ میں یا آسٹریلیا میں، نشانہ مسلم نوجوان ہی بنتے ہیں۔ لفظ دہشت گرد مسلمانوں کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ اسی لئے موصوف نے قارئین کو خاص طور پر اس جانب متوجہ کیا کہ آج ہم جن حالات سے نبرد آزما ہیں ان میں کن باتوں پر توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے اور کیسے ان حالات سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔

اس ناول کے اہم کردار اشرفل اور شلوک یعنی (شاداب) ہیں۔ انہی کے اردگرد پوری کہانی گھومتی۔ اس کتاب کی ابتدا بنگلہ دیش کے وجود میں آنے سے ہوتی ہے، ایمرجنسی نافذ ہونے کے سبب حالات بد سے بدتر ہو جاتے ہیں۔ اشرفل وزارت خارجہ میں ایک اہم عہدے پر فائز ہوتے ہوئے بھی ان ہنگامی حالات سے اپنے کو نہیں بچا پاتا ہے، لیکن وہ اپنی سمجھ بوجھ، ایمانداری، لگن اور محنت سے ہر مشکل کا سامنا کرتا ہوا اپنا ملک چھوڑ کر ہندوستان آجاتا ہے۔ ایسے میں سرحد عبور کرتے وقت اسے جن پریشانیوں سے گزرنا پڑتا ہے، مصنف نے ان کی سچی تصویر پیش کی ہے۔ بنگلہ دیش سے ہندوستان تک کے طویل سفر میں جہاں جہاں سے بھی اشرفل کا گزرا ہوا، وہاں کی منظرکشی مصنف نے ایسے کی ہے جیسے وہ اپنے تجربات بیان کر رہا ہو۔

پھر شلوک (شاداب) کی پرورش کا تذکرہ اور پریشانی سے دوچار ہونے کے سبب مصلحتاً اسے مدرسہ میں ڈالا جو کہ ایک ہندو خاندان کا چشم و چراغ ہے اور اس کا خود کا بیٹا نہیں ہے۔ اس کے تئیں اشرفل کی تڑپ اور اس کو اس کا جائز حق دلانے کی ہر ممکن کوشش انسان کی اعلیٰ ظرفی کی عکاس ہے۔

ملک و بیرون ملک مسلم قوم پر ظلم و زیادتی، خاص طور پر ہندوستان میں مسلمانوں پر شرپسند ہندو تنظیمیں کس طرح ظلم کرتی ہیں اور انہیں تشدد کا نشانہ بناتی ہیں لیکن ان مظلوموں کی پولس ایک نہیں سنتی بلکہ انہیں موردالزام ٹھہراتی ہے۔ آخرکار مجبور ہوکر مسلم نوجوانوں کا ایک گروپ ان ظالموں کا مقابلہ اپنی حکمت عملی اور طاقت سے کرتا ہے جس سے وہ ظالم اور شرپسند حواس باختہ ہو جاتے ہیں۔ یہ واقعات مصنف اس طرح بیان کرتا ہے کہ قاری وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دکھائی دیتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ زبان و بیان پر یہ قدرت ناول کا اہم جزو ہے جس میں مصنف کامیاب نظر آتا ہے۔

اشرفل کی زندگی کی طویل مسافت کے الگ الگ پڑاؤ میں کئی خواتین آتی ہیں چونکہ اشرفل جوان ہے اس لئے بشری کمزوریاں اس پر حاوی ہوتی ہیں اور ان سے یکے بعد دیگرے رشتے استوار ہو جاتے ہیں۔ وہ پھر ان سے شادی بھی کرتا ہے لیکن ہر بار کوئی ایسا حادثہ پیش آتا ہے کہ ان کا ساتھ چھوٹ جاتا ہے۔ ایسے موقعوں پر مصنف

بشری کمزوری کا بیان نہایت سلیقہ سے کرگزرتا ہے کیونکہ وکیل نجیب کا ہیرو فرشتہ نہیں اسی دنیا کا انسان ہے اس لئے بہت سی خوبیوں کے باوجود اس سے کچھ غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں جن کا ازالہ وہ شادی کر کے کرتا ہے۔ اشرفل کے مقابلے میں شاداب کا کردار اعلی دکھایا گیا ہے۔ شاداب میں بھی خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں اور بھی اس طرح کی کمزوریوں کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیتا۔

شلوک جواب شاداب کے نام سے ہی جانا جاتا ہے۔ اسے خود اپنا یہ نام (شلوک) معلوم نہیں۔ نہایت خوبصورت، خوش اخلاق، محنتی اور ایماندار نوجوان ہے۔ کسی حادثہ کے سبب معذور ہو جاتا ہے۔ شہر اور آبادی سے دور کسی انجان پہاڑی علاقہ میں نیم جان حالت میں پڑا رہتا ہے۔ اتفاقاً ادھر سے کچھ لوگ گزرتے ہیں۔ شاداب انہیں آواز دیتا ہے۔ اس کی آواز سن کر وہ لوگ شاداب کے پاس آتے ہیں اور اسے اٹھا کر بڑی مشکلوں سے اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ یہ لوگ جہاں رہتے ہیں یہ ایک ایسا گاؤں ہے جس کے چاروں طرف پہاڑی ہے یہاں تہذیب وتمدن اور علم کی روشنی کا گزر تک نہیں۔ اس گاؤں کا سردار شاداب کو اپنے گھر لاتا ہے اور جڑی بوٹیوں سے اس کا علاج کرتا ہے لیکن شاداب کی ٹانگیں ٹھیک نہیں ہوتیں، وہ بیساکھی کے سہارے چلتا ہے۔ شاداب نماز، روزے کا پابند ہے۔ اس کی عبادت کا طریقہ اس گاؤں والوں کے لئے بالکل نیا ہے اس لئے وہاں کے لوگ نماز پڑھتے وقت ایسے بغور دیکھتے اور کبھی کبھی سوال بھی کرتے ہیں۔ شاداب ان کی باتوں کا بڑے پیار سے تسلی بخش جواب دیتا ہے جس سے وہ مطمئن ہو جاتے ہیں۔ شاداب کے طور طریقے، گفتگو کے انداز، اس کی ذہانت اور حسن اخلاق سے گاؤں کے لوگ اس کے گرویدہ ہو جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ پورا گاؤں مشرف بہ اسلام ہو جاتا ہے۔

شاداب اگر چاہتا تو انہیں چھوڑ کر واپس جا سکتا تھا۔ لیکن وہ ایک ہمدرد انسان ہے۔ اسے گاؤں والوں سے سچی محبت ہے لہٰذا معذور ہونے کے باوجود اپنی ذہانت اور حکمت عملی سے اس گاؤں کو ایک مہذب اور ماڈرن گاؤں بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ وہاں کے باشندوں کو علم جیسی دولت سے روشناس کراتا ہے، انہیں تجارت کرنے کا طریقہ سکھاتا ہے اور انہیں آسودہ حال زندگی گزارنے کا ہر ممکن طریقہ بتاتا ہے۔ گاؤں کے لوگ اس کی ہر بات دل وجان سے ماننے کے لئے تیار رہتے ہیں اور اسے پورا تعاون دیتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہاں کے لوگ بڑی تیزی سے ترقی کرتے ہیں۔ جہاں گھروں میں چراغ میسر نہیں تھے، وہ گاؤں بجلی کی روشنی سے جگمگا اٹھتا ہے اور یہ سب شاداب کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

اس گاؤں کی منظر کشی، قدرتی مناظر اور پہاڑیوں کی خوبصورتی کا بیان اتنے فطری انداز سے کیا گیا ہے کہ قاری ان کی دلکشی میں کھو کر رہ جاتا ہے۔

مذکورہ ناول میں مصنف نے ماحول، رہائش اور لباس سے لے کر زبان وبیان کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔ تحریر میں روانی اور تسلسل آخر تک برقرار ہے۔ زبان نہایت شستہ اور عام فہم ہے۔ ناول کا خاتمہ ایک دردناک واقعہ پر ہوتا ہے۔ ان سب کے باوجود بھی مصنف کا حوصلہ بلند ہے اور اسے ''سیاہ رات'' میں بھی روشن مستقبل پنہاں نظر آتا ہے۔ خاص طور پر اس نوجوان طبقے کے لئے جو ان حالات سے دوچار ہے، یہ ناول ایک پیغام ہے۔

اس ناول میں مصنف نے ناول کی جزئیات کو ایک دوسرے سے باندھ رکھا ہے، کہیں بھی موضوع، منظر کشی، زبان و بیان اور کردار نگاری کا دامن ہاتھ سے چھوٹتا نظر نہیں آتا۔ اس لحاظ سے سیاہ رات ایک کامیاب تصنیف کہی جاسکتی ہے۔

اردو نظم کے سلسلے

مصنف: علیم صبانویدی

قیمت: ۵۰۰ روپے

مبصر: ڈاکٹر تو قیر احمد خان

ملنے کا پتہ: تامل ناڈو اردو پبلیکیشنز، چنئی-600002

اردو زبان وادب میں علیم صبانویدی کا مقام اور مرتبہ اس درجہ کو پہونچ گیا ہے کہ فی زمانہ جدید اردو نظم کا کوئی تذکرہ ان کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا ہے۔ اردو شاعری میں ان کی دو حیثیتیں ہیں اول ایک شاعر کی اور دوسری اردو نظم کی تاریخ و تنقید کے ماہر کی۔ اردو نظم میں بھی پابند نظموں کے علاوہ اردو نظم میں جدید رجحانات کے ماتحت آنے والی تبدیلیوں سے انہیں خاص دلچسپی رہی ہے اور انہوں نے آزاد نظموں کی تاریخ تدوین اور تکنیک وغیرہ پر سیر حاصل گفتگو کی ہے بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ آزاد نظموں کے تعلق سے ان کا نام صفِ اول کے ناقدین میں آتا ہے۔ چنانچہ نظم معریٰ، آزاد نظم، ترائیلے، ہائیکو، ثلاثی، نثری نظم اور اس قبیل کی دوسری اصناف شعری پر انہوں نے گئی کتابیں تصنیف، تالیف اور مرتب کی ہیں۔ اردو نظم کے سلسلے بھی علیم صبانویدی کی اُسی قسم کی ایک کتاب ہے۔ اس کتاب کا خاصہ یہ ہے کہ اس میں اردو نظم گوئی کی پوری تاریخ سمٹ کر آگئی ہے اردو نظم کی ابتدا، پابند نظموں کے احتساب و انتخاب کے ساتھ آزاد نظموں کا احتساب و انتخاب بھی شامل ہے۔ اس طرح یہ کتاب نہ صرف پابند نظموں کی معلومات فراہم کرتی ہے اور نہ ہی خالصاً آزاد نظموں کی۔ اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے پہلا حصہ نظم نگاری کے حوالے سے تحقیق و تنقید پر مشتمل ہے اور اس میں کتاب کا مقدمہ خود علیم صبانویدی کا لکھا ہوا ہے۔ جس میں اردو نظم کے آغاز سے لے کر آج تک کی نظم گوئی پر ناقدانہ نظر اس طرح ڈالی گئی ہے کہ اردو نظم کی تاریخ مجروح نہ ہونے پائے۔ اس طرح سے یہ مقدمہ اگر چہ ان کی دیگر تصانیف کے تعلق سے کچھ نیا نہیں ہے لیکن اردو نظم کے طالب علم کے لئے تشفی بخش معلومات فراہم کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ایس فہیم احمد کا نہایت جاندار مضمون ہے جو اردو نظم پر انگریزی اثرات کی روشنی میں لکھا گیا ہے۔ اس تنقیدی مضمون میں اردو اور انگریزی نظم کا تقابلی جائزہ لینے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ یہ مضمون اس کتاب کے لیے بے حد فائدہ مند اور ضروری تھا۔ اس کے بعد جدید اردو نظم کے تعلق سے مختلف موضوعات پر علیم صبانویدی نے خود ہی معلومات افزا انتقادی نظر ڈالی ہے۔ ان مضامین میں جدید نظم، اردو نظموں میں داخلیت اور خارجیت، طویل نظمیں: ایک جائزہ، سانیٹ: ایک جائزہ، ترائیلے: ایک جائزہ، ہائیکو: ایک جائزہ، نثری نظم: ایک جائزہ، ایک سطری، دوسطری، تین سطری نظمیں، چار سطری اور پانچ سطری

نظمیں، اور آخری موڑ وغیرہ موضوعات مخصوص ہیں۔ اس طرح اس کتاب میں اردو نظم کی مکمل اور ضروری معلومات فراہم ہو جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کتاب کا ہم دوسرا حصہ اس حصہ کو کہہ سکتے ہیں جس میں نظموں کا انتخاب شامل ہے۔ انتخاب میں تقریباً 300 پابند نظموں کا انتخاب ہے اور تقریباً 250 آزاد نظموں کا انتخاب بھی شامل کیا گیا ہے جن میں شروع سے لے کر آخر تک منتخب شعرا کا کلام بحساب ابجد شامل کیا گیا ہے اور اس طرح آزاد نظموں کی ترتیب بھی بحساب ابجد ہی رکھی گئی ہے۔

اس طرح مجموعی طور پر اردو نظم کے سلسلے ایک بہت کارآمد اور کارگر کتاب تیار ہو گئی ہے جو ہمارے محققین اور اردو نظم کے سلسلہ میں تحقیقی وتنقیدی کام کرنے والوں کے لئے نہ صرف از حد مفید بلکہ ناگزیر ثابت ہوگی۔ اردو نظم کے تعلق سے کام کرنے والوں کے لئے اس میں بہت سا کچا مواد بھی فراہم ہو گیا ہے۔ متعلقہ صنف اور موضوع پر کام کرنے والوں کے لئے یہ کتاب بڑی معاون ثابت ہوگی۔

خطوط

آپ کو صحافت وادارت کا زرخیز تجربہ ہے۔ بڑی سلیقہ مندی سے نکال رہے ہیں آپ ''نئی کتاب۔ یہی سلیقہ مندی اس کی مقبولیت اور بقا کی ضامن ہے۔سرفہرست فاروقی کے مضمون کے بارے میں کیا عرض کروں۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک! زیب غوری کی شاعری کا بڑا خوبصورت محاکمہ ہے اور اس سے زیادہ خوبصورت مضمون کا عنوان ہے: ''خانۂ دل سے بام فلک تک'' کسی مخص ناقد کے ذہن میں یہ عنوان آ ہی نہیں سکتا۔

سید امین اشرف، علی گڑھ

دیکھتے دیکھتے ''نئی کتاب'' کے ۸ شمارے مکمل ہو گئے۔نئی کتاب نے دو سال کا سفر بھی پورا کر لیا۔اس تیزی سے شہرت کمائی کہ مضبوطی سے اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔زندگی کے سفر میں ساتھی ملتے ہیں، بچھڑتے ہیں۔ یہ سلسلے تو چلتے ہی رہتے ہیں لیکن زندگی کا یہ سفر کبھی ختم نہیں ہوتا۔محبتیں منزل کا راستہ ہموار کرتی رہتی ہیں۔

پروفیسر ظفر احمد نظامی کے انتقال کی خبر سے شدید صدمہ پہنچا ہے۔اللہ انھیں اپنے جوار رحمت میں رکھے اور اُن کے متعلقین کو صبر جمیل عطا کرے۔اُردو دنیا ایک سچے خادم سے محروم ہوگئی۔

پروفیسر قمر رئیس کا انتقال بھی ادبی دنیا کا ایسا المیہ ہے جس سے اُردو دوستوں کو بے پناہ دُکھ پہنچا ہے۔اللہ انھیں غریق رحمت کرے اور ہم سب کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔آمین۔

عامر قدوائی، کویت

نئی کتاب نمبر ۸ ملا۔ ۶ اور ۷ نہیں آئے۔اس شمارے میں سرورق کے ساتھ ساتھ پشت کی تصویر اور اس کی جاذبیت بھی لائق داد ہے۔میرے خیال میں یہ اولیت نہ کتاب نما کو ملی اور نہ ہی کسی اور رسالہ کو۔ہم اسے نئی کتاب کا شاہکار کہیں گے۔

''داغ کے انگریز رشتہ دار'' خاصے کا مضمون ہے اور بے حد معلوماتی اور تاریخی ہے۔قمر رئیس مرحوم پر ایک خصوصی شمارہ کی ضرورت ہے۔ویسے صابر علی سیوانی نے محنت سے مضمون لکھا ہے مگر قمر رئیس اور علی گڑھ کو نظر انداز کیا۔حق یہ ہے کہ علی گڑھ نے ہی قمر صاحب کو اردو ادب کا قمر بنایا، تفصیل پھر کبھی۔

نظم، افسانہ اور تبصرے جاندار ہیں۔ظفر احمد نظامی کی وفات اردو کا المیہ ہے۔نئی کتاب جس قدر غم کرے کم ہے کہ ان کا بدل ناممکن ہے۔

سید مرتضیٰ حسین بلگرامی، دہلی

کل نئی کتاب کا آٹھواں شمارہ ملا اور ساتھ ہی جناب ظفر بھائی صاحب کے انتقال کی خبر بھی۔اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن. اگر آپ رسالہ نہیں بھیجتے تو شاید جاوَرہ (گلشن آباد) میں یہ خبر نہ جانے کب پہنچتی۔بہرکیف ان

کے ایصالِ ثواب کے لیے خانقاہ شریف میں قرآن خوانی کا اہتمام اور ان کے پرانے احباب کو بھی اطلاع پہنچانے کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔

آپ کے لیے جو نقصان ہے اس کے لیے تو کچھ احباب سامنے آگئے ہیں، لیکن میرے لیے اب آپ کے علاوہ اور کوئی دیگر چارہ نہیں ہے۔ انھیں آپ ہی کے ذریعے تلاش کیا تھا اور اب وہ پھر مجھے آپ کے بھروسے چھوڑ گئے ہیں۔

ظفر بھائی ان کے بڑے بھائی جیلانی صاحب، ان کے والد حکیم جمیل صاحب اور اہل خاندان کا نزدیکی تعلق میرے نانا حضرت حافظ غلام حیدر صاحب نقشبندیؒ سے اور جاؤرہ شہر سے رہا ہے۔ اور کچھ باتوں کا تذکرہ انھوں نے خود مجھ سے ذاتی طور پر گذشتہ سال کیا تھا، جب ہم خواجہ حسن نظامی ثانی کی بھیجتی کی شادی کی ولیمے کی تقریب میں ملے تھے، اور گھر پر بھی۔

انجینیر جمیل احمد خاں نقشبندی، جاؤرہ، رتلام

اپنی روایتی آب و تاب کے ساتھ نئی کتاب (۸) نظر نواز ہوا۔

فاروقی کا مضمون زیب غوری کی شاعری پر نہایت قابل قدر تجزیہ ہے۔ تقریباً سب مضامین لائق صد تحسین و آفریں ہیں لیکن شمیم طارق کا مضمون اس لحاظ سے منفرد ہے کہ ان کے مضمون سے مصنف کی ژرف نگاہی اور معروضیت پسندی مترشح ہے۔ میں شمیم طارق کی تحریریں پڑھتا رہتا ہوں۔ ان کا امتیاز یہ ہے کہ ان کا مطالعہ محض ادبیات تک محدود نہیں بلکہ تاریخ، اسلامی تاریخ، اسلامی فلسفہ و تصوف، مذہبیات اور ہندو دیو مالائی لٹریچر تک کا احاطہ کرتا ہے۔

خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے مضمون قلمبند کرتے وقت اعتدال پسندانہ رویہ اختیار کیا ہے۔ ان کے کسی فقرے یا جملے سے تعصب کی بو نہیں آتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک بالیدہ ذہن اور فراخدلی پر مبنی ادبی رویہ کے حامل ہیں۔

جمیل احمد نوری، علی گڑھ

سلام و نیاز۔ نئی کتاب کے اوراق ادب کے خوش رنگ مناظر کی سیر کراتے رہتے ہیں۔ زیر نظر شمارہ نمبر 8 بھی انہیں خصوصیات سے عبارت ہے۔ میر کی آفاقی بصیرت (پروفیسر اختر الواسع) اقبال اور شاہین (پروفیسر خالد محمود)۔ صوفیہ کی شعری بصیرت میں شری کرشن (پروفیسر مسعود انور علوی) جیسے مضامین معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔ گوشۂ ظفر احمد نظامی بھی حاصل مطالعہ ہے۔ میں نے ان کے انتقال پر اپنے غم کا اظہار چند سطری نظم میں کیا تھا۔ آپ کو اس امید پر ارسال کر رہا ہوں کہ نئی کتاب کے توسط سے میرا یہ تعزیت نامہ ان کے اقارب تک پہنچ جائے گا۔

اس سے پہلے یاس یگانہ چنگیزی پر ایک مضمون بھی برادر محترم ڈاکٹر خالد محمود صاحب کے توسط سے بھیجا تھا۔ اُمید ہے اب تک پہنچ گیا ہوگا۔

خدا صحت و تندرستی کے ساتھ آپ کی عمر میں برکت دے کہ آپ نے اردو کی مشعل اُس دور میں بھی پوری توانائی سے روشن رکھی جب زرد آندھیاں اسے بجھانے کے درپے تھیں اور آج بھی صحت مند ادب کے فروغ کے لیے کوشاں ہیں۔

ضیاء فاروقی۔ بھوپال

نئی کتاب کا تازہ شمارہ (نمبر ۸) موصول ہوا۔اداریہ پڑھتے ہی قدرے تشویش محسوس ہوئی۔خدا کا شکر ہے کہ پرچے کی اشاعت بند کردینے کا آپ کا فیصلہ ٹل گیا۔نئی کتاب اس وقت اردو زبان وادب کا ایک ایسا معتبر حوالہ ہے جس کا جاری رہنا ادب تخلیق کرنے والے اور ادب پڑھنے والے دونوں کے لیے بے حد ضروری ہے۔ہم جیسے تخلیق کاروں کو اس کے مطالعے سے تخلیقی حوصلہ ملتا ہے اور یہ بڑی بات ہے۔

زیر نظر شمارہ اپنی روایت کے مطابق نہایت وقیع شمارہ ہے۔زیب غوری پر فاروقی صاحب کا مضمون تو وقیع ہے ہی، اس شمارے میں برصغیر کی معاصر اردو شاعری اور عصری مسائل پر شمیم طارق کا مضمون ایک بے حد اہم مضمون ہے۔ شمیم طارق فی زمانہ علمی، ادبی تحقیقی اور تنقیدی میدان کا ایک معتبر نام ہے۔آگہی اور بے باکی ان کی تحریروں سے چھلکی پڑتی ہے۔ہندوستان و پاکستان کے موجودہ سیاسی اور معاشرتی صورت حال کے پس منظر میں انھوں نے دونوں ملکوں کی تخلیقی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے ہمارے عہد میں تہذیبی حوالوں سے تخلیقی عمل کے سلسلوں پر بڑی اہم گفتگو کی ہے۔مٹی اور ماحول کے اثرات کی نشاندہی کرتے ہوئے شعری نظریات، فلسفوں اور فارمولا سازیوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے معاصر ادب کے تخلیقی عمل میں جس طرح، مٹی اور ماحول، فطرت اور زندگی سے براہِ راست Commitment والی شاعری کی نشاندہی کی ہے وہ شمیم کی ایک اجتہادی جست ہے جو بے شک معاصر شاعری کے نئے چہرے اور اس کی نئی شناخت سے قارئین ادب کو روشناس کرنے کی ایک مستحسن کوشش ہے جو ادب کے کاروان کی نئی سمت اور عناصر کو سمجھنے کے ضمن میں معاون ہوگا۔میں شمیم طارق کو اس معاصر مضمون کے لیے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

ظفر گورکھپوری۔ممبئی

نئی کتاب کا نیا شمارہ دیکھا۔محترم جناب شمیم طارق صاحب کا مضمون نہایت فکر انگیز ہے۔انھوں نے جس طرح سے برصغیر کی معاصر شاعری اور مسائل کا تجزیہ پیش کیا ہے وہ بہت باریکی اور انہماک سے تحریر کیا گیا ہے۔

یوں تو طرح طرح کے مسائل پوری دنیا میں پیدا ہو گئے ہیں اور ان مسائل کا تعلق بھی دنیا کے ہر گوشے اور ہر شعبہ ہائے زندگی سے ہے۔ظاہر ہے ادب اور معاشرہ دونوں ہی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔معاشرہ میں ایک فرد بھی اگر حساس دل و دماغ رکھتا ہے تو وہ ان مسائل کو اپنے انداز میں ضرور بیان کرے گا اور لوگوں کے سامنے پیش کرے گا۔

جناب شمیم طارق، صاحب دل بھی ہیں اور صاحب نظر بھی اور ایک زبردست عالم و فاضل بھی۔انھوں نے معاصر شعراء کے یہاں جو خیالات و احساسات پائے جاتے ہیں اور ان میں جو مسائل بیان کیے جاتے ہیں ان پر بھرپور روشنی ڈالی ہے جس سے ہماری شعری تاریخ اور موجودہ صورت حال بھی منعکس ہو رہی ہے۔جناب شہریار، جناب عرفان صدیقی اور جناب محترم سید امین اشرف صاحب کی شاعری اور ان کی عظمت کی نشان دہی بھی خوب کی ہے۔

رضوان الرضا رضوان، علی گڑھ

ادبی تہذیبی خبریں

شمس الرحمٰن فاروقی کو اعزاز سے نوازا جائے گا

امیر یکی کمیٹی کا 'اثر لکھنوی اردو انٹر نیشنل ایوارڈ' دینے کا فیصلہ

نئی دہلی (یو این آئی) اردو کے معروف نقاد، شاعر، ناول نگار اور پدم شری اعزاز یافتہ ادیب جناب شمس الرحمٰن فاروقی کو ان کی تاحیات ادبی خدمات کے مدنظر امریکہ کی اردو مرکز انٹر نیشنل ایوارڈ کمیٹی نے سال 2009 کا 'اثر لکھنوی اردو انٹر نیشنل ایوارڈ' دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ ایوارڈ ایک شال، مومنٹو اور پانچ ہزار امریکی ڈالر پر مشتمل ہے۔

یہ ایوارڈ 8 نومبر 2009ء کو لاس اینجلس (امریکہ) میں منعقد ہونے والی تقریب میں پیش کیا جائے گا۔ یہ اعلان اردو مرکز انٹر نیشنل ایوارڈ کمیٹی کیلی فورنیا (امریکہ) کی سکریٹری جنرل نیر جہاں کی جانب سے کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ فاروقی صاحب 18 ستمبر 2009ء کو یونیورسٹی آف ورجینیا (امریکہ) میں 'شمالی ہند کی عوامی بولیوں کی ادبی تاریخ' کے موضوع پر منعقد ہونے والے سیمینار میں ایکسپرٹ کی حیثیت سے شرکت فرمائیں گے اور 10 اکتوبر 2009 کو کولمبیا یونیورسٹی نیویارک میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے اردو کے پی ایچ ڈی اسکالرس سے خطاب کریں گے۔ (آگ۔ لکھنؤ)

بھوپال میں خالد محمود کے نام ایک شام

رفیقانِ ادب کا الفاظ، جذبات اور پھولوں کا نذرانہ

زبان وادب کی خدمت اور خلوص و شرافت کی وجہ سے انسان کی قدر اور قبولیت دنیا میں کتنی ہوتی ہے۔ اس کی تابندہ مثال ۲۶ ستمبر کی شام کو منشی حسین خاں ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ کی تقریب گاہ میں اس وقت سامنے آئی جب اردو کے منفرد شاعر، ممتاز ادیب اور ماہر نقاد پروفیسر خالد محمود سے منسوب کر کے ایک شام منائی گئی اور اس میں ڈاکٹر سیفی سرونجی کی مرتب ضخیم کتاب ''خالد محمود۔شخصیت وفن'' کا اجرا عمل میں آیا، تقریب کی صدارت ممتاز ادبی شخصیت پروفیسر آفاق احمد نے انجام دی اور مہمانان ذی وقار کی حیثیت سے پروفیسر اختر الواسع اور پروفیسر عتیق اللہ نے شرکت کی، اس موقع پر تقریب گاہ شہر کے ادیب، شاعر، صحافی اور ممتاز شہریوں سے بھری ہوئی تھی، جس میں ہر مکتب فکر وخیال کے نمائندہ اصحاب موجود تھے، اس کا اہتمام وانتظام بھوپال کے رفیقان قلم نے کیا تھا۔ نظامت کے فرائض اردو اکادمی کے جوائنٹ سکریٹری اقبال مسعود انجام دے رہے تھے۔ سب سے پہلے پروفیسر محمد نعمان خاں نے مہمانان خصوصی پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر تسنیم فاطمہ اور سیفی سرونجی کا تعارف کرایا، شال ومومینٹو سے استقبال کی رسم مجلسِ اقبال کے صدر نسیم انصاری نے ادا کی، پہلے شعری نذرانہ خلوص پیش کرنے کے لیے ظفر صہبائی اور نسیم انصاری کو دعوت دی گئی تو دونوں نے اپنے دیرینہ رفیق سے رشتوں اور محبتوں کا اظہار نظموں کی شکل میں کیا اور ضیا فاروقی نے منظوم سپاس نامہ پیش کر کے ایک نئی روایت کی بنا ڈالی، ادیب وشاعر انور

علی انور نے خالد محمود کے تخلیقی و فنی سفر کو قابل رشک قرار دیتے ہوئے، اس کے مختلف پڑاو پر روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر پروفیسر آفاق صدیقی نے خالد محمود کی شخصیت اور فن پر ترتیب دی جانے والی کتاب کا بھرپور تعارف پیش کیا۔ نسیم انصاری نے ہی خالد محمود پر ذاتی تجربات و مشاہدات پر خاکہ سنا کر اپنے متنوع تجربات میں سامعین کو شریک کیا، دوسرا خاکہ معروف ناول نگار ڈاکٹر غضنفر کا تھا، جو ان کی غیر حاضری میں پروفیسر مختار شمیم نے پڑھا اور ناول کے ڈرامائی باب کی طرح سامعین نے اسے سانس روک کر سنا، تیسرا طویل خاکہ پروفیسر محمد نعمان خاں کا تھا جسے انشائیہ کے رنگ میں لکھا گیا اور لطف لے کر پڑھا گیا، صحافی عارف عزیز نے خالد محمود کی شاعری کے مختلف رنگوں کو واضح کیا، بالخصوص ان کے اشعار میں طنز کا جو ترکیبی حسن اور تجربہ کا ارتکاز ملتا ہے اور دہلی کے قیام نے ان کے ذہنی افق کو جو وسعت عطا کی اس کی مثالیں پیش کیں جب کہ ڈاکٹر ارجمند بانو افشاں نے خالد محمود کے تخلیقی و تحقیقی سفر کے علاوہ سہ ماہی ''انتساب'' کے خصوصی نمبر اور ''خالد محمود شخصیت و فن'' کے وسیلہ سے سیفی سرونجی نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ان کا احاطہ کیا۔ خالد محمود کے میزبان اور قریبی دوست شاہد میر نے ان کی غزل کو ترنم سے آراستہ کر کے پیش کیا اور چند تہنیتی قطعات بھی پیش کیے۔ ایک اور دیرینہ ساتھی پروفیسر مختار شمیم نے اپنی تقریر میں پوری فراخ دلی کے ساتھ ان کے علمی و ادبی سفر پر روشنی ڈالتے ہوئے دلی میں ان کی فتوحات پر خوشی ظاہر کی۔

خالد محمود کی بیگم پروفیسر تسنیم فاطمہ (جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے بحیثیت انسان اور خاوند خالد محمود کے تعلق سے اپنے تجربات بیان کر کے ان کی شخصی خوبیوں اور کمزوریوں کا احاطہ کیا، ''خالد محمود شخصیت و فن'' کے مرتب سیفی سرونجی نے بتایا کہ انتساب کا خصوصی نمبر خالد محمود پر مرتب کرنے کے بعد میرا خواب تھا کہ اس کے باقی مضامین کو شامل کر کے کتابی شکل میں شائع کروں، مجھے اطمینان ہے کہ یہ خواب آج شرمندۂ تعبیر ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر عتیق اللہ نے خالد محمود کی شخصیت و فن کے مختلف پہلوؤں کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کی شاعری پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور بتایا کہ اپنے عہد کے عام محاورے اور رواج سے ان کی شاعری بلند ہے اور اس میں طنز کی لہریں اشعار کو دوآتشہ بنا دیتی ہیں، خالد محمود کے تحقیقی و تنقیدی سفر کو بھی انہوں نے سراہا، خاص طور پر سفرناموں پر ان کے کام کی تعریف کی اور انہیں اپنے قلمی سفر نیز صحت کے بارے میں احتساب کرتے رہنے کا مشورہ دیا۔

پروفیسر اختر الواسع نے معاصرت کو ایک حجاب سے تعبیر کرتے ہوئے کہا کہ اچھی تصویر کا جائزہ لینے کے لیے فاصلہ کا ہونا ضروری ہے کیونکہ نزدیک سے اس کے نقوش دھندلا جاتے ہیں، یہی حال شخصیتوں کا بھی ہے کہ جو جتنا قریب ہوتا ہے اس کی بات کو اتنا وزن نہیں دیا جاتا ہے لیکن میں نے خالد محمود کو اردو کے عاشق صادق کے طور پر دیکھا اور پرکھا ہے، میرے اس تجربہ سے اختلاف کرنے والا شاید ہی کوئی ہو، انہوں نے مردہ پرستی کے اس عہد میں خالد محمود کی زندگی میں ان کی پذیرائی پر بھوپال کے رفیقانِ ادب اور سیفی سرونجی کا شکریہ ادا کیا۔

اپنے استقبال، رفیقوں اور دوستوں کی محبت کا جواب دینے کے لیے خالد محمود مائک پر آئے تو کسی ثمر بار ٹہنی کی طرح جھکتے ہوئے انہوں نے کہا کہ آدمی عموماً اپنی برائی سن کر ناراض ہو جاتا ہے، اسی طرح ضرورت سے زیادہ اپنی تعریف و توصیف سے چوکڑی بھول جاتا ہے، بعض لوگ خواہش کو حقیقت بنا کر پیش کرتے ہیں، شاید میرے

احباب نے بھی میری تعریف میں یہی رویہ اپنایا ہے، اس کی ایک وجہ اور ہو سکتی ہے کہ ہر شخص کو اپنی تخلیق سے پیار ہوتا ہے اور اسے وہ پسند کرتا ہے کیونکہ میں اپنے دوستوں کی تخلیق ہوں، اس لیے مجھے وہ پسند کرتے ہیں اور میری تعریف میں رطب اللسان ہیں، آج مجھے جس طرح محبت سے نوازا گیا اور خلوص کے ہار پہنائے گئے، وہ ضرورت سے زیادہ بلکہ میرے استحقاق سے سوا تھا، مجھے اپنی کم مائیگی کا پورا احساس ہے اور جو کچھ ملا ہے اسے خدا کا فضل و کرم، اپنے اساتذہ کی شفقت مانتا ہوں، میرا یہ یقین ہے کہ مجھے آج جو عزت مل رہی ہے، وہ میرے احباب کی وجہ سے ہے، ان عنایات کا میں ممنون ہوں اور آگے بھی رہوں گا۔

آخر میں صدر مجلس پروفیسر آفاق احمد نے فرمایا کہ خالد محمود ہمارے ہیں اور ہمارے رہیں گے، وہ بھوپال سے چلے گئے تو کیا ہوا، ہمارے سفیر بن کر وہ دارالحکومت دلی میں کام کر رہے ہیں، وہ جب کسی کامیابی و کامرانی سے ہم کنار ہوتے ہیں تو ہم اسے اپنی کامیابی تصور کرتے ہیں، حالانکہ ہم میں سے کسی نے بھوپال کی سفارت پر انہیں تعینات نہیں کیا، نہ اس کا کوئی حق محنت ادا کیا پھر بھی وہ یہ کام انجام دے رہے ہیں، ہمیں یقین ہے کہ مستقبل میں بھی وہ بھوپال کے تئیں اپنی خدمات انجام دے کر ہماری توقع پر کھرے اترتے رہیں گے۔

نعیم کوثر، رشید انجم اور محمد نعمان خاں اعزاز یاب

مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے سال 09-2008 کے لیے معروف افسانہ نگار ادیب اور صحافی جناب نعیم کوثر کی طویل ادبی خدمات کے اعتراف میں 'حامد سعید خاں' کل ہند اعزاز سے جناب رشید انجم کو 'سُہا مجددی' صوبائی اعزاز اور ڈاکٹر محمد نعمان خاں کو 'نواب صدیق حسن خاں صوبائی اعزاز' سے سرفراز کیا ہے۔

یہ اعزازات ۲۸ رجون ۲۰۰۹ء کو ملا رموزی سنسکرتی بھون، بھوپال میں منعقدہ ایک تقریب میں وزیر اردو اکادمی اور محکمۂ اقلیتی بہبود ڈاکٹر رام کشن کسمریا کے ہاتھوں سند، شال، شیلڈ اور پندرہ ہزار روپے کے چیک کی شکل میں دیے گئے۔ ادارہ مذکورہ بالا تینوں ادیبوں کو مبارکباد پیش کرتا ہے۔

اردو اکادمی کی نئی گورننگ کونسل کا اعلان

سید شریف الحسن نقوی قائم مقام وائس چیئرمین مقرر، دانشور، نقاد، شعراء، ادبا و اساتذہ ممبران میں شامل

دہلی سرکار نے اردو اکادمی کے لیے نئی گورننگ کونسل کا اعلان کر دیا ہے۔ یہ پہلی ایسی گورننگ کونسل ہے جس میں لٹریری شخصیات کو ترجیح دی گئی ہے اور سیاسی وفاداریاں نبھانے والے کارکنان کو اکادمی سے دور ہی رکھا گیا ہے۔ کونسل میں درس و تدریس سے وابستہ اہم شخصیات، دانشوروں، نقادوں، شعراء اور ادباء کو رکن نامزد کیا گیا ہے۔

اس 28 رکنی گورننگ کونسل میں اردو اکادمی کے سابق سکریٹری سید شریف الحسن نقوی کو قائم مقام وائس چیئرمین مقرر کیا گیا ہے۔ گورننگ کونسل میں شامل ممبران میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے سربراہ پروفیسر اختر الواسع، دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے سابق صدر پروفیسر عبدالحق، ڈاکٹر اسلم پرویز، اردو اکادمی کے سابق سکریٹری اور

معروف شاعر مخمور سعیدی، ڈاکٹر دھر میندر ناتھ، ڈاکٹر جی آر کنول، پروفیسر شمس الحق عثمانی، پروفیسر عتیق اللہ، بلراج کومل، نرمل سنگھ نرمل، اسلم پرویز، ڈاکٹر نگار عظیم، ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین احمد، ڈاکٹر شاہد پرویز، ڈاکٹر عقیل احمد، ڈاکٹر قدسیہ قریشی، ڈاکٹر ارتضا کریم، ڈاکٹر علی، جاوید، ڈاکٹر نجیب اختر، مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی اور معصوم مراد آبادی شامل ہیں۔

خصوصی مدعوئین اراکین میں اطہر فاروقی، ڈاکٹر عظیم حیدر اور جوگندر پال کے نام شامل ہیں۔ ان کے علاوہ پرنسپل سکریٹری فائنانس، سکریٹری آرٹ اینڈ کلچر اور سکریٹری اردو اکادمی بھی کونسل کے رکن ہوں گے۔

محترمہ بانو ارشد کی رہائش گاہ پر ایک خوبصورت ادبی شام کا انعقاد

۲۸ر جون بروز اتوار محترمہ بانو ارشد کی رہائش گاہ پر ایک ادبی شام کا انعقاد ہوا اور شاعرہ و افسانہ نگار محترمہ محسنہ جیلانی اور محترم اکبر حیدر آبادی کے فن کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے ایک منفرد اور رنگا رنگ ادبی محفل سجائی گئی جس میں برطانیہ کے ممتاز ادیب و شعراء کرام کے علاوہ فن و ادب سے دلچسپی رکھنے والے احباب بھی مدعو کئے گئے تھے۔ مدیر پرواز صابر ارشاد عثمانی صدرِ محفل بنائے گئے۔ صفیہ صدیقی، شاعر اور گلوکار صادق رشید شاعر اور کالم نگار ثروت اقبال، شاعرہ پاکیزہ بیگ، شاعری نور جہاں نوری، شاعر ناظر فاروقی شاعرہ عظمیٰ شاعرہ نرگس جمال سحر، شاعرہ زہرہ نسیم، فیضان عارف عابدہ سیال اور عامر خاں شریک بزم تھے۔

بانو ارشد نے تقریب کی نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے تمام شرکین بزم کا عمومی طور پر اور پڑھنے والوں کا خصوصی طور پر تعارف کروایا ساتھ ہی بانو ارشد نے محترمہ محسنہ جیلانی کے فن اور شخصیت پر افسانہ نگار محترمہ عطیہ خان کا لکھا ہوا مضمون پیش کیا جو کسی ذاتی مجبوری کی بنا پر شرکت سے قاصر رہی تھیں۔ عطیہ خان نے اپنے مضمون میں محسنہ جیلانی کو ایک حساس فنکار قرار دیتے ہوئے افسانوں میں اُن کی سلاست اور مختصر بیان کو سراہا۔

محترم ناظر فاروقی نے جناب اکبر حیدر آبادی کی فنی خدمات کا اعتراف منظوم خراجِ عقیدت کی شکل میں کچھ اس طرح کیا۔

وہ شہرِ علم جسے آکسفورڈ کہتے ہیں
ہمارے شاعر اکبر وہ میں پہ رہتے ہیں
قلم سے آپ کے اردو بنی ہے شہزادی
سنگھار جس کا ہے تہذیب اکبر حیدر آبادی

محترم آصف جیلانی نے جناب اکبر آبادی کی فنی صلاحیتوں کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے ایک سیر حاصل مضمون پڑھا اور اُن کی فنی اور تخلیقی کاوشوں کو اپنی علمی و ادبی بصیرت سے یوں دامنِ تحریر میں سمیٹا گویا دریا کو کوزہ میں بند کیا گیا ہو۔ مضمون کی خوبی اُس کی ادبی چاشنی اور مضمون نگار کی منفرد تنقیدی طرزِ ادا تھی جو عام ادبی و تحقیقی مضامین کی طرح خشک اور بوجھل قطعی نہ تھا بلکہ ادبی لطافت اور تنقیدی متانت کا ایک خوبصورت امتزاج تھا جس میں شاعر کی پوری فنی شخصیت کا کمال خوبی سے احاطہ کیا گیا۔ جناب ہارون رشید اور محترمہ پاکیزہ بیگ نے

اکبر حیدرآبادی کی غزلوں کو اپنی خوبصورت اور مترنم آوازوں میں خراج تحسین پیش کیا۔ محترمہ نور جہاں نوری نے افسانہ نگار محسنہ جیلانی کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا جس کی خوبی اُن کا منفرد انداز اور شوخیٔ ادا تھی جس نے محفل کو گل و گلزار بنا دیا۔ نوری کہتی ہیں۔

سچے لہجے کی شاعری اُن کی
ان کے اشعار میں ہے تابانی
نثر کے ساتھ شاعری بھی حسیں
جیسے جھیلوں میں پھول اور پانی

تقریب کے بعد ایک پر تکلف عشائیہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ بعد از طعام ایک ہلکی پھلکی مشاعرہ کی نشست سجائی گئی۔ جس میں بانو ارشد، ناظر فاروقی، محسنہ جیلانی زہرہ نسیم، نرگس جمال سحر، نور جہاں نوری اور عظمیٰ صدیقی نے اپنی غزلیں پیش کیں۔ مشاعرہ کی اس بے تکلف نشست نے اس شام کو اور بھی رنگین اور یادگار بنا دیا۔

محترمہ بانو ارشد کی یہ کاوش خاص طور پر قابل تحسین ہے اور بقول شرکین تقریب اس طرح کی محفل کا انعقاد کر کے انھوں نے ایک نئی روایت کی بنیاد ڈالی ہے جو نہ صرف قلم کاروں کی توقیر اور اعتراف عقیدت و محبت ایک ذریعہ ہے بلکہ اہلِ ذوق کے لیے آسودگی اور شگفتگی کا سامان ہے۔

بانو ادبی حلقوں میں ایک ممتاز و معروف ادبی مقام تو رکھتی ہی ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ ایک زندگی سے بھرپور شخصیت بھی ہیں۔ بانو کی شخصیت اُس جھرنے کی طرح ہے جو پہاڑوں کی بلندیوں سے وادیوں کی جانب رواں دواں ہو یا پربتوں پر ایستادہ ایک مضبوط درخت جو جھکے ہوئے مسافروں کو دعوتِ سایہ دے اور کہے آؤ، تھوڑی دیر کو میرے مضبوط تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھو۔ میری ٹھنڈی چھاؤں میں تازہ دم ہو لو۔ پھر چاہو تو آگے بڑھ جانا۔ مجھ جیسے نووارد شہر کے لیے بھی اس درخت کی ٹھنڈی چھاؤں نے اپنی باہیں پھیلائیں اور میری تھکن کو اپنے سایۂ محبت میں سمیٹ لیا۔ اُس شام کی شگفتہ یاد مدتوں ذہنوں سے محو نہیں ہوں گی۔

اعجاز علی ارشد کو ساہتیہ سادھنا سمان

پروفیسر اعجاز علی ارشد اور ہندی کی اہم شاعرہ ڈاکٹر شانتی جین کو شاد میموریل کمیٹی کی جانب سے ساہتیہ سادھنا سمان برائے 2009 سے نوازا گیا۔ اس موقع پر انعامات تقسیم کرتے ہوئے ممبر پارلیمنٹ اور مشہور فلمی اداکار شتروگھن سنہا نے ادب اور آرٹ کی اہمیت پر کھل کر گفتگو کی۔ انہوں نے پروفیسر اعجاز علی ارشد کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ فنکار ہمیشہ دلوں کو جوڑنے کا کام کرتے رہے ہیں اور آج کے عہد میں سب سے زیادہ ضرورت دلوں کو جوڑنے کی ہے۔

جلسے کے صدر پروفیسر امتیاز احمد (ڈائرکٹر، خدابخش لائبریری) نے ایوارڈ پانے والوں کی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ نہ صرف ہندوستان گیر پیمانے پر بلکہ پوری اردو دنیا میں اعجاز علی ارشد کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا گیا ہے۔ انہوں نے ایک اچھے استاد اور ممتاز ادیب کی حیثیت سے بھی اپنی شناخت بنائی ہے۔ جلسے کا اختتام ایک محفل

مشاعرہ پر ہوا جس میں اردو اور ہندی کے شاعروں نے بھی اپنا کلام سنایا۔

صالحہ عابد حسین پر ایک روزہ سمینار کا انعقاد

ہریانہ اردو اکادمی کے زیرِ اہتمام معروف ادیبہ صالحہ عابد حسین کے یومِ ولادت پر ایک روزہ قومی سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ افتتاحیہ اجلاس کے دوران اکادمی کے سکریٹری کشمیری لال ذاکر نے مہمانِ خصوصی سیدہ سیدین حمید ممبر، پلاننگ کمیشن (حکومت ہند) کو گلدستہ پیش کیا۔ ریتو چودھری، پروفیسر صغریٰ مہدی، ڈاکٹر خوشحال زیدی وغیرہ نے شجر کاری کے فرائض انجام دئے۔ اس دوران کشمیری لال ذکر کے ناول، 'یہ کھنڈر بھی میرے' کا اجراء سیدہ سیدین نے کیا۔

استقبالیہ تقریر میں کشمیری لال ذاکر نے خواجہ غلام السیدین سے متعلق ماضی کی ان یادوں پر سے پردہ اٹھایا جن کا تعلق صالحہ عابد حسین کی زندگی سے وابستہ ہے۔ کلیدی خطبہ 'صالحہ عابد حسین کی ادبی حیثیت' کے عنوان سے پروفیسر صغریٰ مہدی نے پیش کیا جس میں صالحہ عابد حسین کو ہریانہ کی بیٹی کہا۔ افتتاحیہ تقریر ڈاکٹر سیدہ سیدین حمید نے صالحہ عابد حسین کے فکری، فنی، سماجی اور معاشرتی رجحانات، خیالات اور خدمات پر روشنی ڈالی۔

صدارتی تقریر ریتو چودھری، سٹی مجسٹریٹ، پنچ کولہ نے کی۔ شمس تبریزی نے سب مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

پہلے اجلاس میں ڈاکٹر شمع افروز زیدی نے مقالہ بعنوان 'صالحہ عابد حسین کی یادیں اور ملاقاتیں' پڑھا۔ دوسرا مقالہ ڈاکٹر خوشحال زیدی نے بعنوان 'بچوں کی صالحہ عابد حسین' پڑھا۔

تیسرا مقالہ ڈاکٹر شہپر رسول نے 'صالحہ عابد حسین کی خودنوشت سوانح نگاری (سلسلۂ روز و شب، کی روشنی میں)'' کے عنوان سے پیش کیا۔ چوتھا مقابلہ مہندر پرتاپ چاند نے 'بیگم صالحہ عابد حسین کی شخصیت کے کچھ امتیازی پہلو'' کے عنوان سے پڑھا۔ پانچواں مقالہ محمد مستر نے ''صالحہ عابد حسین کی افسانہ نویسی۔ ایک تنقیدی جائزہ' کے عنوان سے پیش کیا۔ پہلے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر خوشحال زیدی نے کی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر نشان زیدی نے انجام دئے۔

دوسرے اجلاس میں پڑھا جانے والا پہلا مقالہ ڈاکٹر نشان زیدی کا 'بعنوان' صالحہ عابد حسین کے ناولوں میں نسائی حسیت' تھا۔ دوسرا مقالہ ڈاکٹر محمد ایوب خاں نے 'صالحہ عابد حسین اور ان کی افسانہ نگاری' کے عنوان سے پیش کیا۔ تیسرا اور آخری مقالہ امر ساہنی نے '' صالحہ عابد حسین کی تحریروں میں ہندوستانی عورت'' کے عنوان سے پیش کیا۔ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر صغریٰ مہدی نے کی اور نظامت شمع افروز زیدی نے انجام دیے۔

سیدہ نصیب خاتون کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض

بھوپال۔ برکت اللہ یونیورسٹی نے سیدہ نصیب خاتون کو ان کے تحقیقی مقالے ''ظہیر دہلوی بحیثیت مرثیہ نگار'' پر پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے۔ انہوں نے اپنا یہ مقالہ ڈاکٹر مختار شمیم کی نگرانی میں تحریر کیا ہے۔

☆☆☆

ایک شام پروفیسر خالد محمود کے نام

(دائیں سے بائیں) سیفی سرونجی، پروفیسر تسنیم فاطمہ، خالد محمود، پروفیسر آفاق احمد، پروفیسر اختر الواسع اور پروفیسر عتیق اللہ